(الفضل میں شائع ہونے والے سلسلہ مضامین کا مجموعہ)

از

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم

تمہید

تاریخ کے بڑے بڑے پہلوؤں میں سے ایک بہت بڑا پہلو تاریخ بنانے والوں کا حال بھی ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے۔ اگر تاریخی واقعات ہمیں یہ علم دیتے ہیں کہ فلاں فلاں باتوں کا انجام نیک یا بد نکلتا ہے۔ تو تاریخ کے بنانے والوں کی سیرت ہمیں اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ کس قسم کی سیرت کے لوگوں سے کیسے کیسے واقعات سرزد ہوتے ہیں اس لئے تاریخ اسلام کے باب میں سب سے پہلے میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ تاریخ اسلام کے بانی کی سیرت بیان کروں کہ جس پر سب مسلمان جان و دل سے فدا ہیں اور جس کی نسبت خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب: ۲۲) پس تاریخ اسلام کو پڑھ کر جو نتائج انسان نکال سکتا ہے اور جو جو فوائد اس سے حاصل کر سکتا ہے اس سے کہیں بڑھ کر اس پاک انسان کی سیرت پر غور کر کے نفع اٹھا سکتا ہے۔

سیرت نبوی ﷺ کے لکھنے کے مختلف طریق ہیں۔ اول تو یہ کہ عام تاریخوں سے لکھی جاوے دوسرے یہ کہ احادیث سے جمع کی جاوے تیسرے یہ کہ قرآن شریف سے اقتباس کی جاوے۔ پہلا مأخذ تو بہت ادنیٰ ہے کیونکہ اس میں دوست دشمن کی رائے کی تمیز کرنا ایک مشکل بلکہ محال کام ہے۔ دوسرا مأخذ یعنی حدیث سے واقعات کا جمع کرنا زیادہ قابل اعتبار ہے کیونکہ مؤرّخین کی طرح محدّثین ہر ایک سنی سنائی بات کو نہیں لکھ دیتے بلکہ روایت کو آنحضرت ﷺ تک برابر چلاتے ہیں اور پھر روایت کرنے والوں کے چال چلن کو خوب پرکھ کر ان کی روایت نقل کرتے ہیں۔ تیسرا طریق قرآن شریف سے آنحضرت ﷺ کی سیرت لکھنے کا ہے اور یہ سب سے اعلیٰ ‘ اکمل اور تمام نقصوں سے پاک ہے لیکن یہ کام بہت ذمہ داری کا ہے اس لئے سردست میں نے پہلے

اور تیسرے مأخذ کی بجائے دوسرے مأخذ کو اختیار کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو کسی وقت قرآن شریف سے بھی آنحضرت ﷺ کی سیرت لکھنے کا ارادہ ہے لیکن چونکہ اختصار اور صرف اعلیٰ درجہ کی روایات کا درج کرنا ہی مقصود ہے اس لئے احادیث میں سے بھی میں نے صرف بخاری کو چنا ہے اور یہ مختصر سیرت صرف بخاری جیسی معتبر کتاب سے لی ہے اور اس کے سوا کسی اور حدیث سے مدد نہیں لی۔

باوجود اس کے کہ صرف بخاری کی احادیث سے جو اصح الکتب ہے میں نے یہ سیرت اختیار کی ہے پھر بھی اختصار پر اختصار سے کام لیا ہے اور اس کو صرف رسول کریم ﷺ کی سیرت کا ایک باب سمجھنا چاہیئے ورنہ اس بحرِ بے کنار کو عبور کرنا تو کچھ آسان کام نہیں۔ چونکہ پیاروں کی ہر ایک بات پیاری ہوتی ہے اور ان کی شکل و شباہت، چال ڈھال اور لباس و خورد و نوش کا طریق بھی دلکش اور محبت افزا ہوتا ہے اس لئے ابتداء میں مَیں انہی باتوں کو بیان کروں گا۔ سیرت کے ساتھ اگر صورت اور عادات بھی مل جاویں تو وہ آدمی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

پہلا باب

آپ ﷺ کا حلیہ - لباس - عمر - اور بعض دیگر طریقِ عمل

رسول کریم ﷺ (فداہ نفسی) مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کی پیدائش سے پہلے آپؐ کے والد عبداللہ فوت ہو چکے تھے۔ آپؐ کو آپ کی والدہ آمنہ اور دادا عبدالمطلب نے پرورش کیا۔ لیکن یہ دونوں بھی آپؐ کی صغر سنی ہی میں فوت ہو گئے جس کے بعد آپ کے چچا ابو طالب آپ کے نگران رہے۔ آپؐ نے تریسٹھ سال کی عمر پائی اور ساری عمر اللہ تعالیٰ کی رضا کے حاصل کرنے میں اور اس کے نام کو دنیا میں بلند کرنے میں خرچ کی۔ دنیا میں نہ کوئی ویسا پیدا ہوا اور نہ ہو گا۔ تمام انسانی کمالات آپؐ پر ختم ہو گئے۔ تقویٰ کی سب راہیں آپ نے طے کیں اور محبت الٰہی کے تمام دروازوں میں سے گزرے۔ حتّٰی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم الانبیاء کا خطاب دیا اور ہمیشہ کے لئے اپنے دربار کی رسائی کے لئے آپ کی اتباع کو شرط قرار دیا۔

آپؐ کا حلیہ آپؐ میانہ قامت تھے نہ بہت لمبے اور نہ پستہ قد۔ آپؐ کا رنگ بہت خوبصورت تھا نہ تو بالکل سفید جیسے سرد ممالک کے لوگوں کا ہوتا ہے اور نہ گندم گوں۔ آپؐ کے بال نہ تو گھونگرالے تھے اور نہ بالکل سیدھے بلکہ کسی قدر خم دار تھے۔ آپ کے بالوں کا رنگ کسی قدر سرخی مائل تھا اور بڑھاپے میں کچھ بال کنپٹیوں کے پاس سے سفید ہو گئے تھے باقی بال کالے ہی رہے۔ سر کے بال آپ لمبے رکھتے تھے جو کانوں کی لو تک آتے تھے۔ آپ ہمیشہ

بالوں میں کنگھی کرتے اور آخر عمر میں مانگ بھی نکالتے تھے۔ سر میں تیل یا خوشبو لگانا بھی آپ کی عادت میں داخل تھا۔ آپ کا جسم بہت نازک اور ملائم تھا۔ آپ کے جسم میں سے خوشبو آتی تھی۔ آپ کا سینہ چوڑا تھا اور دونوں کندھوں کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔ آپ کے ہاتھ پاؤں بہت موٹے تھے اور ہتھیلیاں بہت چوڑی تھیں۔ آپ سوتی کپڑے کو اور خصوصاً دھاری دار کو زیادہ پسند فرماتے تھے اور اسی قسم کے کپڑے میں آپ دفن بھی کئے گئے تھے لیکن درحقیقت جس قسم کا کپڑا ہوتا آپ اسے استعمال کر لیتے۔ اپنے آقا کی ہر ایک نعمت کا شکر کرتے۔

بات کرنے کا طریق

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اکثر اوقات بات تین دفعہ دہراتے تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ جاویں اور سلام بھی تین دفعہ کرتے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ بات ایسی آہستگی کے ساتھ کرتے کہ اگر کوئی چاہے تو آپؐ کے لفظ گن لے اور جس طرح دوسرے لوگ جلدی جلدی بات کرتے ہیں آپؐ ایسا نہ کرتے تھے۔

کھانے پینے کے متعلق

آپؐ تمام طیّب اشیاء کھاتے تھے لیکن اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ وہ صدقہ نہ ہوں۔ حتّٰی کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں بعض دفعہ گھر جاتا ہوں اور وہاں بستر پر کوئی کھجور پڑی دیکھتا ہوں تو پہلے تو کھانے کے لئے اٹھا لیتا ہوں لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں صدقہ نہ ہو پھینک دیتا ہوں۔ اس بات سے اس وقت کے مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور دیکھنا چاہیے کہ ان کا رسول ﷺ صدقہ سے کس قدر پرہیز کرتا تھا۔ اب تو بعض لوگ اچھا بھلا مال رکھتے ہوئے بھی صدقہ کے لینے میں مضائقہ نہیں کرتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ کوئی جب کوئی چیز آپ کو دیتا آپؐ پوچھتے۔ اگر ہدیہ ہوتی تو خود بھی استعمال فرماتے ورنہ آس پاس کے غرباء میں تقسیم کر دیتے۔ آپ کی خوراک ایسی سادہ تھی کہ اکثر کھجور اور پانی پر گزارہ کرتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ کے انصار ہمسائے دودھ تحفہ بھیجتے تو اکثر ہم لوگوں کو پلا دیتے۔ لیکن باوجود اس قدر سادگی کے طیبات سے پرہیز نہ تھا اور جھوٹے صوفیوں کی طرح آپؐ طیبات کو ترک نہ کر بیٹھے تھے بلکہ آپؐ عمدہ سے عمدہ غذائیں جیسے مرغ وغیرہ بھی کھا لیتے تھے۔ پانی پیتے وقت آپ کی یہ عادت تھی کہ تین دفعہ بیچ میں سانس لیتے اور یکدم پانی نہ چڑھا جاتے۔ نہ صرف اس میں آپؐ کا وقار پایا جاتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ صحت کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ گوشت کو آپؐ پسند فرماتے

تھے لیکن اس کا زیادہ استعمال نہ تھا کیونکہ سادہ زندگی کی وجہ سے آپ کھجور اور پانی پر ہی کفایت کر لیتے۔ ایک صحابیؓ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ کے سامنے کدو پکا کر رکھا گیا تو آپؐ نے اسے بہت پسند فرمایا۔ ان تمام کھانوں کے ساتھ آپؐ اصل مالک کو نہ بھولتے بلکہ خدا کا نام لے کر کھانا شروع کرتے اور دائیں ہاتھ سے کھاتے اور اپنے آگے سے کھاتے اور جب کھا چکتے تو فرماتے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْہِ غَیْرَ مَکْفِیٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا (بخاری کتاب الاطعمہ باب مایقول اذا فرغ من طعامہ) سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ بہت بہت تعریفیں پاک تعریفیں۔ برکت والی تعریفیں۔ ایسی تعریفیں کہ جو ایک دفعہ پر بس کرنے والی نہ ہوں۔ جو چھوڑی نہ جاویں۔ جن کی ہمیشہ عادت رہے اے ہمارے رب یعنی مولا تیرا شکر تو میں بہت بہت کرتا ہوں پر تو بھی مجھ پر رحم کر اور آج کے انعام پر ہی بس نہ ہو جائے بلکہ تو ہمیشہ مجھ پر انعام کرتا رہ اور میں ہمیشہ تیرا شکر کرتا رہوں۔ اس دعا پر غور کرو اور دیکھو کہ کھانا کھاتے وقت آپ کے دل میں کیا جوش موجزن ہوں گے اور کیا شکر کا دریا پھوٹ کر بہہ رہا ہو گا۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ یعنی تمہارے لئے رسول کریم ﷺ ایک بہتر سے بہتر نمونہ ہے جس کی تمہیں پیروی کرنی چاہئے۔

باب دوم

عادات

آپ ﷺ کا حلیہ 'لباس اور کھانے پینے کا طریقہ لکھنے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ اب کچھ آپ ؐ کی بعض عادات پر بھی لکھا جاوے۔ ہر انسان کچھ نہ کچھ عادات کے ماتحت کام کرتا ہے۔ ہاں بعض تو نیک عادات کے عادی ہوتے ہیں اور بعض بد کے۔ شریر اپنی شرارت کی عادتوں میں مبتلا ہوتا ہے تو شریف نیک عادات کا عادی۔

ہمارے آنحضرت ﷺ کی ایک دو عادات جو میں اس جگہ بیان کرتا ہوں ان سے معلوم ہو گا کہ آپ ؐ کس قدر یُمن و نیکی کی طرف متوجہ تھے اور کس طرح ہر معاملہ میں میانہ روی اختیار فرماتے تھے۔

ہنسی کا طریق

آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے انسان کامل بنایا تھا۔ تمام نیک جذبات آپ ؐ میں پائے جاتے تھے اور ہر خوبی کو اپنے موقع اور محل پر استعمال فرماتے اور ایسا طریق اختیار کرتے جس سے اللہ تعالیٰ کا کوئی خلق ضائع نہ ہو جائے۔ بعض بناوٹی صوفیاء کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسے تکلفات اور مشقتوں میں اپنے آپ کو ڈال لیتے ہیں کہ جس کی وجہ سے انہیں کئی پاک جذبات اور کئی طیبات کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ بعض کھانے میں خاک ملا لیتے ہیں۔ بعض گندی ہو جانے اور سڑ جانے کے بعد غذا استعمال کرتے ہیں۔ بعض سارا دن سر ڈالے بیٹھے رہتے ہیں اور ایسی شکل بناتے ہیں کہ گویا کسی ماتم کی خبر سنکر بیٹھے ہیں اور ہنسنا تو درکنار بشاشت کا اظہار بھی حرام سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا سردار ﷺ جسے خدا نے انسانوں کا رہنما بنایا تھا وہ ایسا کامل تھا کہ کسی پاک جذبہ کو ضائع ہونے نہ دیتا ہنسی کے موقع پر ہنستا' رونے کے موقع پر روتا' خاموشی کے موقع پر خاموش رہتا اور بولنے کے موقع پر بولتا' غرض کوئی صفت اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کی کہ جسے اس نے ضائع ہونے دیا ہو اور اپنے عمل سے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ خدا کی خدائی کو مٹانے نہیں بلکہ قائم

کرنے آیا ہے اور یہی اس کی ادا ہے جو ہر طبیعت اور مذاق کے آدمی کو موہ لیتی ہے اور کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ بے اختیار دل اس پر قربان ہوتا ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ ہنستے بھی تھے لیکن اعتدال سے اور ہنسی کے وقت آپؐ کی طبیعت پر سے قابو نہ اٹھتا بلکہ ہنسی طبعی حالت پر رہتی چنانچہ فرماتی ہیں کہ مَارَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ضَاحِکًا حَتّٰی اَرٰی مِنْہُ لَھَوَاتِہٖ اِنَّمَا کَانَ یَتَبَسَّمُ (کتاب الادب باب التبسّم والضحک) یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح گلا پھاڑ کر ہنستے نہیں دیکھا کہ آپ کے حلق کا کوا نظر آنے لگ جائے بلکہ آپؐ صرف تبسم فرماتے تھے یعنی آپؐ کی ہنسی ہمیشہ ایسی ہوتی تھی کہ منہ نہ کھلتا تھا اور آپؐ افراط و تفریط دونوں سے محفوظ تھے۔ نہ تو ہنسی سے بکلی اجتناب تھا اور نہ قہقہہ مار کر ہنستے کہ جس میں کئی قسم کے نقص ہیں۔ آجکل تو میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان امراء میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ وہ اس زور سے قہقہہ مارتے ہیں کہ دوسرا سمجھے کہ شاید چھت اڑ جائے گی اور اس طرح وہ آجکل کے پیرزادوں کی ضد ہیں۔

دائیں جانب کا لحاظ

آنحضرت ﷺ (فداہ نفسی) کی یہ بھی عادت تھی کہ آپؐ ہمیشہ دائیں طرف کا لحاظ رکھتے۔ کھانا کھاتے تو دائیں ہاتھ سے۔ لباس پہنتے تو پہلے دایاں ہاتھ یا دایاں پاؤں ڈالتے۔ جوتی پہنتے تو پہلے دایاں پاؤں پہنتے۔ غسل میں پانی ڈالتے تو پہلے دائیں جانب۔ غرض کہ ہر ایک کام میں دائیں جانب کو پسند فرماتے۔ حتیٰ کہ جب آپؐ کوئی چیز مجلس میں بانٹنی چاہتے تو پہلے دائیں جانب سے شروع فرماتے۔ اور اگر اس قدر ہوتی کہ صرف ایک آدمی کو کفایت کرتی تو اسے دیتے جو دائیں جانب بیٹھا ہوتا۔ اور اس بات کا اتنا لحاظ تھا کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حَلَبْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَاۃً دَاجِنٍ فِیْ دَارِیْ وَشِیْبَ لَبَنُھَا بِمَاءٍ مِنَ الْبِئْرِ الَّتِیْ فِیْ دَارِیْ فَاُعْطِیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْقَدَحَ فَشَرِبَ مِنْہُ حَتّٰی اِذَا نَزَعَ الْقَدَحَ مِنْ فِیْہِ وَعَلٰی یَسَارِہٖ اَبُوْبَکْرٍ وَعَنْ یَمِیْنِہٖ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ عُمَرُ وَخَافَ اَنْ یُّعْطِیَہُ الْاَعْرَابِیَّ اَعْطِ اَبَابَکْرٍ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ عِنْدَکَ فَاَعْطَاہُ الْاَعْرَابِیَّ الَّذِیْ عَلٰی یَمِیْنِہٖ ثُمَّ قَالَ الْاَیْمَنُ فَالْاَیْمَنُ (تجرید بخاری باب فی الشرب) یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک بکری کا جو گھر میں رہتی تھی دودھ دوہا اور اس کے بعد دودھ میں اس کنوئیں سے پانی ملایا جو میرے گھر میں تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو وہ پیالہ دیا گیا۔ اس وقت آپؐ کے بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ اور دائیں جانب ایک اعرابی تھا آپؐ نے اس میں سے

کچھ پیا۔ پھر جب پیالہ منہ سے ہٹایا تو حضرت عمرؓ نے اس خوف سے کہ کہیں اس اعرابی کو جو آپؐ کے دائیں جانب بیٹھا تھا نہ دے دیں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ابوبکرؓ آپ کے پاس بیٹھے ہیں انہیں دے دیجئے گا۔ لیکن آپؐ نے اس اعرابی کو جو آپؐ کے دائیں جانب بیٹھا تھا وہ پیالہ دیا اور فرمایا کہ دایاں دایاں ہی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ دائیں جانب کا کتنا لحاظ رکھتے تھے جو آپؐ کی پاک فطرت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت انسانی میں دائیں کو بائیں پر ترجیح دینا رکھا ہے اور اکثر ممالک کے باشندے باوجود آپس میں کوئی تعلق نہ رکھنے کے اس معاملہ میں متحد ہیں اور دائیں کو بائیں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور چونکہ آنحضرت ﷺ کی فطرت نہایت پاک تھی اس لئے آپؐ نے اس بات کی بہت احتیاط رکھی۔ ایک اور حدیث بھی آپؐ کی اس عادت پر روشنی ڈالتی ہے۔ سہل ابن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَدَحٍ فَشَرِبَ مِنْہُ وَعَنْ یَمِیْنِہٖ غُلَامٌ اَصْغَرُ الْقَوْمِ وَالْاَشْیَاخُ عَنْ یَسَارِہٖ فَقَالَ یَا غُلَامُ اَتَاْذَنُ لِیْ اَنْ اُعْطِیَہُ الْاَشْیَاخَ قَالَ مَا کُنْتُ لِاُوْثِرَ بِفَضْلِیْ مِنْکَ اَحَدًا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَسَلَّمَ) فَاَعْطَاہُ اِیَّاہُ۔ (بخاری کتاب المساقاۃ باب فی الشرب) آنحضرت ﷺ کے پاس ایک پیالہ لایا گیا جس میں سے آپؐ نے کچھ پیا۔ اس وقت آپؐ کے دائیں جانب ایک نوجوان بیٹھا تھا جو سب حاضرین مجلس میں سے صغیر السن تھا اور آپؐ کے بائیں طرف بوڑھے سردار بیٹھے تھے۔ پس آپؐ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ اے نوجوان کیا تو مجھے اجازت دیتا ہے کہ میں یہ پیالہ بوڑھوں کو دوں۔ اس نوجوان نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ میں آپؐ کے تبرک کے معاملہ میں کسی اور کے لئے اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔ اس پر آپؐ نے وہ پیالہ اسی کو دے دیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ دائیں طرف کا ایسا لحاظ رکھتے کہ بائیں طرف کے بوڑھوں کو پیالہ دینے کے لئے آپؐ نے اول اس نوجوان سے اجازت طلب فرمائی اور اس کے انکار پر اس کے حق کو تسلیم کیا۔

ہر معاملہ میں خدا کا ذکر لاتے

آپؐ کو خدا تعالیٰ سے کچھ ایسی محبت اور پیار تھا کہ کوئی معاملہ ہو اس میں خدا تعالیٰ کا ذکر ضرور کرتے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، غرض کہ ہر موقع پر خدا کا نام ضرور لیتے جس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آگے چل کر کیا جائے گا۔ یہاں صرف اسقدر لکھنا ہے کہ یہ بات بھی آپؐ کی عادات میں داخل تھی کہ سونے سے پہلے دونوں ہاتھوں کو ملا کر دعا فرماتے پھر سب بدن پر ہاتھ پھیر لیتے چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی

ہیں کہ کَانَ اِذَا اٰوٰی اِلٰی فِرَاشِہٖ کُلَّ لَیْلَۃٍ جَمَعَ کَفَّیْہِ ثُمَّ نَفَثَ فِیْھِمَا فَقَرَأَ فِیْھِمَا قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ وَ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ثُمَّ یَمْسَحُ بِھِمَا مَا اسْتَطَاعَ مِنْ جَسَدِہٖ یَبْدَأُ بِھِمَا عَلٰی رَأْسِہٖ وَ وَجْھِہٖ وَمَا اَقْبَلَ مِنْ جَسَدِہٖ یَفْعَلُ ذٰلِکَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (بخاری کتاب التفسیر باب فضل المعوّذات) یعنی آپ ہر شب جب اپنے بستر پر جاتے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ملاتے پھر ان میں پھونکتے اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے۔ پھر جہاں تک ہو سکتا اپنے بدن پر ہاتھ ملتے اور ابتداء سر اور منہ اور جسم کے اگلے حصہ سے فرماتے اور تین دفعہ ایسا ہی کرتے۔ ذرا ان تین سورتوں کو با ترجمہ پڑھو اور پھر سوچو کہ رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور غنا پر کتنا ایمان تھا۔ کس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ کے بغیر اپنی زندگی خطرہ میں سمجھتے تھے۔

باب سوم

اخلاق پر مجموعی بحث

پیشتر اس کے کہ میں آنحضرت ﷺ کے اخلاق پاکیزہ کا فرداً فرداً ذکر کروں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون پر ایک مجموعی حیثیت سے بھی روشنی ڈالوں جس سے پڑھنے والے کو پہلے ہی سے تنبیہ ہو جائے کہ کس طرح آپ ؐ ہر پہلو سے کامل تھے اور اخلاق کی تمام شاخوں میں آپ ؐ دوسروں کی نسبت بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اس بات کے مفصل ثبوت کے لئے تو انسان کو احادیث کا مطالعہ کرنا چاہئے کیونکہ جب آپ ؐ کا سلوک صحابہؓ سے اور ان کا عشق آپ ؐ سے دیکھا جائے تو بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے۔

مرحبا احمد مکی مدنی العربی -:- دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

لیکن اس جگہ میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عرب ایک وحشی قوم تھی اور وہ کسی کی اطاعت کرنا حتّی الوسع عار جانتی تھی اور اسی لئے کسی ایک بادشاہ کے ماتحت رہنا انہیں گوارہ نہ تھا بلکہ قبائل کے سردار عوام سے مشورہ لے کر کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قیصرو کسریٰ کی حکومتیں ان کے دونوں طرف پھیلی ہوئی تھیں لیکن ان کی وحشت اور آزادی کی محبت کو دیکھ کر وہ بھی عرب کو فتح کرنے کا خیال نہ کرتی تھیں۔ عمرو بن ہند جیسا زبردست بادشاہ جس نے ارد گرد کے علاقوں پر بڑا رعب جمایا ہؤا تھا وہ بھی بدوی قبائل کو روپیہ وغیرہ سے بمشکل اپنے قابو میں لا سکا اور پھر بھی یہ حالت تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر وہ اسے صاف جواب دے دیتے تھے اور اس کے منہ پر کہہ دیتے تھے کہ ہم تیرے نوکر نہیں کہ تیری فرمانبرداری کریں چنانچہ لکھا ہے کہ عمرو بن ہند نے اپنے سرداروں سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص ایسا بھی ہے کہ جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے سے عار کرے۔ اس کے مصاحبوں نے جواب دیا کہ ایک شخص عمرو بن کلثوم ہے اور عرب قبیلہ بنی تغلب کا سردار ہے۔ اس کی ماں بے شک آپ کی ماں کی خدمت سے احتراز کرے گی اور اسے اپنے لئے عار

سمجھے گی جس پر بادشاہ نے ایک خط لکھ کر عمرو بن کلثوم کو بلوایا اور لکھا کہ اپنی والدہ کو بھی ساتھ لیتے آنا کیونکہ میری والدہ اسے دیکھنا چاہتی ہے۔ عمرو بن کلثوم اپنی والدہ اور چند اور معزز خواتین کو لے کر اپنے ہمراہیوں سمیت بادشاہ کے خط کے بموجب حاضر ہو گیا بادشاہ کی والدہ نے حسب مشورہ اس کی والدہ سے کچھ کام لینا تھا۔ دونوں زنان خانہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ والدہ شاہ نے کسی موقع پر سادگی کے ساتھ کہہ دیا کہ ذرا فلاں قاب مجھے اٹھادو۔ عمرو بن کلثوم کی والدہ لیلیٰ نے جواب دیا کہ جسے ضرورت ہو خود اٹھالے۔ اس پر والدہ شاہ نے مکرّر اصرار کیا لیکن لیلیٰ نے بجائے اس حکم کی تعمیل کے زور سے نعرہ مارا کہ وَا اَذِلَّاہُ یَا بَنِی تَغْلَبَ اے بنی تغلب دوڑو کہ تمہاری ذلت ہو گئی ہے۔ اس آواز کا سننا تھا کہ اس کے بیٹے عمرو بن کلثوم کی آنکھوں میں تو خون اتر آیا۔ بادشاہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا گھبرا اٹھا۔ چونکہ اپنے پاس تو کوئی ہتھیار نہ تھا ادھر ادھر دیکھا۔ بادشاہ کی تلوار کھونٹی کے ساتھ لٹک رہی تھی اس کی طرف جھپٹا اور تلوار میان سے نکال کر ایک ہی وار سے بادشاہ کا سر اڑا دیا لیکن اس سے بھی جوش انتقام نہ اترا۔ باہر نکل کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ شاہی مال و متاع لوٹ لو۔ بادشاہ کی سپاہ تو غافل تھی اس کے سنبھلتے سنبھلتے لوٹ لاٹ کر صفایا کر دیا اور اپنے وطن کی طرف چلا آیا۔ چنانچہ اپنے ایک قصیدہ میں اس شاعر نے عمرو بن ہند کو مخاطب کر کے اپنے آزاد ہونے کا ذکر یوں کیا ہے:-

اَبَا ہِنْدٍ فَلَا تَعْجَلْ عَلَیْنَا ۔۔۔ وَ اَنْظِرْنَا نُخَبِّرْکَ الْیَقِیْنَا

اے ابا ہند تو ہمارے معاملہ میں جلدی نہ کر ۔۔۔ اور ہمیں ڈھیل دے ہم تجھے یقینی بات بتائیں گے

بِاَنَّا نُوْرِدُ الرَّایَاتِ بِیْضًا ۔۔۔ وَنُصْدِرُ ھُنَّ حُمْرًا قَدْ رَوِیْنَا

وہ یہ کہ ہم سفید جھنڈوں کے ساتھ جنگ میں جاتے ہیں ۔۔۔ اور جب واپس آتے ہیں تو وہ جھنڈے خون سے سرخ و سیراب ہوتے ہیں

وَ اَیَّامٍ لَنَا غُرٍّ طِوَالٍ ۔۔۔ عَصَیْنَا الْمَلِکَ فِیْھَا اَنْ نَدِیْنَا

اور بہت سے ہمارے مشہور اور دراز معرکے ہیں ۔۔۔ کہ ہم نے ان میں بادشاہ کی نافرمانی کی تا اس کے مطیع نہ ہو جائیں

وَرِثْنَا الْمَجْدَ قَدْ عَلِمَتْ مَعَدٌّ ۔۔۔ نُطَا عِنُ دُوْنَہٗ حَتّٰی یَبِیْنَا

عرب جانتے ہیں کہ ہم بزرگی کے وارث ہیں ۔۔۔ اپنے شرف کے لئے لڑتے ہیں تاکہ وہ ظاہر ہو جائے

اَلَا لَا یَعْلَمُ الْاَقْوَامُ اَنَّا ۔۔۔ تَضَعْضَعْنَا وَاَنَّا قَدْ وَنِیْنَا

خبردار تو ہمیں یہ نہ سمجھ کہ ہم ۔۔۔ کمزور اور ست و کاہل ہو گئے ہیں

اَلَا لَا یَجْھَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا ۔۔۔ فَنَجْھَلَ فَوْقَ جَھْلِ الْجَاھِلِیْنَا

خبردار کوئی ہم پر جہالت سے ظلم نہ کرے ورنہ ہم ظالموں کے ظلم کا سخت بدلہ دیں گے

بِاَیِّ مَشِیْئَۃٍ عَمْرَو بْنَ ھِنْدٍ نَکُوْنُ لِقَیْلِکُمْ فِیْنَا قَطِیْنَا

کس وجہ سے عمرو بن ہند تو چاہتا ہے کہ ہم تیرے گورنر کے فرمانبردار ہو جائیں

تُھَدِّدُنَا وَ تُوْعِدُنَا رُوَیْدًا مَتٰی کُنَّا لِاُمِّکَ مَقْتَوِیْنَا

تو ہمیں ڈراتا ہے اور دھمکاتا ہے جانے بھی دے ہم تیری ماں کے خادم کب ہوئے تھے

فَاِنَّ قَنَاتَنَا یَا عَمْرُو اَعْیَتْ عَلَی الْاَعْدَآءِ قَبْلَکَ اَنْ تَلِیْنَا ☆

اے عمرو ہمارے نیزوں نے انکار کیا ہے تجھ سے پہلے بھی کہ دشمنوں کے لئے نرم ہو جائیں

ان اشعار کو دیکھو کس جوش کے ساتھ وہ بادشاہ کو ڈانٹتا ہے اور اپنی آزادی میں فرق آتا نہیں دیکھ سکتا۔ جو حال بنی تغلب کا ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے وہی حال قریباً قریباً سب عرب کا تھا اور خصوصاً قریش مکہ تو کسی کی ماتحتی کو ایک دم کے لئے بھی گوارہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انہیں کعبہ کی ولایت کی وجہ سے جو حکومت کل قبائل عرب پر تھی اس کی وجہ سے ان کے مزاج دوسرے عربوں کی نسبت زیادہ آزاد تھے بلکہ وہ ایک حد تک خود حکومت کرنے کے عادی تھے اس لئے ان کا کسی شخص کی حکومت کا اقرار کر لینا تو بالکل امر محال تھا یہ وہ قوم تھی کہ جس میں رسول کریم ﷺ کا ظہور ہؤا اور پھر ایسے رنگ میں کہ آپؐ نے ان کی ایک نہیں دو نہیں تمام رسوم و عادات بلکہ تمام اعتقادات کا قلع قمع کرنا شروع کیا جس کے بدلہ میں انکے دلوں میں آپؐ کی نسبت جو کچھ بغض و کینہ ہو گا وہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

مگر آپؐ کے اخلاق کو دیکھو کہ ایسی آزاد قوم باوجود ہزاروں کینوں اور بغضوں کے جب آپؐ کے ساتھ ملی ہے اسے اپنے سر پیر کا ہوش نہیں رہا وہ سب خود سری بھول گئی اور آپؐ کے عشق میں کچھ ایسی مست ہوئی کہ وہ آزادی کے خیال خواب ہو گئے۔ اور یا تو کسی کی ماتحتی کو برداشت نہ کرتی تھی یا آپؐ کی غلامی کو فخر سمجھنے لگی۔ اللہ اللہ! بڑے بڑے خونخوار اور وحشی عرب مذہبی جوش سے بھرے ہوئے قومی غیرت سے دیوانہ ہو کر آپؐ کے خون کے پیاسے ہو کر آپؐ کے پاس آتے تھے اور ایسے رام ہوتے تھے کہ آپؐ ہی کا کلمہ پڑھنے لگ جاتے۔ حضرت عمرؓ جیسا تیز مزاج گھر سے یہ تہیّہ کر کے نکلا کہ آج اس مدعی نبوت کا خاتمہ ہی کر کے آوں گا۔ غصہ سے بھرا ہؤا تلوار کھینچے ہوئے آپؐ کے پاس آتا ہے لیکن آپؐ کی نرمی اور وقار و سکینت اور اللہ تعالیٰ پر ایمان

☆ "سبعہ معلقات" قصیدہ پنجم از عمرو بن کلثوم صفحہ ۳ تا ۴ مطبع سعیدی کراچی ناشر محمد سعید اینڈ سنز

دیکھ کر آپؐ کو قتل تو کیا کرنا تھا خود اپنے نفس کو قتل کر کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گیا- کیا کوئی ایک نظیر بھی دنیا میں ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ایسی آزاد اور خونخوار قوم کو کسی نے ایسا مطیع کیا ہو اور وہ اپنی آزادی چھوڑ کر غلامی پر آمادہ ہو گئی ہو اور ہر قسم کی فرمانبرداری کے نمونے اس نے دکھائے ہوں- اگر کوئی ایسی قوم پائی جاتی ہو تو اس کا نشان و پتہ ہمیں بتاؤ تاہم بھی تو اس کے حالات سے واقف ہوں- لیکن میں سچ سچ کہتا ہوں کہ کوئی مصلح ایسے وسیع اخلاق لے کر دنیا میں نہیں آیا جیسا کہ ہمارا آقا ﷺ اور اس لئے کسی مصلح کی جماعت نے ایسی فدائیت نہیں دکھائی جیسے ہمارے آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ نے چنانچہ بخاری شریف میں صلح حدیبیہ کے واقعات میں مسور ابن مخرمہ کی روایت ہے کہ جب آپؐ حدیبیہ میں ٹھہرے ہوئے تھے تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تھوکتے تھے تو صحابہؓ اچک کر آپؐ کا تھوک اپنے منہ اور ہاتھوں پر مل لیتے تھے اور جب وضو کرنے لگتے تو وضو کے بچے ہوئے پانی کے لینے کے لئے اس قدر لڑتے کہ گویا ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے- اور جب آپؐ کوئی حکم دیتے تھے تو ایک دوسرے کے آگے بڑھ کر اس کی تعمیل کرتے- اور جب آپؐ بولنے لگتے تو سب اپنی آوازوں کو نیچا کر لیتے اور صحابہؓ کے اس اخلاص اور محبت کا ان ایلچیوں پر جو گفتگو کے لئے آئے تھے ایسا اثر پڑا کہ انہوں نے اپنی قوم کو واپس جا کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپؐ کی مخالفت سے باز آجائیں-

اسی طرح بخاری میں لکھا ہے کہ جنگ احد پر جانے کے متعلق جب آپؐ نے انصارؓ سے سوال کیا تو سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے آپؐ کو جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح کہہ دیں گے کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدہ: ۲۵) یعنی تو اور تیرا رب جاؤ اور دونوں دشمنوں سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں بلکہ خدا کی قسم ہم تیرے آگے بھی اور پیچھے بھی اور دائیں بھی اور بائیں بھی تیرے دشمنوں سے مقابلہ کریں گے- اے چشم بصیرت رکھنے والو! اے فہم دل رکھنے والو خدا را ذرا اس جواب کا اس جواب سے مقابلہ تو کرو جو حضرت موسیٰؑ کو ان کی امت نے دیا اور اس عمل سے بھی مقابلہ کرو جو حواریوں سے حضرت مسیحؑ کے گرفتار ہونے کے وقت سرزد ہؤا- اور پھر بتاؤ کہ کیا اس قربانی اس فدائیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہمارا رسول ﷺ ایسے اخلاق رکھتا تھا کہ جن کی نظیر دنیاوی بادشاہوں میں تو خیر تلاش کرنی ہی فضول ہے دینی بادشاہوں یعنی نبیوں میں بھی نہیں مل سکتی- اور اگر کوئی نبی ایسے اخلاق رکھتا تو ضرور اس کی امت بھی اس پر اس طرح فدا ہوتی جس طرح آپؐ پر-

مگر اس اخلاق کے مقابلہ کے ساتھ عربوں کی آزادی کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ اس موقع پر میں ایک اور نظیر دینی بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جس سے مردوں کے علاوہ عورتوں کے اخلاص کا نمونہ بھی ظاہر ہو جائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جَاءَتْ هِنْدُ بِنْتُ عُتْبَةَ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا كَانَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ مِنْ اَهْلِ خِبَاءٍ اَحَبَّ اِلَيَّ اَنْ يَذِلُّوْا مِنْ اَهْلِ خِبَائِكَ ثُمَّ مَا اَصْبَحَ الْيَوْمَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ اَهْلُ خِبَاءٍ اَحَبَّ اِلَيَّ اَنْ يَعِزُّوْا مِنْ اَهْلِ خِبَائِكَ (بخاری کتاب المناقب باب ذکر ہند بنت عتبہ) یعنی ہند بنت عتبہ آئی اور اس نے حضرت رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ روئے زمین پر کوئی خیمہ والا نہ تھا جس کی نسبت میں آپ سے زیادہ ذلت کی خواہشمند ہوں اور اب روئے زمین پر کوئی گھر والا نہیں جس کی نسبت میں آپ کے گھر والوں سے زیادہ عزت کی خواہشمند ہوں۔ اس عورت کی طرف دیکھو یا تو وہ بغض تھا یا ایسی فریفتہ ہو گئی اور اس کی وجہ سوائے ان اخلاق کریمہ اور اس نیکی اور تقویٰ کے کیا تھی جو آپ میں پائے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس کی یہی وجہ بیان فرماتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں لکھا ہے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران:۱۶۰) غرض کہ ان اخلاق حسنہ کا ایسا نیک اثر پڑا کہ ایک ایک کر کے تمام عرب قبیلے آپ کی خدمت میں آ حاضر ہوئے۔ بھلا اس واقعہ کا عمرو بن ہند کے واقعہ سے مقابلہ تو کر کے دیکھو "ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا"۔

رسول کریمؐ کے اخلاق حسنہ کے متعلق آپؐ کی بیوی کی گواہی

اس وقت تک تو میں نے آنحضرتؐ کے اخلاق حسنہ کو آپؐ کے صحابہؓ کی فدائیت سے ثابت کیا ہے اب ایک اور طریق سے اس امر پر روشنی ڈالتا ہوں۔ آدمی کا سب سے زیادہ تعلق اپنی بیوی سے ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس روزانہ بہت سا وقت خرچ کرنا پڑتا ہے اور بہت سی ضروریات میں اس کے ساتھ مشارکت اختیار کرنی پڑتی ہے اس لئے یہ تو ممکن ہے کہ انسان باہر لوگوں کے ساتھ تکلف کے ساتھ نیک اخلاق کے ساتھ پیش آسکے اور ایک وقت کے لئے اس گند کو چھپالے جو اس کے اندر پوشیدہ ہو لیکن یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ کوئی اپنی برائیوں اور بدخلقیوں کو اپنی بیوی سے پوشیدہ رکھ سکے کیونکہ علاوہ ایک دائمی صحبت اور ہر وقت کے تعلق کے بیوی پر مرد کو کچھ اختیار بھی ہوتا ہے اور اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی فطری بداخلاقی کا اکثر اوقات اس کے سامنے اظہار کر دیتا ہے۔ پس انسان کے

اخلاق کا بہتر سے بہتر گواہ اس کی بیوی ہوتی ہے جس کا تجربہ دوسرے لوگوں کے تجربہ سے بہت زیادہ صحیح مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق جو گواہی حضرت خدیجہؓ نے دی ہے وہ آپ ﷺ کے نیک اخلاق کو ثابت کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے اور اس کے بعد کسی زائد شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت عائشہؓ وحی کی ابتداء بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ جب پہلی دفعہ آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو آپ بہت گھبرائے اور غار حرا سے گھر کی طرف لوٹے اور آپ کا دل دھڑک رہا تھا حضرت خدیجہؓ کے پاس آکر آپؐ نے فرمایا کہ مجھے کپڑا اوڑھادو۔ جلد کپڑا اوڑھادو۔ جس پر آپؐ پر کپڑا ڈالا گیا یہاں تک کہ آپؐ کا کچھ خوف کم ہوا اور آپؐ نے سب واقعہ حضرت خدیجہؓ کو سنایا اور فرمایا کہ مجھے تو اپنی نسبت کچھ خوف پیدا ہو گیا ہے۔ اس بات کو سنکر جو کچھ حضرت خدیجہؓ نے فرمایا وہ یہ ہے کَلَّا وَاللّٰہِ مَا یُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْکَلَّ وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّیْفَ وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری باب کیف کان بدء الوحی) یعنی سنو جی میں خدا کی قسم کھاکر کہتی ہوں کہ خدا تجھے کبھی ذلیل نہیں کرے گا کیونکہ تو رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے اور کمزوروں کا بوجھ اٹھاتا ہے اور تمام وہ نیک اخلاق جو دنیا سے معدوم ہو چکے ہیں ان پر عامل ہے۔ مہمانوں کی خدمت کرتا ہے اور سچی مصیبتوں پر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ اس کلام کے باقی حصوں پر تو اپنے وقت پر لکھوں گا سردست حضرت خدیجہؓ کی گواہی کو پیش کرتا ہوں جو آپ نے قسم کھاکر دی ہے یعنی تَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ کی گواہی گو کافی تھی لیکن اپنے خدا کی قسم کے ساتھ مؤکّد کر کے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ میں تمام اخلاق حسنہ پائے جاتے ہیں حتّٰی کہ وہ اخلاق بھی جو اس وقت ملک میں کسی اور آدمی میں نہیں دیکھے جاتے تھے۔

یہ گواہی کیسی زبردست اور کیسی صاف ہے اور پھر بیوی کی گواہی اس معاملہ میں جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں نہایت ہی معتبر ہے۔ حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں کہ کل اخلاق حسنہ جو دنیا سے معدوم ہو چکے ہیں آپؐ میں پائے جاتے تھے۔

خود رسول کریم ﷺ کی گواہی اپنے اخلاق کی نسبت

حضرت خدیجہؓ کی گواہی پیش کرنے کے بعد میں خود آنحضرت ﷺ کی گواہی اپنی نیک سیرتی کی نسبت پیش کرتا ہوں۔ شاید اس پر بعض لوگ حیران ہوں کہ اپنی نسبت آپ گواہی کے کیا معنی ہوئے لیکن یہ گواہی رسول کریم ﷺ نے ایسی

بے تکلفی سے اور بغیر پہلے غور کے دی ہے کہ موافق تو الگ رہے مخالف کو بھی اس کے ماننے سے انکار نہیں ہونا چاہئے۔ اس حدیث میں جس میں حضرت خدیجہؓ کی گواہی کا ذکر ہے آگے چل کر لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ آنحضرت ﷺ کو اپنے ساتھ اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور انہیں کل حال سنایا انہوں نے سن کر کہا کہ یہ فرشتہ جو آپؐ پر نازل ہوا ہے یہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمایا تھا اور فرمایا کہ یَا لَیْتَنِیْ فِیْھَا جَذَعًا لَیْتَنِیْ اَکُوْنُ حَیًّا اِذْ یُخْرِجُکَ قَوْمُکَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوَ مُخْرِجِیَّ ھُمْ (بخاری جلد اول باب کیف کان بدء الوحی) یعنی اے کاش کہ میں اس وقت جوان و توانا ہوں۔ اے کاش کہ میں اس وقت زندہ ہوں جبکہ تجھے تیری قوم نکال دے گی رسول اللہؐ نے سنکر فرمایا کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟

اس گفتگو سے اور خصوصاً رسول کریم ﷺ کے اس قول سے کہ ”کیا مجھے میری قوم نکال دے گی“ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا اندر کیسا صاف تھا۔ اور جب آپؐ نے ورقہ بن نوفل سے یہ بات سنی کہ آپؐ کو اہل مکہ نکال دیں گے تو آپ کو اس سے سخت حیرت ہوئی کیونکہ آپ اپنے نفس میں جانتے تھے کہ مجھ میں کچھ عیب نہیں۔ اور اگر آپ ذرہ بھر بھی اپنی طبیعت میں تیزی پاتے تو اس قدر تعجب کا اظہار نہ فرماتے لیکن ورقہ کی بات سنکر اس پاک فطرت انسان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ ہیں کیا میری قوم مجھے نکال دے گی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بعض خبیث الفطرت ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو ہر نور کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ تو اس بات پر حیران تھا کہ اس پاک زندگی اور اس دردمند دل کے باوجود میری قوم مجھے کیوں کر نکال دے گی۔

اخلاق حمیدہ کی تفصیل

اخلاق پر ایک مجملاً بحث کرنے کے بعد اب میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے آنحضرت ﷺ کے اخلاق کا تفصیلاً بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن پیشتر اس کے کہ میں فرداً فرداً آپؐ کے اخلاق کا بیان کروں ان کی تقسیم کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اس تقسیم کو مدنظر رکھ کر ناظرین پر یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاوے کہ تمام کے تمام شعبہ ہائے اخلاق میں آپؐ کمال کو پہنچ گئے تھے اور ہر حصہ زندگی میں آپ کے اخلاق اپنا جلوہ دکھا رہے تھے اور کوئی صنف خوبی کی باقی نہ رہی تھی جس میں آپؐ نے دوسرے تمام انسانوں کو اپنے پیچھے نہیں چھوڑ دیا۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے انسان کے تعلقات تین طرح کے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا تعلق تو اسکا خدا سے ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کا خالق و رازق ہے۔ اس کے فضل کے بغیر اس کا ایک دم آرام سے نہیں گزر سکتا بلکہ آرام تو الگ رہا اس کی زندگی ہی محال ہے۔ اس کے

احسانات کی کوئی حد نہیں ہر ایک لحہ میں اس کے فضلوں کی بارش ہم پر ہو رہی ہے۔ کمزور سے کمزور ضعیف سے ضعیف حالت سے اس نے ہمیں اس حد کو پہنچایا ہے اور عقل و خرد بخش کر کل مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے اس لئے اگر اس کے ساتھ ہمارے تعلقات درست نہ ہوں۔ اگر ہمارے اخلاق تعلق باللہ میں ادنیٰ ہوں اور اس کے احسانات کو ہم فراموش کر دیں تو ہم سے زیادہ کوئی ذلیل نہیں۔ خالق کے بعد ہمارا تعلق مخلوق سے ہے کہ ان میں بھی کوئی ہمارا محسن ہے، کوئی ہمارا معلّم ہے، کوئی ہمارا مہربان ہے، کوئی درد خواہ ہے، کوئی ہمارے آرام و آسائش میں کوشاں ہے، کوئی ہماری محبت اور توجہ کا محتاج ہے، کوئی اپنی کمزوریوں اور اپنی گری ہوئی حالت اور اپنے ہم سفروں سے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ہم سے نصرت و مدد کا متمنی ہے۔ غرضیکہ ہزاروں طریق سے ہزاروں آدمی ہم سے متعلق ہیں اور اگر ہمارے معاملات ان سے درست نہ ہوں اگر ان سے بد خلقی سے پیش آئیں تب بھی دنیا کا امن و امان جاتا رہتا ہے اور فساد و بغاوت میں ترقی ہوتی ہے پس اگر ہمارے اخلاق مخلوق سے درست نہ ہوں تو ہم ایک ڈاکو کی طرح ہیں جو دنیا سے اس کے امن و آرام کا متاع لوٹتا اور غارت کرتا ہے۔

تیسرا تعلق ہمارا خود اپنے نفس سے ہے کہ یہ بھی ہماری بہت سی توجہات کا محتاج ہے اور جس طرح ہمارا خالق سے منہ موڑنا یا مخلوق سے بد اخلاقی سے پیش آنا نہایت مضر اور مخرّبِ امن ہے اسی طرح ہمارا اپنے نفس سے بد سلوکی کرنا اور اخلاق رذیلہ سے پیش آنا نہایت خطرناک اور باعث فساد ہے۔ پس وہی انسان کامل ہو سکتا ہے کہ جو ان تینوں معاملات میں کامل ہو اور ان اصناف میں سے ایک صنف میں بھی کمزوری نہ دکھلائے۔

اگر ان تینوں اقسام اخلاق کو مد نظر رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر انسان جو اخلاق میں کامل سمجھے جاتے ہیں بہت سی کمزوریاں رکھتے ہیں۔ اور اگر ایک قسم کے اخلاق میں انہیں کمال حاصل ہے تو دوسری قسم میں انہیں کوئی دسترس نہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے پیاروں اور پاک بندوں کا گروہ ہی نکلے گا کہ جو ان تینوں اقسام اخلاق میں کمال رکھتا ہے اور کسی خوبی کو اس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور جب آپ رسول کریم ﷺ کے اخلاق کا مطالعہ غور سے کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ تمام صاحب کمال لوگوں کے سردار تھے اور باوجود اس کے کہ دنیا میں بہت سے صاحب کمال لوگ گزرے لیکن جس رنگ میں آپ رنگین تھے اس کے سامنے سب کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں اور جن خوبیوں کے آپؐ جامع تھے ان کا عشر عشیر بھی کسی اور انسان میں نہیں پایا جاتا

عجب نوریست درجان محمدؐ عجب لعلیست درکان محمدؐ
ندانم ہیچ نفسے در دو عالَم کہ دارد شوکت و شان محمدؐ

ہم اس بات سے قطعاً منکر نہیں ہیں کہ آپ کے پہلے بھی اور آپ کے بعد بھی بڑے بڑے صاحب کمال پیدا ہوئے ہیں لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کی مثال اور آنحضرت ﷺ کی مثال دیئے اور سورج کی ہے اور سمندر اور دریا کی ہے کیونکہ وہ دلربا یکتا ان تمام خوبیوں کا جامع تھا جو مختلف اوقات میں مختلف صاحب کمال لوگوں نے حاصل کیں۔ آپ نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے احکام کی اطاعت میں ایسا محو کر دیا تھا کہ دنیا میں اس کے روشن مظہر ہو گئے تھے اور وہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کہنے والا انسان خود اس قول کا کامل نمونہ تھا

زاں نمط شد محو دلبر کز کمال اتحاد پیکر اوشد سراسر صورت رب رحیم
بوئے محبوب حقیقی میدمد زاں روئے پاک ذات حقانی صفاتش مظہر ذات قدیم

میں ان تینوں اقسام اخلاق میں سے پہلے تو اس کے اخلاق حسنہ میں سے وہ حصہ بیان کروں گا کہ جس سے آپ کا تعلق باللہ بدرجہ کمال ثابت ہوتا ہے۔ پھر وہ حصہ جس سے آپؐ کے نفس کی پاکیزگی اور کمال ثابت ہوتا ہے۔ اور آخر میں وہ حصہ جس سے مخلوق سے آپؐ کے تعلق کی کیفیت کھلتی ہے۔

اخلاص باللہ - خشیت الٰہی

آپ کی ایک دعا

آپؐ کی خشیت الٰہی کا ثبوت ایک دعا سے خوب ملتا ہے۔ انسان جس وقت لوگوں سے جدا ہو کر دعا مانگتا ہے تو اس وقت اسے کسی بناوٹ کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس وقت کے خیالات اگر کسی طرح معلوم ہو جائیں تو وہ اس کے سچے خیالات ہوں گے کیونکہ وہ ان خیالات کا اظہار تخلیہ میں کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نماز میں یہ دعا مانگا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَحْیَا وَ فِتْنَۃِ الْمَمَاتِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ فَقَالَ لَہٗ قَائِلٌ مَا اَکْثَرُ مَا تَسْتَعِیْذُ مِنَ الْمَغْرَمِ فَقَالَ اِنَّ

الرَّجُلَ اِذَا غَرِمَ حَدَّثَ فَكَذَبَ وَ وَعَدَ فَاَخْلَفَ (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الدعاء قبل السلام) اے میرے خدا میں تیری ہی پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے اور میں پناہ مانگتا ہوں مسیح الدجال کے فتنہ سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں زندگی اور موت کے فتنوں سے اے میرے رب میں پناہ مانگتا ہوں گناہوں سے اور قرضہ سے اس دعا کو سنکر ایک شخص نے پوچھا کہ آپؑ قرضہ سے اس قدر کیوں پناہ مانگتے ہیں۔ فرمایا کہ جب انسان قرضدار ہو جاتا ہے تو بات کرتے وقت جھوٹ بول جاتا ہے اور وعدہ کرکے اس کے خلاف کرتا ہے۔ کیسی پاک دعا ہے آپؑ کے اندرونہ پر کیسی روشنی ڈالتی ہے اور اس سے کیسا کھلا کھلا ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپؑ اللہ تعالیٰ سے کیسے خائف تھے۔ کس طرح اس کے حضور گرتے اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتے پھر اسی سے عرض کرتے کہ مجھ سے تو کچھ نہیں ہو سکتا تو خود ہی فضل کر۔

خدا تعالیٰ کے غناء سے خوف

بڑوں اور چھوٹوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جن کے پاس کچھ ہوتا ہے وہ کیسے منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ جیسے انسان اور ختم نبوت کا دعویٰ' قرآن شریف جیسی کتاب اتر رہی ہے۔ نصرت الٰہی کی وہ بھرمار ہے کہ دشمن و دوست حیران ہیں۔ ہر گھڑی پیار و محبت کے اظہار ہو رہے ہیں۔ حتّٰی کہ بارگاہ خداوندی سے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۲) کا حکم جاری ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ آپؑ کی شان میں فرماتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح: ۱۱) اور اسی طرح ارشاد ہوتا ہے کہ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (النجم: ۱۰) لیکن خشیت الٰہی کا یہ حال ہے کہ آپ فرماتے ہیں وَاللّٰهِ مَا اَدْرِيْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا يُفْعَلُ بِيْ خدا کی قسم میں نہیں جانتا باوجود اس کے کہ میں خدا کا رسول ہوں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ سچ ہے کہ جسے جتنا قرب شاہی نصیب ہوتا ہے اسی طرح وہ خائف بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ادھر تو اس بادشاہ دوجہاں کا اللہ تعالیٰ کی خشیت میں یہ کمال تھا ادھر ہم آجکل فقراء کو دیکھتے ہیں کہ ذرا کوئی بات ہوئی اور کہتے ہیں کہ الٹا دوں طبقۂ زمین و آسمان۔ ایک ہاتھ میں سوٹا اور ایک ہاتھ میں کشکول گدائی لئے پھرتے ہیں۔ بدن پر ہندو فقیروں کی طرح راکھ ملی ہوئی ہوتی ہے معرفت الٰہی سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ قرآن شریف پر عمل تو الگ رہا ایک آیت بھی پڑھ نہیں سکتے لیکن دعاوی دیکھو تو کہو کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ سب کاروبار خدائی انہیں سپرد کرکے آپ علیحدہ ہو گیا ہے یہ تو جہلاء کا گروہ ہے پیروں کی بھی ایسی ہی حالت ہے بعض تو فقط اپنی بہشت تو الگ رہی اپنے دستخطی رقعوں پر دوسروں

کو بھی بہشت دلاتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی انکی حالت پر رحم کرے اور ہمیں اس پاک رسول ؐ کی اطاعت کی توفیق دے کہ اس کے بغیر نجات نہیں۔

بدر کا واقعہ

بدر کے موقع پر آنحضرت ﷺ سے جو ظہور میں آیا وہ بھی چشم بصیرت رکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کیلئے کافی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے دل میں اللہ تعالیٰ کا کس قدر خوف تھا۔ جنگ بدر کے موقع پر جبکہ دشمن کے مقابلہ میں آپؐ اپنے جاں نثار بہادروں کو لے کر پڑے ہوئے تھے۔ تائید الٰہی کے آثار ظاہر تھے کفار نے اپنے قدم جمانے کیلئے پختہ زمین پر ڈیرے لگائے تھے اور مسلمانوں کے لئے ریت کی جگہ چھوڑی تھی لیکن خدا نے بارش بھیج کر کفار کے خیمہ گاہ میں کیچڑ ہی کیچڑ کر دیا اور مسلمانوں کی جائے قیام مضبوط ہو گئی۔ اسی طرح اور بھی تائیدات سماوی ظاہر ہو رہی تھیں لیکن باوجود اس کے اللہ تعالیٰ کا خوف آنحضرت ﷺ کے دل پر ایسا غالب تھا کہ سب وعدوں اور نشانات کے باوجود اس کے غناء کو دیکھ کر گھبراتے تھے اور بیتاب ہو کر اس کے حضور میں دعا فرماتے تھے کہ مسلمانوں کو فتح دے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ ھُوَ فِیْ قُبَّۃٍ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَنْشُدُکَ عَھْدَکَ وَوَعْدَکَ اَللّٰھُمَّ اِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْیَوْمِ فَاَخَذَ اَبُوْبَکْرٍ بِیَدِہٖ فَقَالَ حَسْبُکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَقَدْ اَلْحَحْتَ عَلٰی رَبِّکَ وَھُوَ فِی الدِّرْعِ فَخَرَجَ وَھُوَ یَقُوْلُ سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ بَلِ السَّاعَۃُ مَوْعِدُھُمْ وَالسَّاعَۃُ اَدْھٰی وَاَمَرُّ (بخاری کتاب الجھاد باب ما قیل فی درع النبی صلی اللہ علیہ وسلم) نبی کریمؐ جنگ بدر میں ایک گول خیمہ میں تھے اور فرماتے تھے کہ اے میرے خدا میں تجھے تیرے عہد اور وعدے یاد دلاتا ہوں اور ان کے ایفاء کا طالب ہوں۔ اے میرے رب اگر تو ہی (مسلمانوں کی تباہی) چاہتا ہے تو آج کے بعد تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ لیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ بس کیجئے آپ نے تو اپنے رب سے دعا کرنے میں حد کر دی رسول کریم ﷺ نے اس وقت زرہ پہنی ہوئی تھی آپؐ خیمہ سے باہر نکل آئے اور فرمایا کہ ابھی ان لشکروں کو شکست ہو جائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے بلکہ یہ وقت ان کے انجام کا وقت ہے اور یہ وقت ان لوگوں کے لئے نہایت سخت اور کڑوا ہے۔ اللہ اللہ! خوف خدا کا ایسا تھا کہ باوجود وعدوں کے اس کے غناء کا خیال تھا لیکن یقین بھی ایسا تھا کہ جب حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی تو باآواز بلند سنا دیا کہ میں ڈرتا نہیں بلکہ خدا کی طرف سے مجھے علم ہو چکا ہے کہ دشمن شکست کھا کر ذلیل و خوار ہو گا اور آئمۃ الکفر

یہیں مارے جائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جس جگہ پر عذاب آچکا ہو وہاں آپؐ نہ ٹھہرتے۔ رسول کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے اس قدر خائف تھے اور اس کا تقویٰ آپؐ کے دل میں ایسا مستولی تھا کہ نہ صرف آپؐ ایسے افعال سے محفوظ تھے کہ جن سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خوف ہو اور نہ صرف لوگوں کو ایسے افعال میں مبتلا ہونے سے روکتے تھے بلکہ آپؐ ان مقامات میں ٹھہرنا برداشت نہ کرتے تھے جس جگہ کسی قوم پر عذاب آچکا ہو۔ اور ان واقعات کو یاد کر کے ان افعال کو آنکھوں کے سامنے لاکر جن کی وجہ سے وہ عذاب نازل ہوئے آپؐ اس قدر غضب الٰہی سے خوف کرتے کہ اس جگہ کا پانی تک استعمال کرنا آپؐ مکروہ جانتے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں لَمَّا نَزَلَ الْحِجْرَ فِیْ غَزْوَۃِ تَبُوْکَ اَمَرَھُمْ اَنْ لَّا یَشْرَبُوْا مِنْ بِئْرِھَا وَلَا یَسْتَقُوْا مِنْھَا فَقَالُوْا قَدْ عَجَنَّا مِنْھَا وَاسْتَقَیْنَا فَاَمَرَھُمْ اَنْ یَّطْرَحُوْا ذٰلِکَ الْعَجِیْنَ وَیُھْرِیْقُوْا ذٰلِکَ الْمَآءَ (بخاری کتاب بدء الخلق باب قول اللہ تعالی عز و جل و الی ثمود اخاھم صالحا) جب آنحضرت ﷺ غزوہ تبوک کے موقع پر مقام حجر پر اترے آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ اس کنوئیں سے پانی نہ پئیں اور نہ پانی بھریں یہ حکم سن کر صحابہؓ نے جواب دیا کہ ہم نے اس پانی سے آٹا گوندلیا ہے اور پانی بھر لیا ہے آپؐ نے حکم دیا کہ اس آٹے کو پھینک دو اور اس پانی کو بہادو۔ اس خوف الٰہی کو دیکھو اور دنیا کے سب راستبازوں کی زندگیوں کا اس پاک نبیؐ کی زندگی سے مقابلہ کرو کہ اس میں خوف الٰہی کس قدر زیادہ تھا۔

آپ ﷺ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرتے

پہلے میں ذکر کر چکا ہوں کہ آنحضرت ﷺ اپنی نسبت فرماتے تھے کہ وَمَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ آپؐ کبھی اس بات کا دعویٰ نہ کرتے کہ اپنے اعمال کے زور سے جنت کے وارث بن جائیں گے بلکہ ہمیشہ یہی تعلیم دیتے کہ خدا کے فضل سے جو کچھ ملے گا ملے گا اور اپنی نسبت بھی یہی فرماتے کہ میری نجات بھی خدا کے ہی فضل سے ہوگی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَنْ یُّدْخِلَ اَحَدًا عَمَلُہُ الْجَنَّۃَ قَالُوْا وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِفَضْلِہٖ وَرَحْمَتِہٖ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَلَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ اِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّہٗ اَنْ یَّزْدَادَ خَیْرًا وَّاِمَّا مُسِیْئًا فَلَعَلَّہٗ اَنْ یَّسْتَعْتِبَ (بخاری کتاب المرضی باب نھی تمنی المریض الموت) فرماتے ہیں میں نے رسول کریم ﷺ کو ایک دفعہ یہ

فرماتے ہوئے سنا کہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں داخل کرے گا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا آپؐ بھی اپنے اعمال کے زور سے جنت میں داخل نہ ہوں گے آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ میں بھی اپنے اعمال کے زور سے جنت میں داخل نہ ہوں گا بلکہ خدا کا فضل اور اس کی رحمت مجھے ڈھانپ لیں گے تو میں جنت میں داخل ہوں گا اس لئے تم نیکی کرو اور سچائی سے کام لو اور خدا کی نزدیکی کو تلاش کرو اور تم میں سے کوئی موت کی آرزو نہ کرے کیونکہ اگر وہ نیک ہے تو شاید وہ نیکی میں اور ترقی کرے اور اگر بد ہے تو شاید اس کی توبہ قبول ہو جائے اور اسے خدا کی رضاء کے حاصل کرنے کا موقع مل جائے۔

اس حدیث سے رسول کریم ﷺ کی خشیت کا پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے خدا تعالیٰ کی قدرت، بڑائی اور جلال کا کیسا صحیح اندازہ لگایا تھا اور کس طرح آپؐ کے دل پر حقیقت منکشف تھی کہ آپؐ ان اعمال کے ہوتے ہوئے بھی اس بادشاہ کی غناء سے ایسے خائف تھے کہ فرماتے کہ خدا کا فضل ہی ہو تو نجات ہو ورنہ اس کے فضل کے بغیر نجات کیونکر ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اسلام نجات کو اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ خدا کے فضل کا نتیجہ قرار دیتا ہے ہاں اعمال صالحہ خدا کے فضل کے جاذب ہوتے ہیں اس لئے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ نجات خدا کے فضل سے ہے اس لئے تم نیکی اور تقویٰ سے کام لو معلوم ہؤا کہ نیکی اور اعمال صالحہ فضل کے جاذب ہیں چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی اور تشریح ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ ہی اس حدیث کے بھی راوی ہیں اور اس میں انہوں نے پہلی حدیث سے اتنا زیادہ بیان فرمایا ہے وَاغْدُوْا وَرُوْحُوْا وَشَيْءٌ مِّنَ الدُّلْجَةِ وَالْقَصْدَ الْقَصْدَ تَبْلُغُوْا (بخاری کتاب الرقاق باب القصد والمداومة علی العمل) یعنی خدا کے فضل کے سوا نجات نہیں اسی لئے صبح کے وقت عبادت کرو اور شام کے وقت بھی اور کچھ رات کے وقت بھی اور خوب قصد کرو۔ پوری طرح سے قصد کرو۔ جنت میں پہنچ جاؤ گے اس حدیث سے صاف کھل جاتا ہے کہ اپنے اعمال کو فضل کا جاذب قرار دیا ہے۔

استغفار کی کثرت

لوگ گناہ کرتے ہیں اور پھر جرأت کرتے ہیں اور خدا کا خوف ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا اور ایسے سنگدل ہو جاتے ہیں کہ کبھی ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے مورد نہ بن جائیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے میں نے ایک شخص سے ذکر کیا کہ تم توبہ واستغفار کیا کرو اور نیکی میں ترقی کرو اس نے مجھے جواب دے دیا کہ

کیا آپ مجھے گندہ جانتے ہیں کیا میں گناہ گار ہوں کہ آپ مجھے نیکی اور تقویٰ اور استغفار کے لئے کہتے ہیں؟ میں یہ بات سنکر حیران ہی ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں سے اتنا ناواقف ہے اور اس کے جلال سے اتنا بے خبر ہے کہ اسے اتنی بھی نہیں سمجھ کہ اس بادشاہ سے انسان کو کیسا خائف رہنا چاہیئے دنیاوی بادشاہوں کے مقربین کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی خدمت و خوشامد کے باوجود بھی ان سے یہی عرض کرتے رہتے ہیں کہ اگر کچھ قصور ہو گیا ہو تو عفو فرمائیں۔ بے شک بہت سے لوگ حتی المقدور نیکی کا خیال رکھتے ہیں مگر پھر بھی انسان سے خطا کا ہو جانا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ رسول کریمؐ کو دیکھو کیسی معرفت تھی' کیسی احتیاط تھی' کس طرح خدا تعالیٰ سے خائف رہتے تھے اور باوجود اس کے کہ تمام انسانوں سے زیادہ آپؐ کامل تھے اور ہر قسم کے گناہوں سے آپؐ پاک تھے۔ خود اللہ تعالیٰ آپؐ کا محافظ و نگہبان تھا مگر باوجود اس تقدیس اور پاکیزگی کے یہ حال تھا کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے خائف رہتے نیکی پر نیکی کرتے' اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال بجالاتے' ہر وقت عبادتِ الٰہیہ میں مشغول رہتے مگر باوجود اس کے ڈرتے اور بہت ڈرتے۔ اپنی طرف سے جس قدر ممکن ہے احتیاط کرتے مگر خدا تعالیٰ کے غناء کی طرف نظر فرماتے اور اس کے جلال کو دیکھتے تو اس بارگاہ صمدیت میں اپنے سب اعمال سے دستبردار ہو جاتے اور استغفار کرتے اور جب موقع ہوتا توبہ کرتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَ سْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً (بخاری کتاب الدعوات باب استغفار النبی صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے آنحضرت ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ خدا کی قسم میں دن میں ستر دفعہ سے زیادہ خدا تعالیٰ کے حضور میں اپنی کمزوریوں سے عفو کی درخواست کرتا ہوں اور اس کی طرف جھک جاتا ہوں۔

رسول کریمؐ اللہ تعالیٰ کے فضل سے گناہوں سے پاک تھے نہ صرف اس لئے کہ انبیاء کی جماعت مَعْصُوْم عَنِ الْاِثْمِ وَالْجُرْمِ ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ انبیاء میں سے بھی آپ سب کے سردار اور سب سے افضل تھے آپؐ کا اس طرح استغفار اور توبہ کرنا بتاتا ہے کہ خشیت الٰہی آپؐ پر اس قدر غالب تھی کہ آپ اس کے جلال کو دیکھ کر بے اختیار اس کے حضور میں گر جاتے کہ انسان سے کمزوری ہو جانی ممکن ہے تو مجھ پر اپنا فضل ہی کر۔ وہاں تو یہ خشیت تھی اور یہاں یہ حال ہے کہ ہم لوگ ہزاروں قسم کے گناہ کر کے بھی استغفار و توبہ میں کوتاہی کرتے ہیں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔

موت کا خیال

آنحضرتؐ موت سے کسی وقت غافل نہ رہتے اور خشیت الٰہی آپؐ پر اس قدر غالب تھی کہ ہر روز یہ یقین کر کے سوتے کہ شاید آج ہی موت آجاوے اور آج ہی اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑے اور اس لئے آپؐ ایک ایسے مسافر کی طرح رہتے تھے جسے خیال ہوتا ہے کہ ریل اب چلی کہ چلی وہ کبھی اپنے آپ کو ایسے کام میں نہیں پھنساتا کہ جسے چھوڑنا مشکل ہو۔ آپؐ بھی ہر وقت اپنے محبوب کے پاس جانے کیلئے تیار رہتے اور جو دم گزرتا اسے اس کے فضل کا نتیجہ سمجھتے اور موت کو یاد رکھتے۔ حذیفہ بن الیمانؓ فرماتے ہیں کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَہٗ مِنَ اللَّیْلِ وَضَعَ یَدَہٗ تَحْتَ خَدِّہٖ ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَاَحْیَا وَاِذَا قَامَ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ (بخاری کتاب الدعوات باب وضع الید تحت الخد الیمن) رسول کریمؐ کی عادت تھی کہ جب آپؐ اپنے بستر پر لیٹتے اپنے رخسار کے نیچے اپنا ہاتھ رکھتے اور فرماتے اے میرے مولا میرا مرنا اور جینا تیرے ہی نام پر ہو اور جب سو کر اٹھتے تو فرماتے شکر ہے میرے رب کا جس نے ہمیں زندہ کیا مارنے کے بعد۔ اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ ہر رات جب بستر پر جاتے تو اپنی طرف سے حساب ختم کر جاتے اور خدا تعالیٰ سے دعا مانگتے کہ اگر میں فوت ہو جاؤں تو تب بھی تیرے ہی نام پر میری زندگی ہو اور جب اٹھتے تو خدا تعالیٰ کے احسان پر حمد کرتے کہ میں تو اپنی طرف سے دنیا سے علیحدہ ہو چکا تھا تیرا ہی فضل ہوا کہ تو نے پھر مجھے زندہ کیا اور میری عمر میں برکت دی۔

ایک اور مثال

جس طرح مذکورہ بالا دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ ہر وقت موت کو یاد رکھتے تھے اسی طرح مذکورہ ذیل دعا بھی اس بات پر شاہد ہے کہ آپ اپنی زندگی کی ہر گھڑی کو آخری گھڑی جانتے تھے اور جب آپؐ سونے لگتے تو اپنے رب سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کر لیتے اور گویا ہر ایک تغیر کیلئے تیار ہو جاتے۔ چنانچہ براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَوٰی اِلٰی فِرَاشِہٖ نَامَ عَلٰی شِقِّہِ الْاَیْمَنِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ وَ وَجَّھْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ وَاَلْجَاْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَغْبَۃً وَرَھْبَۃً اِلَیْکَ لَا مَلْجَاَ وَلَا مَنْجَامِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ (بخاری کتاب الدعوات باب النوم علی الشق الایمن) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے بستر پر جا کر لیٹتے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹتے پھر فرماتے اے میرے رب میں اپنی جان تیرے سپرد کرتا ہوں اپنی سب توجہ تیری ہی طرف پھیرتا ہوں۔ میں اپنا معاملہ تیرے ہاتھوں میں دیتا ہوں۔

اور اپنے آپ کو تیری پناہ میں دیتا ہوں۔ تجھ سے نفع کا امیدوار ہوں۔ تیری بڑائی اور استغنا سے خائف بھی ہوں تیرے غضب سے بچنے کے لئے کوئی پناہ کی جگہ نہیں اور نہ کوئی نجات کا مقام ہے مگر یہی کہ تجھ ہی سے نجات و پناہ طلب کی جائے میں اس کتاب پر جو تو نے نازل کی ہے اور اس رسولؐ پر جو تو نے بھیجا ہے ایمان لاتا ہوں۔

لوگ اپنی دوکان کو بند کرتے وقت اس کا حساب کر لیتے ہیں مگر خدا سے جو حساب ہے اسے صاف نہیں کرتے۔ مگر کیسا برگزیدہ وہ انسان تھا جو صبح سے شام تک خدا کے فرائض کے ادا کرنے میں لگا رہتا اور خود ہی انہیں ادا نہ کرتا بلکہ ہزاروں کی نگرانی بھی ساتھ ہی کرتا تھا کہ وہ بھی اپنے فرائض کو ادا کرتے ہیں یا نہیں مگر رات کو سونے سے پہلے اپنی تمام کوششوں اور عبادتوں سے آنکھ بند کر کے عاجزانہ اپنے مولیٰ کے حضور میں اس طرح حساب صاف کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا کہ گویا اس نے کوئی خدمت کی ہی نہیں اور اس وقت تک نہ سوتا جب تک اپنی جان کو پورے طور سے خدا کے سپرد کر کے دنیا و مافیہا سے براءت نہ ظاہر کر لیتا اور خدا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہ دے لیتا۔

لطیفہ اس دعا سے ایک عجیب نکتہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ رسول کریمؐ کو اپنی نبوت پر اس قدر یقین کامل تھا کہ آپؐ عین تنہائی میں ہر روز سوتے وقت خدا کے سامنے اقرار فرماتے کہ مجھے اپنی نبوت پر ایمان ہے اور اسی طرح قرآن شریف پر بھی ایمان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اپنی تعلیم کو لوگوں کے لئے ہی قابل عمل نہیں جانتے تھے بلکہ سب سے پہلے اپنے نفس کو کہتے تھے کہ یہ حکم خدا کا آیا ہے اور اس کا رسول یوں کہتا ہے کہ اس پر ایمان لا۔ اس لئے تو آپؐ فرماتے ہیں کہ اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَ نَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ۔

آپؐ ابتلاؤں اور عذابوں سے پناہ مانگتے رہتے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو فتنوں میں ڈالتے ہیں اور اس طرح اپنے نفس کا امتحان کرتے ہیں مگر یہ لوگ بعض دفعہ ان فتنوں میں ایسے گرتے ہیں کہ پھر سنبھلنے کی طاقت نہیں رہتی اور بجائے ترقی کرنے کے ان کا قدم نیچے ہی نیچے چلا جاتا ہے کچھ آدمی ایسے ہوتے ہیں جو خود بڑے بڑے کام طلب کرتے ہیں کہ ہمیں اگر ایسی مصیبت کا موقع ملے تو ہم یوں کریں اور یوں کریں اور اس طرح دین کی خدمت کریں لیکن رسول کریمؐ کی نسبت اس کے خلاف ہے۔ آپؐ کبھی پسند نہ فرماتے تھے کہ کوئی انسان خدا تعالیٰ سے ابتلاؤں کی خواہش کرے کیونکہ کوئی کیا جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ خدا کی غیرت اسے تباہ کر دے۔

ممکن ہے کہ اس کے اپنے اعمال کی کمزوری اس کے آگے آجائے۔ ممکن ہے کہ شیطان اس کے دل پر تسلط پاکر اسے خراب کردے اور یہ گمراہ ہو جائے چنانچہ آپؐ خود بھی بجائے ابتلاؤں کی آرزو کرنے کے ان سے بچنے کی دعا کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ (بخاری کتاب الدعوات باب التعوذ من جهد البلاء) رسول کریمؐ ہمیشہ خدا سے پناہ مانگتے تھے کہ مجھ پر کوئی ایسی مصیبت نہ آئے جو میری طاقت سے بڑھ کر ہو کوئی ایسا کام نہ پیش آجائے کہ جس کا نتیجہ ہلاکت ہو۔ اور کوئی خدا کا فیصلہ ایسا نہ ہو کہ جس کو میں ناپسند کروں اور کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو کہ جس سے میرے دشمنوں کو خوشی کا موقع ملے۔ اس دعا سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپؐ کے دل میں کیسی خشیت الٰہی تھی اور آپؐ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں کیسا کمزور جانتے اور کبھی اپنی بڑائی کے لئے اور اپنے ایمان کے اظہار کے لئے کسی بڑے کام یا ابتلاء کی آرزو نہ فرماتے اور یہی حقیقی ایمان ہے جس کی اقتداء کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب:۲۲)

رسول کریم ﷺ کی ایک اور دعا بھی ہے جو آپؐ ہمیشہ خدا تعالیٰ سے طلب فرماتے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے دل میں کس قدر خوف الٰہی تھا ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں آپؐ ہمیشہ دعا فرماتے تھے کہ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ خَطِيْئَتِیْ وَجَهْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ هَزْلِیْ وَجِدِّیْ وَخَطَايَایَ وَعَمْدِیْ وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ (بخاری کتاب الدعوات باب قول النبی صلی الله علیه وسلم اللهم اغفر لی ما قدمت و اخرت) اے اللہ میرے اعمال کے نتائج بد سے مجھے محفوظ رکھ اور میری خطاؤں کے نتائج سے بھی۔ میں اگر اپنی ناواقفیت کی وجہ سے کوئی کام جو کرنا ہو نہ کروں یا کوئی کام جس حد تک مناسب تھا اس سے زیادہ کر بیٹھوں اور جسے تو میری نسبت زیادہ جانتا ہے تو اس کے نتائج سے بھی مجھے محفوظ رکھ۔ اے اللہ اگر کوئی بات میں بے دھیان کہہ بیٹھوں یا متانت سے کہوں، غلطی سے کہوں یا جان کر کہوں اور یہ سب کچھ مجھ میں ممکن ہے۔ پس تو ان میں سے اگر کسی فعل کا نتیجہ بد نکلتا ہو تو اس سے مجھے محفوظ رکھیو۔

حضرت عائشہؓ رسول کریمؐ کی ایک اور دعا بھی بیان فرماتی ہیں اور وہ بھی اس بات پر شاہد ہے کہ جو ایمان و خشیت رسول کریم ﷺ میں تھی اس کی نظیر کسی اور انسان میں نہیں مل سکتی۔ انسان دعا اس سے مانگتا ہے جس پر یقین ہو کہ یہ کچھ کر سکتا ہے۔ ایک موحّد جو بتوں کی بیکسی سے

واقف ہے کبھی کسی بت کے آگے جاکر ہاتھ نہیں پھیلائے گا کیونکہ اسے یقین ہے کہ یہ بت کچھ نہیں کر سکتے لیکن ایک بت پرست ان کے آگے بھی ہاتھ جوڑ کر اپنا حال دل کہہ سناتا ہے کیونکہ اسے ایمان ہے کہ یہ بت بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا ایک ذریعہ ہیں- فقیر بھی اس بات کو دیکھ لیتے ہیں کہ فلاں شخص دے گا یا نہیں اور جس پر انہیں یقین ہو کہ کچھ دے گا اس سے جاکر طلب کرتے ہیں- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اس سے کچھ مانگتا ہے جس پر اسے ایمان ہو کہ اس سے ملے گا- رسول کریمؐ کا ہر وقت خدا سے امداد طلب کرنا‘ نصرت کی درخواست کرنا اور اٹھتے بیٹھتے اسی کے کواڑ کھٹکھٹانا‘ اسی سے حاجت روائی چاہنا کیا اس بے مثل یقین اور ایمان کو ظاہر نہیں کرتا جو آپؐ کو خدا پر تھا- اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ کا دل یاد الٰہی اور خشیت ایزدی سے ایسا معمور و آباد تھا کہ توجہ الی الخلق کا اس میں کوئی خانہ خالی ہی نہ تھا- اگر یہ بات کسی اور انسان میں بھی پائی جاتی تھی اور اگر کوئی اور شخص بھی آپؐ کے برابر یا آپ کے قریب بھی ایمان رکھتا تھا اور خدا کا خوف اس کے دل پر مستولی تھا تو اسکے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں بھی خشیت الٰہی کے یہ آثار پائے جانے ضروری ہیں مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ زمین کے ہر گوشہ میں چراغ لے کر گھوم جاؤ‘ تاریخوں کی ورق گردانی کرو‘ مختلف مذاہب کے مقتداؤں کے جیون چرتر‘ سوانح عمریاں اور بایو گرافیاں پڑھ جاؤ مگر ایسا کامل نمونہ کسی انسان میں نہ پاؤ گے- اور وہ خوف خدا جو رسول کریم ﷺ کے ہر ایک قول سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ حزم و احتیاط جو آپؐ کے ہر ایک فعل سے ٹپکتی ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پایا جانا محال ہے- وہ دعا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہ ہے- اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکَسَلِ وَالْھَرَمِ وَالْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ وَمِنْ فِتْنَۃِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَۃِ النَّارِ وَعَذَابِ النَّارِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَۃِ الْغِنٰی وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْفَقْرِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ عَنِّیْ خَطَایَایَ بِمَآءِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا نَقَّیْتَ الثَّوْبَ الْاَبْیَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (بخاری کتاب الدعوات باب التعوذ من المأثم المغرم) اے میرے رب میں تجھ سے سستی اور شدید بڑھاپے اور گناہوں اور قرضہ اور قبر کے فتنہ اور قبر کے عذاب اور دوزخ کے فتنہ اور اس کے عذاب اور دولت کے فتنہ کے نقصانوں سے پناہ مانگتا ہوں اور اسی طرح میں غربت کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں اور مسیح الدجال کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں اے میرے اللہ میری خطاؤں کو مجھ سے برف اور اولوں کے پانی کے ساتھ

دھودے اور میرے دل کو ایسا صاف کردے کہ جیسے تو نے سفید کپڑے کو میل سے صاف کر دیا ہے اور مجھ میں اور گناہوں میں اتنا فاصلہ حائل کردے جتنا تو نے مشرق و مغرب میں رکھا ہے۔

اے وہ انسان جسے رسول کریم ﷺ سے عداوت ہے تو بھی ذرا اس دعا کو غور سے پڑھا کر اور دیکھ کہ وہ گناہوں سے کس قدر متنفر تھے۔ وہ بدیوں سے کس قدر بیزار تھے۔ وہ کمزوریوں سے کس طرح بری تھے۔ وہ عیبوں سے کس قدر پاک تھے اور ان کا دل خشیت الٰہی سے کیسا پر تھا فَتَدَبَّرُوْا وَاهْتَدِ بِهُدَاهُ۔

غیرتِ دینی

اس بات کے بتانے کے بعد کہ رسول کریم ﷺ کی زندگی اور آپ کا ہر فعل خشیت الٰہی کی ایک زندہ مثال ہے میں آپؐ کی غیرت دینی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

بہت سے لوگ اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق کے نمونہ دکھاتے ہیں مگر یہ اخلاق اسی وقت تک ظاہر ہوتے ہیں جب تک انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ذرا ان کے منشاء کے خلاف کوئی بات ہو اور ان کی آنکھیں لال پیلی ہو جاتی ہیں اور منہ سے جھاگ آنی شروع ہو جاتی ہے۔ اور اگر اشارۃً بھی کوئی انہیں ایسی بات کہہ بیٹھے جس میں وہ اپنی ہتک سمجھتے ہوں تو وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے بلکہ ہر ممکن سے ممکن طریق سے اس کا بدلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک مدمقابل سے بدلہ نہ لے لیں انہیں چین نہیں آتا۔

مگر انہیں لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ جب خدا اور رسول کی کوئی ہتک کرتا ہے تو اسے بڑی خوشی سے سنتے ہیں اور ان کو وہ قطعاً بری نہیں معلوم ہوتی اور ایسی مجلسوں میں اٹھنا بیٹھنا ناپسند نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی وقت ان سے بھی کوئی غلطی ہو جاتی ہے اور اس طرح ان کا دین برباد ہو جاتا ہے۔

جتنے اخلاق اخلاق اور تہذیب تہذیب پکارنے والے لوگ ہیں ان کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے دیکھ لو ضرور ان میں یہ بات پائی جائے گی کہ دوسروں کے معاملہ میں اور خصوصاً دین کے معاملہ میں غیرت کے اظہار کو وہ بد خلقی اور بد تہذیبی قرار دیتے ہیں مگر اپنے معاملہ میں ان کا معیارِ اخلاق ہی اور ہے اور وہاں اعلیٰ اخلاق سے کام لینا ان کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔

مؤمن انسان کا کام اس کے بالکل برخلاف ہونا چاہیے اور اسے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ اپنے معاملات میں دکھانا چاہیئے اور حتّی الوسع کوشش کرنی چاہیئے کہ بہت سے موقعوں پر چشم پوشی سے ہی کام لے اور جب تک عفو سے کام نکل سکتا ہو اور اس کا خراب نتیجہ نہ نکلتا ہو اسے ترک نہ کرے لیکن دین کے معاملہ میں قطعاً بے غیرتی کا اظہار نہ کرے اور ایسے تمام مواقع جن میں دین کی ہتک ہوتی ہو ان سے الگ رہے اور ایسی تمام مجلسوں اور صحبتوں سے پرہیز کرے کہ جن میں دین کی ہتک اور اس سے ٹھٹھا ہوتا ہو اور دین پر جس قدر اعتراض ہوں ان کو دور کرنے کی کوشش کرے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو معلوم ہو گا کہ وہ خدا تعالیٰ کی قدوسیت قائم کرنے کی نسبت اپنے نفس پر اعتراضات دور کرنے کے لئے زیادہ کوشاں رہتا ہے اور جتنا اسے اپنی صفائی کا خیال ہے اتنا خدا تعالیٰ اور دینِ حق کی تنزیہہ کا خیال نہیں۔

رسول کریم ﷺ کی زندگی اس معاملہ میں بھی عام انسانوں سے بالکل مختلف ہے اور آپؐ بجائے اپنے نفسانی معاملات اور ذاتی تکالیف پر اظہار غضب و غصہ کے نہایت ملائمت اور نرمی سے کام لیتے اور اگر کوئی اعتراض کرتا تو اس پر خاموش رہتے اور جب تک خاموشی سے نقصان نہ پہنچتا ہو کبھی ذبّ اعتراضات کی طرف توجہ نہ کرتے مگر خدا تعالیٰ کے معاملہ میں آپؐ بڑے باغیرت تھے اور یہ کبھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ہتک کرے اور جب کوئی ایسا موقع پیش آتا آپ فوراً اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کرتے یا اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کے احکام سے لاپرواہی کرتا تو اسے سخت تنبیہہ کرتے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ جَعَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الرِّجَالَۃِ یَوْمَ اُحُدٍ وَکَانُوْا خَمْسِیْنَ رَجُلاً عَبْدَاللّٰہِ بْنَ جُبَیْرٍ فَقَالَ اِنْ رَاَیْتُمُوْنَا تَخْطَفُنَا الطَّیْرُ فَلَا تَبْرَحُوْا مَکَانَکُمْ ھٰذَا حَتّٰی اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ وَاِنْ رَاَیْتُمُوْنَا ھَزَمْنَا الْقَوْمَ وَاَوْطَأْنَاھُمْ فَلَا تَبْرَحُوْا حَتّٰی اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ فَھَزَمُوْھُمْ قَالَ وَاَنَا وَاللّٰہِ رَاَیْتُ النِّسَآءَ یَشْتَدِدْنَ قَدْبَدَتْ خَلَاخِلُھُنَّ وَاَسْوُقُھُنَّ رَافِعَاتٍ ثِیَابُھُنَّ فَقَالَ اَصْحَابُ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ جُبَیْرٍ اَلْغَنِیْمَۃَ اَیْ قَوْمِ الْغَنِیْمَۃَ ظَھَرَ اَصْحَابُکُمْ فَمَا تَنْتَظِرُوْنَ فَقَالَ عَبْدُاللّٰہِ بْنُ جُبَیْرٍ اَنَسِیْتُمْ مَا قَالَ لَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالُوْا وَاللّٰہِ لَنَاْتِیَنَّ النَّاسَ فَلَنُصِیْبَنَّ مِنَ الْغَنِیْمَۃِ فَلَمَّا اَتَوْھُمْ صُرِفَتْ وُجُوْھُھُمْ فَاَقْبَلُوْا مُنْھَزِمِیْنَ فَذٰلِکَ اِذْ یَدْعُوْھُمُ الرَّسُوْلُ فِیْ اُخْرَاھُمْ فَلَمْ یَبْقَ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَیْرُ

اِثْنَیْ عَشَرَ رَجُلاً فَاَصَابُوْا مِنَّا سَبْعِیْنَ وَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُہٗ اَصَابَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ یَوْمَ بَدْرٍ اَرْبَعِیْنَ وَمِائَۃً سَبْعِیْنَ اَسِیْرًا وَ سَبْعِیْنَ قَتِیْلاً فَقَالَ اَبُوْ سُفْیَانَ اَفِی الْقَوْمِ مُحَمَّدٌ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ فَنَھَاھُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّجِیْبُوْہُ ثُمَّ قَالَ اَفِی الْقَوْمِ اِبْنُ اَبِیْ قُحَافَۃَ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ اَفِی الْقَوْمِ اِبْنُ الْخَطَّابِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰی اَصْحَابِہٖ فَقَالَ اَمَّا ھٰؤُلَآءِ فَقَدْ قُتِلُوْا فَمَا مَلَکَ عُمَرُ نَفْسَہٗ فَقَالَ کَذَبْتَ وَاللّٰہِ یَا عَدُوَّ اللّٰہِ اِنَّ الَّذِیْنَ عَدَدْتَ لَاَحْیَآءٌ کُلُّھُمْ وَقَدْ بَقِیَ لَکَ مَا یَسُوْءُکَ قَالَ یَوْمٌ بِیَوْمِ بَدْرٍ وَالْحَرْبُ سِجَالٌ اِنَّکُمْ سَتَجِدُوْنَ فِی الْقَوْمِ مُثْلَۃً لَمْ اٰمُرْ بِھَا وَلَمْ تَسُؤْنِیْ ثُمَّ اَخَذَ یَرْتَجِزُ اُعْلُ ھُبَلْ اُعْلُ ھُبَلْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا تُجِیْبُوْا لَہٗ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا نَقُوْلُ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ قَالَ اِنَّ لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا تُجِیْبُوْا لَہٗ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا نَقُوْلُ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ (بخاری کتاب الجهاد باب ما یکره من التنازع والاختلاف فی الحرب) یعنی رسول کریم ﷺ نے پیادہ فوج کے پچاس آدمیوں پر احد کے دن عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر تم یہ بھی دیکھ لو کہ ہمیں جانور اچک رہے ہیں تب بھی اپنی اس جگہ سے نہ ہلنا جب تک تم کو میں کہلا نہ بھیجوں۔ اور اگر تم یہ معلوم کر لو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور ان کو مسل دیا ہے تب بھی اس وقت تک کہ تمہیں کہلا نہ بھیجا جائے اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔ اس کے بعد جنگ ہوئی اور مسلمانوں نے کفار کو شکست دے دی۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں خدا کی قسم میں دیکھ رہا تھا کہ عورتیں کپڑے اٹھا اٹھا کر بھاگ رہی تھیں اور ان کی پنڈلیاں ننگی ہو رہی تھیں اس بات کو دیکھ کر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے کہا کہ اے قوم غنیمت کا وقت ہے غنیمت کا وقت ہے تمہارے ساتھی غالب آ گئے پھر تم کیا انتظار کر رہے ہو اس پر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا کہ کیا تم رسول کریم ﷺ کا حکم بھول گئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم بھی ساری فوج سے مل کر غنیمت حاصل کریں گے۔ جب لشکر سے آکر مل گئے تو ان کے منہ پھیرے گئے اور شکست کھا کر بھاگے اسی کے بارہ میں قرآن شریف کی یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ یاد کرو جب رسول تم کو پیچھے کی طرف بلا رہا تھا اور رسول کریم ﷺ کے ساتھ سوائے بارہ آدمیوں کے اور کوئی نہ رہا اس وقت کفار نے ہمارے ستر آدمیوں کا نقصان کیا اور رسول کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ نے جنگ بدر میں کفار کے ایک سو چالیس آدمیوں کا نقصان کیا تھا۔ ستّر قتل ہوئے تھے اور ستر قید کئے گئے

تھے۔ غرضیکہ جب لشکر پراگندہ ہو گیا اور رسول کریمؐ کے گرد صرف ایک قلیل جماعت ہی رہ گئی تو ابو سفیان نے پکار کر کہا کہ کیا تم میں محمد (ﷺ) ہے اور اس بات کو تین بار دہرایا لیکن رسول کریمؐ نے لوگوں کو منع کر دیا کہ وہ جواب نہ دیں۔ اس کے بعد ابو سفیان نے تین دفعہ بآواز بلند کہا کہ کیا تم میں ابن ابی قحافہ (حضرت ابو بکرؓ) ہے۔ اس کا جواب بھی نہ دیا گیا تو اس نے پھر تین دفعہ پکار کر کہا کہ کیا تم میں ابن الخطاب (حضرت عمرؓ) ہے۔ پھر بھی جب جواب نہ ملا تو اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یہ لوگ مارے گئے ہیں۔ اس بات کو سن کر حضرت عمرؓ برداشت نہ کر سکے اور فرمایا کہ اے خدا کے دشمن تو نے جھوٹ کہا ہے جن کا تو نے نام لیا ہے وہ سب کے سب زندہ ہیں اور وہ چیز جسے تو ناپسند کرتا ہے ابھی باقی ہے۔ اس جواب کو سنکر ابو سفیان نے کہا کہ آج کا دن بدر کا بدلہ ہو گیا۔ اور لڑائیوں کا حال ڈول کا سا ہوتا ہے تم اپنے مقتولوں میں بعض ایسے پاؤ گے کہ جن کے ناک کان کٹے ہوئے ہوں گے۔ میں نے اس بات کا حکم نہیں دیا تھا لیکن میں اس بات کو ناپسند بھی نہیں کرتا۔ پھر فخریہ کلمات بآواز بلند کہنے لگا اُعْلُ ھُبَلْ اُعْلُ ھُبَلْ یعنی اے ہبل (بت) تیرا درجہ بلند ہو اے ہبل تیرا درجہ بلند ہو۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو جواب کیوں نہیں دیتے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ ہم کیا کہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہو "کہ خدا تعالیٰ ہی سب سے بلند رتبہ اور سب سے زیادہ شان والا ہے"۔ ابو سفیان نے یہ بات سنکر کہا "ہمارا تو ایک بت عُزّیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزّیٰ نہیں"۔ جب صحابہؓ خاموش رہے تو رسول کریمؐ نے فرمایا کہ کیا تم جواب نہیں دیتے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم کیا کہیں۔ آپؐ نے فرمایا انہیں کہو کہ "خدا ہمارا دوست و کارساز ہے اور تمہارا کوئی دوست نہیں"۔

اس واقعہ سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ خدا تعالیٰ کے معاملہ میں کیسے باغیرت تھے۔ ابو سفیان اپنی جھوٹی فتح کے نشہ میں مخمور ہو کر زور سے پکارتا ہے کہ کیا آپ زندہ ہیں لیکن آپؐ اپنی جماعت کو منع فرماتے ہیں کہ تم ان باتوں کا جواب ہی نہ دو اور خاموش رہو۔ ایک عام آدمی جو اپنے نفس پر ایسا قابو نہ رکھتا ہو ایسے موقع پر بولنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتا اور لاکھ میں سے ایک آدمی بھی شاید مشکل سے ملے جو اپنے دشمن کی جھوٹی خوشی پر اس کی خوشی کو غارت کرنا پسند نہ کرے۔ لیکن چونکہ ابو سفیان اس دعویٰ سے رسول کریمؐ کی ذات کی ہتک کرنا چاہتا تھا اور یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں نے ان کو قتل کر دیا ہے اسلئے رسول کریمؐ نے نہ صرف خود جواب نہ دیا بلکہ صحابہؓ کو بھی منع کر دیا۔

مگر جونہی کہ ابو سفیان نے خدا تعالیٰ کی ذات پر حملہ کیا اور سرمیدان شرک کا اعلان کیا اور بجائے خدا تعالیٰ کی عظمت بیان کرنے کے ہبل بت کی توصیف کی تو آپؐ برداشت نہ کرسکے اور صحابہؓ کو حکم دیا کہ اسے جواب دو کہ خدا کے سوا اور کوئی نہیں جو عظمت و جلال کا مالک ہو۔ پھر جب اس نے یہ ظاہر کیا کہ عزیٰ ہمارا مددگار ہے آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ اسے کہہ دو کہ ہمارا خدا مددگار ہے اور ہم کسی اور کی مدد نہیں چاہتے اور یہ بات بھی خوب یاد رکھو کہ خدا ہماری مدد کرے گا اور تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

اللہ اللہ اپنے نفس کے متعلق کیا صبر ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے دین کی کیسی غیرت ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ

رسول کریم ﷺ کی غیرت دینی کے ظاہر کرنے کے لئے اگرچہ پچھلی مثال بالکل کافی تھی لیکن میں اس جگہ ایک اور واقعہ بھی لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں جس سے خوب روشن ہو جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نہ صرف دشمنوں کے مقابلہ میں غیرت دینی کا اظہار فرماتے تھے بلکہ دوستوں سے بھی اگر کوئی حرکت ایسی ہوتی جس سے احکام الٰہیہ کی ہتک ہوتی ہو تو آپؐ اس پر اظہار غیرت سے باز نہ رہتے اور اس خیال سے خاموش نہ رہتے کہ یہ ہمارے دوستوں کی غلطی ہے اسے نظرانداز کر دیا جائے۔

حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

لَمْ اَتَخَلَّفْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ غَزْوَۃٍ غَزَاھَا اِلَّا فِیْ غَزْوَۃِ تَبُوْکَ غَیْرَ اَنِّیْ کُنْتُ تَخَلَّفْتُ فِیْ غَزْوَۃِ بَدْرٍ وَلَمْ یُعَاتِبْ اَحَدًا تَخَلَّفَ عَنْھَا اِنَّمَا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُرِیْدُ عِیْرَ قُرَیْشٍ حَتّٰی جَمَعَ اللّٰہُ بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ عَدُوِّھِمْ عَلٰی غَیْرِ مِیْعَادٍ وَلَقَدْ شَھِدْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃَ الْعَقَبَۃِ حِیْنَ تَوَاثَقْنَا عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَا اُحِبُّ اَنَّ لِیْ بِھَا مَشْھَدَ بَدْرٍ وَاِنْ کَانَتْ بَدْرٌ اَذْکَرَ فِی النَّاسِ مِنْھَا کَانَ مِنْ خَبَرِیْ اَنِّیْ لَمْ اَکُنْ قَطُّ اَقْوٰی وَلَا اَیْسَرَ حِیْنَ تَخَلَّفْتُ عَنْہُ فِیْ تِلْکَ الْغَزَاۃِ وَاللّٰہِ مَا اجْتَمَعَتْ عِنْدِیْ قَبْلَہٗ رَاحِلَتَانِ قَطُّ حَتّٰی جَمَعْتُھُمَا فِیْ تِلْکَ الْغَزْوَۃِ وَلَمْ یَکُنْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُرِیْدُ غَزْوَۃً اِلَّا وَرّٰی بِغَیْرِھَا حَتّٰی کَانَتْ تِلْکَ الْغَزْوَۃُ غَزَاھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَرٍّ شَدِیْدٍ وَاسْتَقْبَلَ سَفَرًا بَعِیْدًا وَمَفَازًا وَعَدُوًّا کَثِیْرًا فَجَلّٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ اَمْرَھُمْ لِیَتَاَھَّبُوْا اُھْبَۃَ غَزْوِھِمْ فَاَخْبَرَھُمْ

بِوَجْهِهِ الَّذِیْ یُرِیْدُ وَالْمُسْلِمُوْنَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَثِیْرٌ وَلَا یَجْمَعُھُمْ کِتَابٌ حَافِظٌ یُرِیْدُ الدِّیْوَانَ قَالَ کَعْبٌ فَمَا رَجُلٌ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَغَیَّبَ اِلَّا ظَنَّ اَنْ سَیَخْفٰی لَہٗ مَالَمْ یَنْزِلْ فِیْہِ وَحْیُ اللّٰہِ وَغَزَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تِلْکَ الْغَزْوَۃَ حِیْنَ طَابَتِ الثِّمَارُ وَالظِّلَالُ وَتَجَھَّزَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْمُسْلِمُوْنَ مَعَہٗ فَطَفِقْتُ اَغْدُوْ لِکَیْ اَتَجَھَّزَ مَعَھُمْ فَاَرْجِعُ وَلَمْ اَقْضِ شَیْئًا فَاَقُوْلُ فِیْ نَفْسِیْ اَنَا قَادِرٌ عَلَیْہِ فَلَمْ یَزَلْ یَتَمَادٰی بِیْ حَتّٰی اِشْتَدَّ بِالنَّاسِ الْجِدُّ فَاَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْمُسْلِمُوْنَ مَعَہٗ وَلَمْ اَقْضِ مِنْ جَھَازِیْ شَیْئًا فَقُلْتُ اَتَجَھَّزُ بَعْدَہٗ بِیَوْمٍ اَوْ یَوْمَیْنِ ثُمَّ اَلْحَقُھُمْ فَغَدَوْتُ بَعْدَ اَنْ فَصَلُوْا لِاَتَجَھَّزَ فَرَجَعْتُ وَلَمْ اَقْضِ شَیْئًا ثُمَّ غَدَوْتُ ثُمَّ رَجَعْتُ وَلَمْ اَقْضِ شَیْئًا فَلَمْ یَزَلْ بِیْ حَتّٰی اَسْرَعُوْا وَتَفَارَطَ الْغَزْوُ وَھَمَمْتُ اَنْ اَرْتَحِلَ فَاُدْرِکَھُمْ وَلَیْتَنِیْ فَعَلْتُ فَلَمْ یُقَدَّرْ لِیْ ذٰلِکَ فَکُنْتُ اِذَا خَرَجْتُ فِی النَّاسِ بَعْدَ خُرُوْجِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَطُفْتُ فِیْھِمْ اَحْزَنَنِیْ اَنِّیْ لَا اَرٰی اِلَّا رَجُلًا مَغْمُوْصًا عَلَیْہِ النِّفَاقُ اَوْ رَجُلًا مِّمَّنْ عَذَرَ اللّٰہُ مِنَ الضُّعَفَاءِ وَلَمْ یَذْکُرْنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی بَلَغَ تَبُوْکَ فَقَالَ وَھُوَ جَالِسٌ فِی الْقَوْمِ بِتَبُوْکَ مَا فَعَلَ کَعْبٌ؟ فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ سَلِمَۃَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ حَبَسَہٗ بُرْدَاہُ وَنَظَرُہٗ فِیْ عِطْفَیْہِ فَقَالَ مَعَاذُ بْنُ جَبَلٍ بِئْسَ مَا قُلْتَ وَاللّٰہِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْہِ اِلَّا خَیْرًا فَسَکَتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَعْبُ بْنُ مَالِکٍ فَلَمَّا بَلَغَنِیْ اَنَّہٗ تَوَجَّہَ قَافِلًا حَضَرَنِیْ ھَمِّیْ فَطَفِقْتُ اَتَذَکَّرُ الْکَذِبَ وَاَقُوْلُ بِمَا ذَا اَخْرُجُ مِنْ سَخَطِہٖ غَدًا وَاسْتَعَنْتُ عَلٰی ذٰلِکَ بِکُلِّ ذِیْ رَاْیٍ مِنْ اَھْلِیْ فَلَمَّا قِیْلَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ اَظَلَّ قَادِمًا زَاحَ عَنِّی الْبَاطِلُ وَعَرَفْتُ اَنِّیْ لَنْ اَخْرُجَ مِنْہُ اَبَدًا بِشَیْءٍ فِیْہِ کَذِبٌ فَاَجْمَعْتُ صِدْقَہٗ وَاَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَادِمًا وَکَانَ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ بَدَءَ بِالْمَسْجِدِ فَیَرْکَعُ فِیْہِ رَکْعَتَیْنِ ثُمَّ جَلَسَ لِلنَّاسِ فَلَمَّا فَعَلَ ذٰلِکَ جَاءَہُ الْمُخَلَّفُوْنَ فَطَفِقُوْا یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْہِ وَیَحْلِفُوْنَ لَہٗ وَکَانُوْا بِضْعَۃً وَّثَمَانِیْنَ رَجُلًا فَقَبِلَ مِنْھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَانِیَتَھُمْ وَبَایَعَھُمْ وَاسْتَغْفَرَلَھُمْ وَوَکَلَ سَرَائِرَھُمْ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی فَجِئْتُہٗ فَلَمَّا سَلَّمْتُ عَلَیْہِ تَبَسَّمَ تَبَسُّمَ الْمُغْضَبِ ثُمَّ قَالَ تَعَالْ فَجِئْتُ اَمْشِیْ حَتّٰی جَلَسْتُ بَیْنَ یَدَیْہِ فَقَالَ لِیْ مَا خَلَّفَکَ اَلَمْ تَکُنْ قَدِ ابْتَعْتَ ظَھْرَکَ فَقُلْتُ بَلٰی اِنِّیْ وَاللّٰہِ یَا رَسُوْلَ

اَللّٰهِ لَوْ جَلَسْتُ عِنْدَ غَيْرِكَ مِنْ اَهْلِ الدُّنْيَا لَرَاَيْتُ اَنْ سَاَخْرُجُ مِنْ سَخَطِهٖ بِعُذْرٍ وَلَقَدْ
اُعْطِيْتُ جَدَلًا وَلٰكِنِّيْ وَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُ لَئِنْ حَدَّثْتُكَ الْيَوْمَ حَدِيْثَ كَذِبٍ تَرْضٰى بِهٖ عَنِّيْ
لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يُّسْخِطَكَ عَلَيَّ وَلَئِنْ حَدَّثْتُكَ حَدِيْثَ صِدْقٍ تَجِدُ عَلَيَّ فِيْهِ اِنِّيْ
لَاَرْجُوْ فِيْهِ عَفْوَ اللّٰهِ لَا وَاللّٰهِ مَا كَانَ لِيْ مِنْ عُذْرٍ وَاللّٰهِ مَا كُنْتُ قَطُّ اَقْوٰى وَلَا اَيْسَرَ مِنِّيْ
حِيْنَ تَخَلَّفْتُ عَنْكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا هٰذَا فَقَدْ صَدَقَ فَقُمْ حَتّٰى
يَقْضِيَ اللّٰهُ فِيْكَ فَقُمْتُ وَثَارَ رِجَالٌ مِنْ بَنِيْ سَلِمَةَ فَاتَّبَعُوْنِيْ فَقَالُوْا لِيْ وَاللّٰهِ
مَا عَلِمْنَاكَ كُنْتَ اَذْنَبْتَ ذَنْبًا قَبْلَ هٰذَا وَلَقَدْ عَجَزْتَ اَنْ لَّا تَكُوْنَ اِعْتَذَرْتَ اِلٰى رَسُوْلِ
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا اعْتَذَرَ اِلَيْهِ الْمُتَخَلِّفُوْنَ قَدْ كَانَ كَافِيْكَ ذَنْبَكَ
اِسْتِغْفَارُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَكَ فَوَاللّٰهِ مَا زَالُوْا يُؤَنِّبُوْنَنِيْ حَتّٰى اَرَدْتُ
اَنْ اَرْجِعَ فَاُكَذِّبَ نَفْسِيْ ثُمَّ قُلْتُ لَهُمْ هَلْ لَقِيَ هٰذَا مَعِيْ اَحَدٌ قَالُوْا نَعَمْ رَجُلَانِ قَالَا مِثْلَ
مَا قُلْتَ فَقِيْلَ لَهُمَا مِثْلَ مَا قِيْلَ لَكَ فَقُلْتُ مَنْ هُمَا؟ قَالُوْا مُرَارَةُ بْنُ الرَّبِيْعِ الْعُمَرِيُّ
وَهِلَالُ بْنُ اُمَيَّةَ الْوَاقِفِيُّ فَذَكَرُوْا لِيْ رَجُلَيْنِ صَالِحَيْنِ قَدْ شَهِدَا بَدْرًا فِيْهِمَا اُسْوَةٌ
فَمَضَيْتُ حِيْنَ ذَكَرُوْهُمَا لِيْ وَنَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُسْلِمِيْنَ عَنْ
كَلَامِنَا اَيُّهَا الثَّلٰثَةُ مِنْ بَيْنِ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهُ فَاجْتَنَبَنَا النَّاسُ وَتَغَيَّرُوْا لَنَا حَتّٰى تَنَكَّرَتْ فِيْ
نَفْسِيَ الْاَرْضُ فَمَا هِيَ الَّتِيْ اَعْرِفُ فَلَبِثْنَا عَلٰى ذٰلِكَ خَمْسِيْنَ لَيْلَةً فَاَمَّا صَاحِبَايَ
فَاسْتَكَانَا وَقَعَدَا فِيْ بُيُوْتِهِمَا يَبْكِيَانِ وَاَمَّا اَنَا فَكُنْتُ اَشَبَّ الْقَوْمِ وَاَجْلَدَهُمْ فَكُنْتُ
اَخْرُجُ فَاَشْهَدُ الصَّلٰوةَ مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَطُوْفُ فِي الْاَسْوَاقِ وَلَا يُكَلِّمُنِيْ اَحَدٌ وَاٰتِيْ
رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاُسَلِّمُ عَلَيْهِ وَهُوَ فِيْ مَجْلِسِهٖ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَاَقُوْلُ فِيْ
نَفْسِيْ هَلْ حَرَّكَ شَفَتَيْهِ بِرَدِّ السَّلَامِ عَلَيَّ اَمْ لَا ثُمَّ اُصَلِّيْ قَرِيْبًا مِّنْهُ فَاُسَارِقُهُ النَّظَرَ فَاِذَا
اَقْبَلْتُ عَلٰى صَلَاتِيْ اَقْبَلَ اِلَيَّ وَاِذَا الْتَفَتُّ نَحْوَهٗ اَعْرَضَ عَنِّيْ حَتّٰى اِذَا طَالَ عَلَيَّ ذٰلِكَ
مِنْ جَفْوَةِ النَّاسِ مَشَيْتُ حَتّٰى تَسَوَّرْتُ جِدَارَ حَائِطِ اَبِيْ قَتَادَةَ وَهُوَ ابْنُ عَمِّيْ وَاَحَبُّ
النَّاسِ اِلَيَّ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَوَاللّٰهِ مَا رَدَّ عَلَيَّ السَّلَامَ فَقُلْتُ يَا اَبَا قَتَادَةَ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ
هَلْ تَعْلَمُنِيْ اُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَسَكَتَ فَعُدْتُ لَهٗ فَنَشَدْتُهٗ فَسَكَتَ فَعُدْتُ لَهٗ فَنَشَدْتُهٗ فَقَالَ
اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ فَفَاضَتْ عَيْنَايَ وَتَوَلَّيْتُ حَتّٰى تَسَوَّرْتُ الْجِدَارَ قَالَ فَبَيْنَا اَنَا اَمْشِيْ
بِسُوْقِ الْمَدِيْنَةِ اِذَا نَبَطِيٌّ مِنْ اَنْبَاطِ اَهْلِ الشَّامِ مِمَّنْ قَدِمَ بِالطَّعَامِ يَبِيْعُهٗ بِالْمَدِيْنَةِ

يَقُوْلُ مَنْ يَدُلُّ عَلٰى كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ فَطَفِقَ النَّاسُ يُشِيْرُوْنَ لَهُ حَتّٰى إِذَا جَاءَنِىْ دَفَعَ إِلَىَّ
كِتَابًا مِنْ مَلِكِ غَسَّانَ فَإِذَا فِيْهِ أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِىْ أَنَّ صَاحِبَكَ قَدْ جَفَاكَ وَلَمْ
يَجْعَلْكَ اللّٰهُ بِدَارِ هَوَانٍ وَلَا مَضْيَعَةٍ فَالْحَقْ بِنَا نُوَاسِكَ فَقُلْتُ لَمَّا قَرَأْتُهَا وَهٰذَا أَيْضًا
مِنَ الْبَلَاءِ فَتَيَمَّمْتُ بِهَا التَّنُّوْرَ فَسَجَرْتُهُ بِهَا حَتّٰى إِذَا مَضَتْ أَرْبَعُوْنَ لَيْلَةً مِنَ الْخَمْسِيْنَ
إِذَا رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِيْنِىْ فَقَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَعْتَزِلَ امْرَأَتَكَ فَقُلْتُ أُطَلِّقُهَا أَمْ مَاذَا أَفْعَلُ قَالَ لَا بَلْ اعْتَزِلْهَا وَلَا
تَقْرَبْهَا وَأَرْسَلَ إِلٰى صَاحِبَىَّ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقُلْتُ لِامْرَأَتِىْ الْحَقِىْ بِأَهْلِكِ فَتَكُوْنِىْ عِنْدَهُمْ
حَتّٰى يَقْضِىَ اللّٰهُ فِىْ هٰذَا الْأَمْرِ قَالَ كَعْبٌ فَجَاءَتْ امْرَأَةُ هِلَالِ بْنِ أُمَيَّةَ رَسُوْلَ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ هِلَالَ بْنَ أُمَيَّةَ شَيْخٌ ضَائِعٌ لَيْسَ لَهُ خَادِمٌ
فَهَلْ تَكْرَهُ أَنْ أَخْدُمَهُ قَالَ لَا وَلٰكِنْ لَا يَقْرَبْكِ قَالَتْ إِنَّهُ وَاللّٰهِ مَا بِهِ حَرَكَةٌ إِلٰى شَيْءٍ
وَاللّٰهِ مَا زَالَ يَبْكِىْ مُنْذُ كَانَ مِنْ أَمْرِهِ مَا كَانَ إِلٰى يَوْمِهِ هٰذَا فَقَالَ لِىْ بَعْضُ أَهْلِىْ لَوْ
اسْتَأْذَنْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ امْرَأَتِكَ كَمَا أَذِنَ لِامْرَأَةِ هِلَالِ بْنِ
أُمَيَّةَ أَنْ تَخْدُمَهُ فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَا أَسْتَأْذِنُ فِيْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا
يُدْرِيْنِىْ مَا يَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اسْتَأْذَنْتُهُ فِيْهَا وَأَنَا رَجُلٌ شَابٌّ
فَلَبِثْتُ بَعْدَ ذٰلِكَ عَشْرَ لَيَالٍ حَتّٰى كَمُلَتْ لَنَا خَمْسُوْنَ لَيْلَةً مِنْ حِيْنَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كَلَامِنَا فَلَمَّا صَلَّيْتُ صَلٰوةَ الْفَجْرِ صُبْحَ خَمْسِيْنَ لَيْلَةً وَأَنَا عَلٰى
ظَهْرِ بَيْتٍ مِّنْ بُيُوْتِنَا فَبَيْنَا أَنَا جَالِسٌ عَلَى الْحَالِ الَّتِىْ ذَكَرَ اللّٰهُ قَدْ ضَاقَتْ عَلَىَّ نَفْسِىْ
وَضَاقَتْ عَلَىَّ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ سَمِعْتُ صَوْتَ صَارِخٍ أَوْفٰى عَلٰى جَبَلِ سَلْعٍ بِأَعْلٰى
صَوْتِهِ يَا كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ أَبْشِرْ قَالَ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا وَعَرَفْتُ أَنْ قَدْ جَاءَ فَرَجٌ وَآذَنَ
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَوْبَةِ اللّٰهِ عَلَيْنَا حِيْنَ صَلّٰى صَلٰوةَ الْفَجْرِ فَذَهَبَ
النَّاسُ يُبَشِّرُوْنَنَا وَذَهَبَ قِبَلَ صَاحِبَىَّ مُبَشِّرُوْنَ وَرَكَضَ إِلَىَّ رَجُلٌ فَرَسًا وَسَعٰى سَاعٍ
مِنْ أَسْلَمَ فَأَوْفٰى عَلَى الْجَبَلِ فَكَانَ الصَّوْتُ أَسْرَعَ مِنَ الْفَرَسِ فَلَمَّا جَاءَنِىَ الَّذِىْ
سَمِعْتُ صَوْتَهُ يُبَشِّرُنِىْ نَزَعْتُ لَهُ ثَوْبَىَّ فَكَسَوْتُهُ إِيَّاهُمَا بِبُشْرَاهُ وَاللّٰهِ مَا أَمْلِكُ
غَيْرَهُمَا يَوْمَئِذٍ وَاسْتَعَرْتُ ثَوْبَيْنِ فَلَبِسْتُهُمَا وَانْطَلَقْتُ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَيَتَلَقَّانِىَ النَّاسُ فَوْجًا فَوْجًا يُهَنِّئُوْنِىْ بِالتَّوْبَةِ يَقُوْلُوْنَ لِتَهْنِكَ تَوْبَةُ اللّٰهِ عَلَيْكَ

قَالَ كَعْبٌ حَتّٰى دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ فَإِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ حَوْلَهُ النَّاسُ فَقَامَ إِلَيَّ طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ يُهَرْوِلُ حَتّٰى صَافَحَنِيْ وَهَنَّأَنِيْ وَاللّٰهِ مَا قَامَ إِلَيَّ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ غَيْرَهُ وَلَا أَنْسَاهَا لِطَلْحَةَ قَالَ كَعْبٌ فَلَمَّا سَلَّمْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَبْرُقُ وَجْهُهُ مِنَ السُّرُوْرِ أَبْشِرْ بِخَيْرِ يَوْمٍ مَرَّ عَلَيْكَ مُنْذُ وَلَدَتْكَ أُمُّكَ قَالَ قُلْتُ أَمِنْ عِنْدِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَمْ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ قَالَ لَا بَلْ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سُرَّ اسْتَنَارَ وَجْهُهُ حَتّٰى كَأَنَّهُ قِطْعَةُ قَمَرٍ وَكُنَّا نَعْرِفُ ذٰلِكَ مِنْهُ (بخاری کتاب المغازی باب حدیث کعب بن مالک)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول کریم ﷺ سے کسی لڑائی میں پیچھے نہیں رہا۔ سوائے غزوۂ تبوک کے۔ ہاں جنگ بدر میں پیچھے رہا تھا اور اس کی یہ وجہ تھی کہ آنحضرت قریش کے قافلہ کو مدنظر رکھ کر گئے تھے (کسی بڑی جنگ کی امید نہ تھی) مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے بغیر قبل از وقت تعیّن وقت و مقام کرنے کے لڑوا دیا۔ ہاں میں لیلہ عقبہ میں موجود تھا۔ جب ہم نے اسلام پر قائم رہنے کا عہد کیا تھا اور مجھے جنگ بدر اس رات سے بڑھ کر محبوب نہیں کہ میں لوگوں میں ذکر کروں کہ میں بھی جنگ بدر میں شریک تھا گو کہ عوام میں جنگ بدر لیلہ عقبہ سے زیادہ ہی سمجھی جاتی ہے۔ خیر تبوک کے واقعہ کے وقت میرا یہ حال تھا کہ میں نسبتاً زیادہ مضبوط اور سامان والا تھا اور کسی جنگ کے وقت میرے پاس دو سواری کی اونٹنیاں اکٹھی نہیں ہوئیں مگر اس وقت میرے پاس دو اونٹنیاں موجود تھیں۔ رسول کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب جنگ کو جاتے تو اپنی منزل مقصود کو ظاہر نہ کرتے تھے لیکن اس دفعہ چونکہ گرمی سخت تھی اور سفر دور کا تھا اور راستہ میں غیر آباد جنگل تھے اور بہت سے دشمنوں سے پالا پڑنا تھا اس لئے آپؐ نے مسلمانوں کو خوب کھول کر بتا دیا تاکہ وہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں اور وہ طرف بھی بتا دی جس طرف جانے کا ارادہ تھا۔ اس وقت مسلمان بہت ہو چکے تھے اور ان کا رجسٹر کوئی نہ تھا اس لئے جو لوگ اس لڑائی میں غیر حاضر رہنا چاہتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ جب تک رسول کریم کو وحی نہ ہو ان کا غیر حاضر رہنا مخفی ہی رہے گا اور موسم کا یہ حال تھا کہ میوہ پک چکا تھا اور سایہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ غرض کہ رسول کریم ﷺ نے اور مسلمانوں نے جنگ کی تیاری شروع کی اور میں بھی ہر صبح جنگ کی تیاری کے مکمل کرنے کے لئے نکلتا تا میں بھی ان کے ساتھ تیار ہو جاؤں مگر پھر لوٹ آتا اور

کچھ کام نہ کرتا اسی طرح دن گزرتے رہے اور لوگوں نے محنت سے سامان سفر تیار کر لیا یہاں تک کہ رسول کریمؐ اور مسلمان ایک صبح روانہ بھی ہو گئے اور ابھی میں ناتیار تھا پھر میں نے کہا کہ اب میں ایک دو دن میں تیاری کر کے آپ سے جا ملوں گا۔ ان کے جانے کے بعد دوسرے دن بھی میں گیا مگر بغیر تیاری کے واپس آ گیا اور اسی طرح تیسرے دن بھی میرا یہی حال رہا اور ادھر لشکر جلدی جلدی آگے نکل گیا۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ جاؤں اور ان سے مل جاؤں اور کاش میں ایسا ہی کرتا مگر مجھ سے ایسا نہ ہو سکا۔ پھر جب رسول کریمؐ کے جانے کے بعد میں باہر نکلتا اور لوگوں میں پھرتا تو مجھے یہ بات دیکھ کر سخت صدمہ ہوتا کہ جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے یا تو وہ تھے جو منافق سمجھے جاتے تھے یا وہ ضُعَفَاء جن کو خدا نے معذور رکھا تھا رسول کریم ﷺ نے اس وقت تک مجھے یاد نہیں کیا جب تک کہ تبوک نہ پہنچ گئے۔ وہاں آپؐ نے پوچھا کہ کعب بن مالک کہاں ہے؟ بنی سلمہ کے ایک آدمی (عبداللہ بن انیس) نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ اپنے حسن و جمال (یا لباس کی خوبی) پر اترا کر رہ گیا (آپ کے ساتھ نہیں آیا) یہ سن کر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا تو نے بری بات کہی خدا کی قسم یا رسول اللہ ہم تو اس کو اچھا آدمی (سچا مسلمان) سمجھتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ خاموش ہو رہے۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ خبر آئی کہ آنحضرت ﷺ تبوک سے لوٹے آرہے ہیں تو میرا غم تازہ ہو گیا۔ جھوٹے جھوٹے خیال دل میں آنے لگے (یہ عذر کروں وہ عذر کروں) مجھ کو یہ فکر ہوئی کعب اب کل آپ کے غصے سے تو کیونکر بچے گا میں نے اپنے عزیزوں میں سے جو جو عقل والے تھے ان سے بھی مشورہ لیا۔ جب یہ خبر آئی کہ آپ مدینہ کے قریب آن پہنچے اس وقت سارے جھوٹے خیالات میرے دل سے مٹ گئے اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ جھوٹی باتیں بنا کر میں آپ کے غصے سے بچنے والا نہیں۔ اب میں نے یہ ٹھان لیا (جو ہونا ہو وہ ہو) میں تو سچ سچ کہہ دوں گا خیر صبح کے وقت آپ مدینہ میں داخل ہوئے آپؐ کی عادت تھی جب سفر سے تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں جاتے وہاں ایک دوگانہ ادا فرماتے (آپ نے مسجد میں دوگانہ ادا فرمایا) پھر لوگوں سے ملنے کے لئے بیٹھے اب جو جو (منافق) لوگ پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے آنا شروع کیا اور لگے اپنے اپنے عذر بیان کرنے اور قسمیں کھانے۔ ایسے لوگ اسی (۸۰) سے کچھ اوپر تھے آپ نے ظاہر میں ان کا عذر مان لیا ان سے بیعت لی ان کے واسطے دعا کی ان کے دلوں کے بھید کو خدا پر رکھا۔ کعب کہتے ہیں میں بھی آیا میں نے جب آپؐ کو سلام کیا تو آپ مسکرائے مگر جیسے غصے میں کوئی آدمی مسکراتا ہے پھر فرمایا آؤ میں گیا۔ آپؐ کے سامنے بیٹھ گیا آپؐ نے پوچھا کعب تو کیوں پیچھے رہ گیا تو نے تو سواری بھی

خرید لی تھی میں نے عرض کیا بیشک اگر کسی دنیادار شخص کے سامنے میں اس وقت بیٹھا ہوتا تو باتیں بنا کر اس کے غصے سے بچ جاتا۔ میں خوش تقریر بھی ہوں مگر خدا کی قسم میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آج میں جھوٹ بول کر آپؐ کو خوش کرلوں تو کل اللہ تعالیٰ (اصل حقیقت کھول کر) پھر آپ کو مجھ پر غصے کر دے گا (اس سے فائدہ ہی کیا ہے) میں سچ ہی کیوں نہ بولوں گو آپؐ اس وقت سچ بولنے کی وجہ سے مجھ پر غصہ کریں گے مگر آئندہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی مجھ کو امید تو رہے گی خُدا کی قسم (میں سراسر قصوروار ہوں) زور، طاقت، قوت، دولت سب میں کوئی میرے برابر نہ تھا اور میں یہ سب چیزیں ہوتے ہوئے پیچھے رہ گیا یہ سنکر آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ کعب نے سچ سچ کہہ دیا کعب اب ایسا کر تو چلا جا جب تک اللہ تعالیٰ تیرے باب میں کوئی حکم نہ اتارے۔ میں چلا۔ بنی سلمہ کے کچھ لوگ اٹھ کر میرے پیچھے ہوئے اور کہنے لگے خدا کی قسم ہم کو تو معلوم نہیں کہ تو نے اس سے پہلے بھی کوئی قصور کیا ہو۔ تو نے اور لوگوں کی طرح جو پیچھے رہ گئے تھے آنحضرت ﷺ سے کوئی بہانہ کیوں نہ کر دیا اگر تو بھی کوئی بہانہ کرتا تو آنحضرت ﷺ کی دعا تیرے قصور کے لئے کافی ہو جاتی۔ وہ برابر مجھ کو لعنت ملامت کرتے رہے قسم خدا کی ان کی باتوں سے پھر میرے دل میں آیا کہ آنحضرتؐ کے پاس لوٹ کر چلوں اور اپنی اگلی بات (گناہ کے اقرار) کو جھٹلا کر کوئی بہانہ نکالوں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ اچھا اور بھی کوئی ہے جس نے میری طرح قصور کا اقرار کیا ہو۔ انہوں نے کہا ہاں دو اور بھی ہیں انہوں نے بھی تیری طرح گناہ کا اقرار کیا ہے ان سے بھی آنحضرت ﷺ نے یہی فرمایا ہے جو تجھ سے فرمایا ہے میں نے پوچھا وہ دو شخص کون کون ہیں انہوں نے کہا مرارہ بن ربیع عمری اور ہلال بن امیہ واقفی۔ انہوں نے ایسے دو نیک شخصوں کا بیان کیا جو بدر کی لڑائی میں شریک ہو چکے تھے اور جن کے ساتھ رہنا مجھ کو اچھا معلوم ہوا خیر جب انہوں نے ان دو شخصوں کا نام بھی لیا (تو مجھ کو تسلّی ہوئی) میں چل دیا۔ آنحضرت ﷺ نے تمام مسلمانوں کو منع کر دیا خاص کر ہم تینوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کرے اور دوسرے لوگ جو پیچھے رہ گئے تھے (جنہوں نے جھوٹے بہانے کئے تھے) ان کے لئے یہ حکم نہیں دیا اب لوگوں نے ہم سے پرہیز شروع کیا (کوئی بات تک نہ کرتا) بالکل کورے ہو گئے (جیسے کوئی آشنائی ہی نہ تھی) ایسے ہی پچاس راتیں (اسی پریشان حالی میں) گزریں میرے دونوں ساتھی (مرارہؓ اور ہلالؓ) تو روتے پیٹتے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے اور میں جوان مضبوط آدمی تھا تو (مصیبت پر صبر کر کے) باہر نکلتا نماز کی جماعت میں شریک ہوتا بازاروں میں گھومتا رہتا مگر کوئی شخص مجھ سے بات نہ کرتا۔ میں آنحضرت ﷺ کے پاس بھی آتا آپؐ نماز پڑھ کر اپنی جگہ پر بیٹھے

رہتے میں آپ کو سلام کرتا پھر مجھے شبہ رہتا۔ آپؐ نے (مبارک) ہونٹ ہلا کر مجھ کو سلام کا جواب بھی دیا یا نہیں۔ پھر میں آپؐ کے قریب کھڑے ہو کر نماز پڑھتا رہتا اور دزدیدہ نظر سے آپ کو دیکھتا آپؐ کیا کرتے جب میں نماز میں ہوتا تو مجھ کو دیکھتے اور جب میں آپ کو دیکھتا تو آپؐ منہ پھیر لیتے جب اسی طرح ایک مدت گزری اور لوگوں کی روگردانی دوبھر ہو گئی تو میں چلا اور ابو قتادہ اپنے چچا زاد بھائی کے باغ کی دیوار پر چڑھا اس سے مجھ کو بہت محبت تھی میں نے اس کو سلام کیا تو خدا کی قسم اس نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا ابو قتادہ تجھ کو خدا کی قسم تو مجھ کو اللہ اور اس کے رسول کا ہوا خواہ سمجھتا ہے (یا نہیں) جب بھی اس نے جواب نہ دیا میں نے پھر قسم دے کر دوبارہ یہی کہا لیکن جواب ندارد پھر تیسری بار قسم دے کر یہی کہا تو اس نے یہ کہا کہ اللہ اور رسول خوب جانتے ہیں بس اس وقت تو (مجھ سے رہا نہ گیا) میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور پیٹھ موڑ کر دیوار پر چڑھ کر وہاں سے چل دیا۔ میں ایک بار مدینہ کے بازار میں جارہا تھا اتنے میں ملک شام کا ایک (نصرانی) کسان ملا جو مدینہ میں اناج بیچنے لایا تھا وہ کہہ رہا تھا لوگو کعب بن مالک کو بتلاؤ۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا اس نے غسان کے بادشاہ کا (جو نصرانی تھا) ایک خط مجھ کو دیا مضمون یہ تھا۔ مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے کہ تمہارے پیغمبر صاحب نے تم پر ستم کیا ہے اللہ تعالیٰ نے تم کو ایسا ذلیل نہیں بنایا ہے نہ بیکار (تم تو کام کے آدمی ہو) تم ہم لوگوں سے آن کر مل جاؤ ہم تمہاری خاطر مدارت بخوبی کریں گے۔ میں نے جب یہ خط پڑھا تو (اپنے دل میں کہنے لگا) یہ ایک دوسری بلاء ہوئی۔ میں نے وہ خط لے کر آگ کے تنور میں جھونک دیا۔ ابھی پچاس راتوں میں سے چالیس راتیں گزری تھیں کہ آنحضرت ﷺ کا پیغام لانے والا (خزیمہ بن ثابت) میرے پاس آیا کہنے لگا آنحضرتؐ کا یہ حکم ہے تم اپنی جورو (عمیرہ بنت جبیر) سے بھی الگ رہو۔ میں نے پوچھا کیا اس کو طلاق دے دوں یا کیسا کروں اس نے کہا نہیں اس سے الگ رہو صحبت وغیرہ نہ کرو۔ میرے دونوں ساتھیوں کو بھی یہی حکم کیا۔ آخر میں نے اپنی جورو سے کہہ دیا نیک بخت تو اپنے کنبے والوں میں چلی جا۔ وہیں رہ جب تک اللہ میرا کچھ فیصلہ نہ کرے (وہ چلی گئی) کعب نے کہا ہلال ابن امیہؓ کی جورو (خولہ بنت عاصم) آنحضرتؐ کے پاس آئی اور کہنے لگی یا رسول اللہ ہلال ابن امیہؓ (میرا خاوند) بوڑھا پھونس ہے اگر میں اس کا کام کرتی رہوں تو کیا آپؐ اس کو برا سمجھتے ہیں آپؐ نے فرمایا۔ نہیں (کام کاج کرنے میں قباحت نہیں) پر وہ تجھ سے صحبت نہ کرے اس نے کہا خدا کی قسم وہ تو کہیں چلتا پھرتا بھی نہیں ہے جب سے یہ واقعہ ہوا ہے تب سے برابر رو دھو رہا ہے آج تک وہ اسی حال میں ہے کعب نے کہا مجھ سے بھی

میرے بعض عزیزوں نے کہا تم بھی اگر اپنی جورو کے باب میں آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگو (کہ وہ تمہاری خدمت کرتی رہے) تو مناسب ہے جیسے آنحضرتؐ نے ہلال بن امیہ کی جورو کو خدمت کی اجازت دی (تم کو بھی اجازت دیں گے) کعب نے کہا میں تو خدا کی قسم کبھی اس باب میں آنحضرت ﷺ سے اجازت نہیں مانگنے کا کیونکہ مجھ کو معلوم نہیں کہ آنحضرت ﷺ کیا فرمائیں (اجازت دیں یا نہ دیں) میں جوان آدمی ہوں (ہلال کی طرح ضعیف اور ناتواں نہیں ہوں) خیر اس کے بعد دس راتیں اور گزریں اب پچاس راتیں پوری ہو گئیں اس وقت سے جب سے آپؐ نے لوگوں کو ہم سے سلام کلام کی ممانعت فرمادی تھی۔ پچاسویں رات کی صبح کو جب میں فجر کی نماز پڑھ کر اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا تو جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (التوبہ: ۱۱۸) میرا دل تنگ ہو رہا تھا اور زمین اتنی کشادہ ہونے پر بھی مجھ پر تنگ ہو گئی تھی۔ اتنے میں مَیں نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو سلع پہاڑ پر چڑھ کر پکار رہا تھا (یہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے) کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خوش ہو جا۔ یہ سنتے ہی میں سجدے میں گر پڑا اور مجھ کو یقین ہو گیا۔ اب میری مشکل دور ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد لوگوں کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا قصور معاف کر دیا۔ اب لوگ خوشخبری دینے میرے پاس اور میرے دونوں ساتھیوں (مرارہ اور ہلال) کے پاس جانے لگے۔ ایک شخص (زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ) گھوڑا کداتے ہوئے میرے پاس آئے اور قبیلے کا ایک شخص دوڑتا ہوا پہاڑ پر چڑھ گیا (حمزہ بن عمرو اسلمی) اور پہاڑ پر کی آواز گھوڑے سے جلد مجھ کو پہنچ گئی۔ خیر جب یہ خوشخبری کی آواز مجھ کو پہنچی میں نے (خوشی میں آن کر) کیا کیا دو کپڑے جو میرے پاس تھے وہ اتار کر اس کو پہنا دیئے اس وقت کپڑوں کی قسم سے میرے پاس یہی دو کپڑے تھے اور میں نے (ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے) دو کپڑے مانگ کر پہنے اور آنحضرت ﷺ کے پاس چلا۔ رستے میں فوج در فوج لوگ مجھ سے ملتے جاتے تھے اور مجھ کو مبارکباد دیتے جاتے تھے اور کہتے تھے اللہ کی معافی تم کو مبارک ہو۔ کعب کہتے ہیں جب میں مسجد میں پہنچا۔ دیکھا تو آنحضرت ﷺ بیٹھے ہیں لوگ آپ کے گرد ہیں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ مجھ کو دیکھ کر دوڑ کر اٹھے اور مصافحہ کیا۔ مبارکباد دی۔ خدا کی قسم مہاجرین میں سے اور کسی نے اٹھ کر مجھ کو مبارکباد نہیں دی۔ میں طلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ احسان کبھی بھولنے والا نہیں۔ کعب کہتے ہیں جب میں نے آنحضرت ﷺ کو سلام کیا میں نے دیکھا آپؐ کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا آپ نے فرمایا کعب وہ دن تجھ کو مبارک ہو جو ان سب دنوں سے بہتر ہے جب سے تیری ماں نے تجھ کو جنا۔ میں نے عرض

کیا یا رسول اللہ یہ معافی اللہ کی طرف سے ہوئی یا آپ کی طرف سے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں اللہ کی طرف سے ہوئی (اس نے خود معافی کا حکم اتارا)۔ آنحضرت ﷺ جب خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ چاند کی طرح روشن ہو جاتا ہم لوگ اس کو پہچان لیتے۔

اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ رسول کریمؐ کی فطرت کیسی پاک اور مطہر تھی اور کس طرح آپؐ ہر رنگ میں کامل ہی کامل تھے۔ بے شک بعض آدمی ہوتے ہیں جو غیرت دینی رکھتے ہیں مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض تو دشمنوں کے مقابلہ میں اظہار غیرت کر دیتے ہیں مگر دوستوں کے معاملہ میں اظہار غیرت نہیں کر سکتے اور بعض دوستوں پر اظہار غیرت کر دیتے ہیں مگر دشمنوں کے سامنے دب جاتے ہیں۔ مگر رسول کریم ﷺ ایسے کامل انسان تھے کہ خواہ دین کی ہتک یا احکام الٰہیہ سے بے پرواہی دوست سے ہو یا دشمن سے برداشت نہ کر سکتے تھے اور فوراً اس کا ازالہ کرنا چاہتے۔ ادھر تو طبیعت کی نرمی کا یہ حال تھا کہ گالیوں پر گالیاں ملتی ہیں اور تکلیفیں دی جاتی ہیں مگر آپؐ پرواہ بھی نہیں کرتے اور ادھر خدا کے معاملہ میں غیرت کا یہ حال تھا کہ جب ابو سفیان آپؐ کی ہتک کرتا رہا تو کچھ پرواہ نہ کی۔ مگر جب شرک کے کلمات منہ پر لایا تو فرمایا اسے جواب دو۔ یہ تو دشمن کا حال تھا دوستوں کے معاملہ میں بھی ایسے ہی سخت تھے۔ منافق جنگ سے پیچھے رہ گئے تو کچھ پرواہ نہ کی ایک مؤمن نے جو اس حکم الٰہی کے بجالانے میں سستی کی تو آپ نے کس قدر غیرت سے کام لیا۔ اور باوجود اس کے محبت کا یہ عالم تھا کہ ان ایام ناراضگی میں بھی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو کنکھیوں سے دیکھتے رہتے۔

اخلاص باللہ - قیام حدود

آنحضرت ﷺ کی غیرت دینی جس وضاحت سے مذکورہ بالا واقعات سے ثابت ہوتی ہے اس پر کچھ اور زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں۔ اب میں آپؐ کے ایک اور خلق پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا معاملہ خدا تعالیٰ سے کیسا پاک تھا اور کس طرح آپ کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا خیال رہتا تھا۔

انسان فطرتاً کسی کی مصیبت کو دیکھ کر رحم کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ جب کسی مجرم کو سزا ملتی دیکھتے ہیں تو باوجود اس علم کے کہ اس سے سخت جرائم سرزد ہوئے ہیں ان کے دل کو

دکھ پہنچتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اب اس شخص سے جرم تو ہو ہی گیا ہے اور یہ تائب بھی ہے اسے چھوڑ دیا جائے تو اچھا ہے لیکن یہ ایک کمزوری ہے اگر اس جذبہ سے متأثر ہو کر مجرموں کو چھوڑ دیا جائے تو گناہ اور جرائم بہت ہی بڑھ جائیں۔

فطری رحم کے علاوہ جب کسی بڑے آدمی سے جرم ہو تو لوگ عام طور پر نہیں پسند کرتے کہ اسے سزا ملے اور اس کی بڑائی سے متاثر ہو کر چاہتے ہیں کہ اسے کسی طرح چھوڑ دیا جائے بلکہ بڑے دولتمند یا کوئی دنیاوی وجاہت رکھنے والے آدمی تو روپیہ اور اثر خرچ کر کے ایک ایسی جماعت اپنے ساتھ کر لیتے ہیں کہ جو مشکلات کے وقت ان کا ساتھ دیتی ہے اور باوجود قانون کی خلاف ورزی کے اپنے جتھے کی مدد سے اپنے جرائم کے اثر سے بچ جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرتِ دینی

ان قوموں میں جن کے اخلاق گر جاتے ہیں اور جن کے افراد میں طرح طرح کی بدیاں آجاتی ہیں ان میں خصوصاً یہ رواج عام ہو جاتا ہے کہ بڑے لوگ قانون کے خلاف عمل کر کے بھی بچ جاتے ہیں اور صرف غرباء ہی سزا پاتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ اس بات کے سخت مخالف تھے اور آپؐ کا جو معاملہ خدا کے ساتھ تھا اور جس طرح آپؐ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہتے تھے اس کے لحاظ سے آپؐ کبھی پسند نہ کرتے تھے کہ احکام شریعت سے امراء کو مستثنیٰ کر کے غرباء ہی کو اس کا مکلّف سمجھا جائے بلکہ آپؐ باوجود ایک رحیم دل اور ہمدرد طبیعت رکھنے کے ہمیشہ احکام شریعت کے جاری کرنے میں محتاط رہتے اور مجرمین کو سزا سے بچنے نہ دیتے اور جس طرح آپؐ غرباء کو سزا دیتے امراء بھی اسی طرح احکام شریعت کے ماتحت جکڑے جاتے اور اس معاملہ میں آپؐ بڑے غیور تھے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اَنَّ امْرَاَۃً مِّنْ بَنِیْ مَخْزُوْمٍ سَرَقَتْ فَقَالُوْا مَنْ یُّکَلِّمُ فِیْھَا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ یَجْتَرِئْ اَحَدٌ اَنْ یُّکَلِّمَہٗ فَکَلَّمَہٗ اُسَامَۃُ بْنُ زَیْدٍ فَقَالَ اِنَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کَانَ اِذَا سَرَقَ فِیْھِمُ الشَّرِیْفُ تَرَکُوْہُ وَ اِذَا سَرَقَ الضَّعِیْفُ قَطَعُوْہُ لَوْ کَانَتْ فَاطِمَۃُ لَقَطَعْتُ یَدَھَا (بخاری کتاب المناقب باب ذکر اسامہ بن زید) بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی اس پر لوگوں نے چاہا کہ کون ہے جو رسول کریمؐ سے اس عورت کے معاملہ میں سفارش کرے لیکن کسی نے اس کی جرأت نہ کی (کیونکہ رسول کریمؐ حدود کے قائم کرنے میں بڑے سخت تھے) آخر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے رسول کریمؐ سے ذکر کیا مگر آپؐ نے

جواب دیا کہ بنی اسرائیل کی عادت تھی کہ جب ان میں کوئی شریف چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے مگر جب کوئی غریب چوری کرتا تو اس کا ہاتھ قطع کر دیتے۔ مگر میرا یہ حال ہے کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں۔

اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپؐ کا خدا سے کیا تعلق تھا اور واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں خلیفہ تھے کیونکہ خلیفہ اسی کو کہتے ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں جاری کرے اور یہ رسول کریمؐ ہی تھے کہ جو بغیر کسی کے خوف ملامت کے حدود اللہ کا قیام کرتے اور کسی کی رعایت نہ کرتے۔

رسول کریم ﷺ کے جو تعلقات اللہ تعالیٰ سے تھے اور جس طرح آپؐ نے خدا سے معاملہ صاف رکھا ہؤا تھا اس پر یہ بات بھی روشنی ڈالتی ہے کہ آپ اپنے تمام کاموں میں پہلے یہ دیکھ لیتے کہ خدا تعالیٰ کا کیا حکم ہے اور جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہ ہوتا آپؐ کسی کام کے کرنے پر دلیری نہ کرتے۔ چنانچہ مکہ سے باوجود ہزاروں قسم کی تکالیف کے آپؐ نے ہجرت نہیں کی ہاں صحابہؓ کو حکم دے دیا کہ اگر وہ چاہیں تو ہجرت کر جائیں اور لوگوں کی شرارت کو دیکھ کر صحابہؓ کو ہجرت کرنی بھی پڑی اور بہت سے صحابہؓ حبشہ کو اور کچھ مدینہ کو ہجرت کر گئے اور صرف حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ اور رسول کریمؐ یا اور چند صحابہؓ مکہ میں باقی رہ گئے۔

کفار مکہ کو دوسرے لوگوں کی نسبت رسول کریم ﷺ سے فطرتاً زیادہ بغض و عداوت تھی کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ آپؐ ہی کی تعلیم کی وجہ سے لوگوں میں شرک کی مخالفت پھیلتی جاتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ آپکو قتل کر دیں تو باقی جماعت خود بخود پراگندہ ہو جائے گی اس لئے بہ نسبت دوسروں کے وہ آنحضرتؐ کو زیادہ دکھ دیتے اور چاہتے کہ کسی طرح آپؐ اپنے دعاوی سے باز آجائیں لیکن باوجود ان مشکلات کے آپؐ نے صحابہؓ کو تو ہجرت کا حکم دے دیا مگر خود ان دکھوں اور تکلیفوں کے باوجود مکہ سے ہجرت نہ کی کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی اذن نہ ہؤا تھا۔ چنانچہ جب حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا کہ میں ہجرت کر جاؤں تو آپؐ نے جواب دیا۔ عَلٰی رِسْلِكَ فَاِنِّیْ اَرْجُوْا اَنْ یُّؤْذَنَ لِیْ آپ ابھی ٹھہریں امید ہے کہ مجھے بھی اجازت مل جائے۔

اللہ اللہ کیا پاک انسان تھا۔ دکھ پر دکھ تکالیف پر تکالیف پہنچ رہی ہیں سب ساتھیوں کو حکم دے دیتا ہے کہ جاؤ جس جگہ امن ہو چلے جاؤ لیکن خود اپنی جگہ سے نہیں ہلتا اور باوجود مخالفت کے اس بات کا منتظر ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم آئے تو میں اس پر کاربند ہوں۔ کیا کسی انسان میں

یہ ہمت ہے کیا کوئی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف ایسا متوجہ ہو کہ ایسے خطرناک مصائب کے اوقات میں بھی دشمنوں کی مخالفت کو برداشت کرتا جائے اور جب تک خدا کا حکم نہ ہو اپنی جگہ نہ چھوڑے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دعویٰ ہی نہیں ہے بلکہ واقعہ میں آپ اس وقت تک مکہ سے نہیں نکلے جب تک کہ خدا کی طرف سے حکم نہ ہؤا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں فَبَیْنَمَا نَحْنُ یَوْمًا جُلُوْسٌ فِیْ بَیْتِ اَبِیْ بَکْرٍ فِیْ نَحْرِ الظَّھِیْرَۃِ قَالَ قَائِلٌ لِاَبِیْ بَکْرٍ ھٰذَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُتَقَنِّعًا فِی سَاعَۃٍ لَمْ یَکُنْ یَأْتِیْنَا فِیْھَا فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ فِدَاءٌ لَّہٗ اَبِیْ وَاُمِّیْ وَاللّٰہِ مَاجَآءَ بِہٖ فِیْ ھٰذِہِ السَّاعَۃِ اِلَّا اَمْرٌ قَالَتْ فَجَآءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاسْتَأْذَنَ فَاُذِنَ لَہٗ فَدَخَلَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاَبِیْ بَکْرٍ اَخْرِجْ مَنْ عِنْدَكَ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ اِنَّمَا ھُمْ اَھْلُكَ بِاَبِیْ اَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ فَاِنِّیْ قَدْ اُذِنَ لِیْ فِی الْخُرُوْجِ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ اَلصَّحَابَۃَ بِاَبِیْ اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَعَمْ (بخاری کتاب المناقب باب ھجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ الی المدینۃ) ہم ایک دن بیٹھے ہوئے تھے کہ عین دوپہر کے وقت رسول کریمؐ تشریف لائے اور سر لپیٹا ہؤا تھا۔ آپ اس وقت کبھی نہیں آیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں آپ اس وقت کسی بڑے کام کے لئے آئے ہوں گے۔ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریمؐ نے اجازت مانگی اور اجازت ملنے پر گھر میں آئے اور فرمایا کہ جو لوگ بیٹھے ہیں ان کو اٹھا دو۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے قسم ہے کہ وہ آپؐ کے رشتہ دار ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اچھا مجھے ہجرت کا حکم ہؤا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے بھی ساتھ ہی جانے کی اجازت دیجئے رسول کریمؐ نے فرمایا بہت اچھا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس وقت تک مکہ سے نہیں نکلے جب تک حکم نہ ہؤا اور آخر وقت تک اس بات پر قائم رہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرنا۔

کیسا ایمان، کیسا یقین، کیسا پاک تعلق ہے فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ۔

اخلاص باللہ - توکّل علی اللہ

واقعہ ہجرت

واقعہ ہجرت بھی ایک عجیب ہولناک واقعہ ہے۔ سارا عرب مخالف اور خون کا پیاسا تھا مگر رسول کریمؐ صرف ایک ساتھی لے کر مدینہ کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں تمام وہ قومیں آباد تھیں جو مذہب کی مخالفت کی وجہ سے آپ کو مارنے کی فکر میں رہتی تھیں اور صرف قریش کے ڈر کے مارے خاموش تھیں لیکن اب وہ وقت آگیا تھا کہ جب قریش خود آپ کے قتل کے درپے تھے اور کل قبائل عرب کو تسلی تھی کہ اگر ہم نے اس شخص کو قتل کر دیا تو قریش کو ناراضگی کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔ اور صرف یہی نہیں کہ قریش کی مخالفت کا خوف نہ رہا تھا بلکہ قریش نے رسول کریم ﷺ کو مکہ سے غیر حاضر دیکھ کر آپ کے قتل پر انعام مقرر کر دیا تھا اور مدینہ کے راستہ میں جس قدر قبائل آباد تھے انہیں یہ اطلاع دے دی تھی کہ جو شخص رسول کریمؐ اور حضرت ابو بکرؓ کو زندہ یا مردہ لے آئے گا اسے سو سو اونٹ فی کس انعام ملے گا۔ عرب کے قبائل جن کی زندگی ہی لوٹ مار پر بسر ہوتی تھی اور جو آتش حسد سے پہلے ہی جل بُھن کر کوئلہ ہو رہے تھے اس موقع کو کب ہاتھ سے جانے دے سکتے تھے ہر طرف آپؐ کی تلاش شروع ہوئی اور گویا ہر قدم پر جو آپ اٹھاتے خوف تھا کہ کسی خون کے پیاسے دشمن سے پالا پڑے گا ایسے موقع پر اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہادر سے بہادر انسان بھی دل ہار بیٹھتا ہے اور آخری جدوجہد سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور اگر نہایت دلیر اور خلاف معمول کوئی نہایت قوی دل انسان بھی ہو تو اس پر بھی خوف ایسا مستولی ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر ایک حرکت سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے بہادروں کے واقعات پڑھے ہیں لیکن ایسے موقع پر ان کی جو حالت ہوتی ہے اس کا رسول کریمؐ کے واقعہ سے مقابلہ بھی کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔ تاریخ دان جانتے ہیں کہ بھاگتے ہوئے نپولین کا کیا حال تھا اور اس کے چہرہ پر حسرت کے کیسے بیّن آثار پائے جاتے تھے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمایوں کس طرح بار بار اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھوں میں سپرد کر دینے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ اور اگر اس کے ساتھ چند نہایت وفادار جرنیل نہ ہوتے تو وہ شاید ایسا کر بھی دیتا۔ اسی طرح اور بہت سے بڑے بہادر جرنیل گزرے ہیں جن پر مشکلات کے ایام آئے ہیں اور وہ ایسے اوقات میں جب دشمن ان کے چاروں طرف ان کی جستجو میں پھیل گیا گھبرا گئے ہیں لیکن رسول کریمؐ ان دنیاوی لوگوں میں سے نہ

تھے آپ کی نظریں دنیا کی طرف نہیں لگی ہوئی تھیں بلکہ آپ کی آنکھ خدا کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ دنیا کے اسباب آپ کے مدنظر نہ تھے اور آپ یہ خیال نہ کرتے تھے کہ ایسے وقت میں مَیں تن تنہا صرف ایک ساتھی کے ساتھ کیا کر سکتا ہوں اور ایسے خطرناک راستہ میں اگر دشمن آجائے تو اس کے مقابلہ کے لئے میرے پاس کیا سامان ہیں بلکہ آپؐ یہ دیکھ رہے تھے کہ میرے ساتھ وہ خدا ہے جو ہمیشہ سے اپنے نیک بندوں کا محافظ چلا آیا ہے اور جس کے وار کا کوئی دشمن مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ خدا نوحؑ کا خدا، ابراہیمؑ کا خدا، موسیٰؑ کا خدا، یونسؑ کا خدا ایوبؑ کا خدا، داؤدؑ کا خدا، سلیمانؑ کا خدا، مسیحؑ کا خدا تھا وہی میرا خدا ہے اس کی طاقتیں کبھی زائل نہیں ہوتیں اور وہ ایک دم کے لئے غافل نہیں ہے سراقہ بن جعشم لالچ اور دشمنی سے دیوانہ ہو کر آتا ہے اور دور سے دیکھ کر آپ کی طرف گھوڑا دوڑا دیتا ہے اس کے دل میں امید دریا کی طرح لہریں مارتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے مذہب کی توہین کرنے والے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر اپنے سوختہ دل کو تسکین دینا چاہتا ہے بلکہ دو سو اونٹ کا انعام جو اسے اپنی قوم میں ایک بہت بڑا رتبہ دینے کے لئے کافی تھے اس کی ہمت کو اور بھی بلند کر دیتا ہے جس طرح شکاری اپنے شکار کو دیکھ کر لپکتا ہے اسی طرح وہ رسول کریمؐ کو دیکھ کر آپ کی طرف لپکتا ہے اور تیر کمان ہاتھ میں لے کر چاہتا ہے کہ آپ پر وار کرے وہ اکیلا نہیں بلکہ ایک نعرہ مار کر وہ اپنے اردگرد ہزاروں آدمیوں کو جمع کر سکتا ہے کیونکہ رسول کریمؐ اس وقت اسی کے علاقہ سے گزر رہے ہیں۔ لیکن آپؐ اس وقت کیا کرتے ہیں کیا بھاگ جاتے ہیں کیا ڈر کر اپنے آپؐ کو اس کے سپرد کر دیتے ہیں کیا آپ کے قدم لڑکھڑانے لگ جاتے ہیں۔ کیا ان کے حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ کیا اسے قتل کر کے راہ فرار اختیار کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ نہیں وہ خدا پر توکّل کرنے والا انسان ان میں سے ایک بات بھی نہیں کرتا اور سراقہ کی اتنی پرواہ بھی نہیں کرتا جتنی ایک بیل کی کی جاتی ہے حضرت ابوبکرؓ باوجود اس جرأت اور بہادری کے باوجود اس ایمان اور یقین کے باوجود اس توکّل اور بھروسہ کے جو آپ میں پایا جاتا تھا مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے ہیں کہ سراقہ اب ہمارے کس قدر نزدیک آگیا ہے لیکن رسول کریمؐ اس کی پرواہ بھی نہیں کرتے اور گھبرانا اور دوڑنا تو الگ خوف و ہراس کا اظہار تو جدا آپ نے ایک دفعہ منہ پھیر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا جس نے سراقہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور اس کی آنکھیں کھل گئیں کہ میں کس انسان کا پیچھا کر رہا ہوں اور وہ مدّت العمر اس نظارہ کو اپنے حافظہ سے نہیں مٹا سکا بلکہ اس خلاف معمول واقعہ نے اس کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ ہمیشہ اسے بیان کرتا تھا اور کہتا تھا کہ سَمِعْتُ قِرَاءَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَ سَلَّمَ وَ هُوَ لَا يَلْتَفِتُ وَ اَبُوْ بَكْرٍ يُكْثِرُ الْاِلْتِفَاتَ (بخاری کتاب المناقب باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ الی المدینۃ) یعنی میں گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے رسول کریمؐ کے اس قدر نزدیک ہو گیا کہ میں رسول کریمؐ کے قرآن پڑھنے کی آواز سن رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ رسول کریمؐ دائیں بائیں بالکل نہیں دیکھتے ہاں حضرت ابو بکرؓ بار بار دیکھتے جاتے تھے۔

اللہ اللہ! خدا تعالیٰ پر کیسا بھروسہ ہے۔ دشمن گھوڑا دوڑاتا ہؤا اس قدر نزدیک آگیا ہے کہ آپؐ کی آواز اس تک پہنچ سکتی ہے اور آپؐ تیر کی زد میں آگئے ہیں مگر آپ ہیں کہ گھبراہٹ کا محسوس کرنا تو الگ رہا قرآن شریف پڑھتے جاتے ہیں ادھر حضرت ابو بکرؓ بار بار دیکھتے جاتے ہیں کہ اب دشمن کس قدر نزدیک پہنچ گیا ہے کیا اس بھروسہ اور توکّل کی کوئی اور نظیر بھی مل سکتی ہے۔ کیا کوئی انسان ہے جس نے اس خطرناک وقت میں ایسی بے توجہی اور لاپرواہی کا اظہار کیا ہو۔ اگر آپؐ کو دنیاوی اسباب کے استعمال کا خیال بھی ہوتا تو کم سے کم اتنا ضرور ہونا چاہیئے تھا کہ آپ اس وقت یا تو سراقہ پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے یا وہاں سے تیز نکل جانے کی کوشش کرتے لیکن آپؐ نے ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں اختیار کی نہ تو آپ تیز قدم ہوئے اور نہ ہی آپ نے یہ ارادہ کیا کہ کسی طرح سراقہ کو مار دیں بلکہ نہایت اطمینان کے ساتھ بغیر اظہار خوف و ہراس اپنی پہلی رفتار پر قرآن شریف پڑھتے ہوئے چلے گئے۔ وہ کونسی چیز تھی جس نے اس وقت آپ کے دل کو ایسا مضبوط کر دیا۔ کونسی طاقت تھی جس نے آپ کے حوصلہ کو ایسا بلند کر دیا۔ کونسی روح تھی جس نے آپ کے اندر اس قسم کی غیر معمولی زندگی پیدا کر دی؟ یہ خدا پر توکّل کے کرشمہ تھے اس پر بھروسہ کے نتائج تھے۔ آپ جانتے تھے کہ ظاہری اسباب میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ دنیا کی طاقتیں مجھے ہلاک نہیں کر سکتیں کیونکہ آسمان پر ایک خدا ہے جو مجھے دیکھ رہا ہے جو ان سب اسباب کا پیدا کرنیوالا ہے پس خالق اسباب کے خلاف اسباب کچھ نہیں کر سکتے یہ توکّل آپ کا ضائع نہیں گیا بلکہ خدا نے اسے پورا کیا اور سراقہ جو دو سو اونٹ کے لالچ میں آیا تھا آپ سے معافی مانگ کر واپس چلا گیا اور خدا نے اس کے دل پر ایسا رعب ڈالا کہ اس نے اپنی سلامتی اس میں سمجھی کہ خاموشی سے واپس چلا جائے بلکہ اس نے اور تعاقب کرنے والوں کو بھی واپس لوٹا دیا۔

غارِ ثور کا ایک واقعہ

جب رسول کریم ﷺ کو حکم ہؤا کہ آپ بھی مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو جائیں تو آپؐ اور حضرت ابو بکرؓ ایک رات کو مکہ سے نکل کر جبل ثور کی طرف چلے گئے۔ یہ پہاڑ مکہ سے کوئی چھ سات میل پر واقع ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک

غار ہے جس میں دو تین آدمی اچھی طرح آرام کر سکتے ہیں اور بیٹھ تو اس سے زیادہ سکتے ہیں۔ جب کفار نے دیکھا کہ آپ اپنے گھر میں موجود نہیں ہیں باوجود پہرہ کے خدا کے فضل سے دشمنوں کے شر سے صحیح و سالم نکل گئے ہیں اور دشمن باوجود کمال ہوشیاری اور احتیاط کے خائب و خاسر ہو گئے تو انہوں نے کوشش کی کہ تعاقب کر کے آپ کو گرفتار کر لیں اور اپنے غضب کی آگ آپ پر برسائیں اور فوراً ادھر ادھر آدمی دوڑائے کچھ آدمی اپنے ساتھ ایک کھوجی لے کر چلے جس نے آپ کے قدموں کے نشانات کو معلوم کر کے جبل ثور کی طرف کا رخ کیا جب جبل ثور پر پہنچے تو اس نے بڑے زور سے اس بات کا اقرار کیا کہ یہ لوگ اس جگہ سے آگے نہیں گئے بلکہ پہاڑی پر موجود ہیں۔

کھوجی عام طور سے ہوشیار ہوتے ہیں اور گورنمنٹ اور محکمہ پولیس والے ان سے بہت کچھ فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ طریق انسان کی دریافت کرنے کا ایک بہت پرانا طریق ہے خصوصاً ان ممالک میں جہاں جرائم کی کثرت ہو اس طریق سے بہت کچھ کام لینا پڑتا ہے اس لئے غیر مہذب ممالک میں اور ایسے ممالک میں کہ جہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ ہو اس فن کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے اور جہاں زیادہ ضرورت ہو وہاں اس فن کی ترقی بھی ہو جاتی ہے اس لئے عرب اور اس قسم کے دیگر ممالک میں جہاں رسول کریمؐ (فداہ ابی و امّی) سے پہلے کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی اور جرائم کی کثرت تھی یہ پیشہ بڑے زوروں پر تھا اور نہایت قابل وثوق سمجھا جاتا تھا۔ پس کھوجی کا یہ کہہ دینا کہ آپؐ ضرور یہاں تک آئے ہیں ایک بہت بڑا ثبوت تھا اور ایسی حالت میں غار کے اندر بیٹھے ہوؤں کا جو حال ہونا چاہیئے وہ سمجھ میں آسکتا ہے۔

وہ کیسا وقت ہو گا جب رسول کریمؐ اور حضرت ابو بکرؓ دونوں بغیر سلاح و ہتھیار کے غار ثور کے اندر بیٹھے ہوں گے اور دشمن سر پر کھڑا باتیں بنا رہا ہو گا۔ غار ثور کوئی چھوٹی سی غار نہیں جس کا منہ ایسا تنگ ہو کہ جس میں انسان کا گھسنا مشکل سمجھا جائے یا جس کے اندر جھانکنا مشکل ہو بلکہ ایک فراخ منہ کی کھلی غار ہے جس کے اندر جھانکنے سے آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کوئی اندر بیٹھا ہے یا نہیں۔ پس ایسی حالت میں دنیاوی اسباب کے لحاظ سے مشرکین مکہ کے لئے یہ بات بالکل قرین قیاس بلکہ ضروری تھی کہ وہ کھوجی کے کہنے کے مطابق ذرا آنکھیں جھکا کر دیکھ لیتے کہ آیا رسول کریمؐ غار میں تو نہیں بیٹھے اور یہ کوئی ایسا عظیم الشان کام نہ تھا کہ جسے وہ لاپرواہی سے چھوڑ دیتے کہ ایسے ضعیف خیال کی بناء پر اتنی محنت کون برداشت کرے۔ پس ایسے انسانوں کا جو ایسے خطرہ کی

حالت میں اس غار میں بیٹھے ہوئے ہوں گھبرانا اور خوف کرنا بالکل فطرت کے مطابق ہوتا اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بہادر سے بہادر انسان بھی اس وقت خوف نہ کرتا لیکن اگر کوئی ایسا جری انسان ہو بھی جو ایسے وقت میں اپنی جان کی پرواہ نہ کرے اور بے خوف بیٹھا رہے اور سمجھ لے کہ اگر دشمن نے پکڑ بھی لیا تو کیا ہوا آخر ایک دن مرنا ہے تو بھی یہ امر بالکل فطرت انسانی کے مطابق ہو گا کہ ایسا آدمی جو ایسے مقام پر ہو کم سے کم یہ یقین کرلے کہ یہ لوگ ہمیں دیکھ ضرور لیں گے کیونکہ عین سرے پر پہنچ کر اور ایسی یقینی شہادت کے باوجود غار میں نظر بھی نہ ڈالنا بالکل اسباب کے خلاف ہے۔

مگر ہمارا رسولؐ فداہ ابی و امی کیا کرتا ہے؟ حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْغَارِ فَرَفَعْتُ رَأْسِيْ فَإِذَا أَنَا بِأَقْدَامِ الْقَوْمِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ أَنَّ بَعْضَهُمْ طَأْطَأَ بَصَرَهُ رَآنَا قَالَ اُسْكُتْ يَا أَبَا بَكْرٍ اِثْنَانِ اَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا (بخاری جلد اول کتاب المناقب باب ھجرۃ النبی صلعم و اصحابہ الی المدینۃ) میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ غار میں تھا میں نے اپنا سر اٹھا کر نظر کی تو تعاقب کرنے والوں کے پاؤں دیکھے اس پر میں نے رسول کریمؐ سے عرض کیا یا رسول اللہؐ اگر کوئی نظر نیچی کرے گا تو ہمیں دیکھ لے گا تو آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ چپ اے ابی بکر۔ ہم دو ہیں ہمارے ساتھ تیسرا خدا ہے (پھر وہ کیونکر دیکھ سکتے ہیں)۔

اللہ اللہ کیا توکّل ہے۔ دشمن سر پر کھڑا ہے اور اتنا نزدیک ہے کہ ذرا آنکھ نیچی کرے اور دیکھ لے لیکن آپؐ کو خدا تعالیٰ پر ایسا یقین ہے کہ باوجود سب اسباب مخالف کے جمع ہو جانے کے آپ یہی فرماتے ہیں کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے خدا تو ہمارے ساتھ ہے پھر وہ کیوں کر دیکھ سکتے ہیں؟

کیا کسی ماں نے ایسا بچہ جنا ہے جو اس یقین اور ایمان کو لے کر دنیا میں آیا ہو۔ یہ جرأت و بہادری کا سوال نہیں بلکہ توکّل کا سوال ہے خدا پر بھروسہ کا سوال ہے۔ اگر جرأت ہی ہوتی تو آپؐ یہ جواب دیتے کہ خیر پکڑ لیں گے تو کیا ہوا ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ مگر آپؐ کوئی معمولی جرنیل یا میدان جنگ کے بہادر سپاہی نہ تھے آپ خدا کے رسول تھے اس لئے آپ نے نہ صرف خوف کا اظہار نہ کیا بلکہ حضرت ابو بکرؓ کو بتایا کہ دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں ہے خدا ہمارے ساتھ ہے اور اس کے حکم کے ماتحت ہم اپنے گھروں سے نکلے ہیں پھر ان کو طاقت ہی کہاں مل سکتی ہے کہ یہ آنکھ نیچی کر کے ہمیں دیکھیں۔

یہ وہ توکّل ہے جو ایک جھوٹے انسان میں نہیں ہو سکتا۔ جو ایک پر فریب دل میں نہیں ٹھہر سکتا۔ شاید کوئی مجنون ایسا کر سکے کہ ایسے خطرناک موقع پر بے پرواہ رہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ مجنوں

فقدان حواس کی وجہ سے ایسا کہہ تو لے لیکن وہ کون ہے جو اس کے مجنونانہ خیالات کے مطابق اس کے متعاقبین کی آنکھوں کو اس سے پھیر دے اور متعاقب سر پر پہنچ کر پھر اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھ سکیں۔

پس رسول کریم ﷺ کا توکّل ایک رسولانہ توکّل تھا اور جسے خدا تعالیٰ نے اسی رنگ میں پورا کر دیا آپ ؐ نے خدا تعالیٰ پر یقین کر کے کہا کہ میرا خدا ایسے وقت میں مجھے ضائع نہیں کرے گا اور خدا نے آپ کے توکّل کو پورا کیا اور آپ کو دشمن کے قبضہ میں جانے سے بچالیا اور اسے اس طرح اندھا کر دیا کہ وہ آپ ؐ کے قریب پہنچ کر خائب وخاسر لوٹ گیا۔

یہ وہ توکّل ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ حضرت موسیٰؑ سے بھی ایک موقع پر اس قسم کے توکّل کی نظیر ملتی ہے لیکن وہ مثال اس سے بہت ہی ادنیٰ ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں نے فرعونیوں کو دیکھ کر کہا کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ہم ضرور گرفتار ہو جائیں گے اس پر حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (الشعراء: ۶۳) لیکن رسول کریم ﷺ کا توکّل ایسا کامل تھا کہ اس نے آپ ؐ کے ساتھی پر بھی اثر ڈالا اور حضرت ابوبکرؓ نے موسائیوں کی طرح گھبرا کر یہ نہیں کہا کہ ہم ضرور پکڑے جائیں گے بلکہ یہ کہا کہ اگر وہ نیچی نظر کریں تو دیکھ لیں۔ اور یہ ایمان اس پَرتو کا نتیجہ تھا جو نورِ نبوت اس وقت آپ کے دل پر ڈال رہا تھا۔ دوسرے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ فوج تھی اور ان کے آگے بھاگنے کی جگہ ضرور موجود تھی لیکن رسول کریم ؐ کے ساتھ نہ کوئی جماعت تھی اور نہ آپ ؐ کے سامنے کوئی اور راستہ تھا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے فرق ہیں جو طوالت کی وجہ سے میں اس جگہ بیان نہیں کرتا۔

آپ ؐ کی ایک دعا

رسول کریم ؐ کو خدا تعالیٰ پر ایسا توکّل تھا کہ ہر مصیبت اور مشکل کے وقت اسی پر نظر رکھتے اور اس کے سوا ہر شے سے توجہ ہٹا لیتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ؐ آجکل کے صوفیاء کی طرح اسباب کے تارک نہ تھے کیونکہ اسباب کا ترک گویا خدا تعالیٰ کی مخلوق کی ہتک کرنا اور اس کی پیدائش کو لغو قرار دینا ہے۔ لیکن اسباب کے مہیا کرنے کے بعد آپ ؐ بکلی خدا تعالیٰ پر توکّل کرتے اور گو اسباب مہیا کرتے لیکن ان پر بھروسہ اور توکّل کبھی نہ کرتے تھے اور صرف خدا ہی کے فضل کے امیدوار رہتے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ ؐ ہر ایک گھبراہٹ کے وقت فرماتے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ

وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (بخاری جلد ۲ کتاب الدعوات باب الدعاء عند الکرب) کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے وہ رب ہے بڑے تخت حکومت کا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ آسمانوں کا رب ہے وہ زمین کا رب ہے۔ وہ بزرگ تخت کا رب ہے (یعنی میرا بھروسہ اور توکّل تو اسی پر ہے)۔

اپنی اولاد کو صدقہ سے محروم کردیا

اسلام کے عظیم الشان احکام میں سے زکوٰۃ اور صدقہ کے احکام ہیں۔ ہر مسلمان پر جس کے پاس چالیس سے زائد روپے ہوں اور ان پر سال گزر جائے فرض ہے کہ ان میں سے چالیسواں حصہ وہ خدا کی راہ میں دے دے۔ یہ مال محتاجوں اور غریبوں پر خرچ کیا جاتا ہے اور وہ لوگ جو کسی سبب سے اپنی حوائج کو پورا کرنے سے قاصر ہوں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں یا ابناء السبیل کو مدد دی جاتی ہے۔ اس کے محصلوں کی تنخواہ بھی اس میں سے ہی نکلتی ہے غرض کہ محتاجوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے شریعت اسلام نے یہ قاعدہ جاری کیا ہے اور اس میں بہت سے ظاہری اور باطنی فوائد مدِّ نظر ہیں لیکن اس کا ذکر بے موقع ہے۔ زکوٰۃ کے علاوہ جو ایک وقت مقررہ پر سرکار کے خزانہ میں داخل ہو کر غرباء میں تقسیم کئے جانے کا حکم ہے صدقہ کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ ہر ایک ذی استطاعت کو مناسب ہے کہ وہ اپنے طور پر اپنے غریب بھائیوں کی دستگیری کرے اور حتی الوسع ان کی امداد میں دریغ نہ کرے۔

رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں اور بعد میں بھی جب تک اسلامی حکومت رہی چونکہ زکوٰۃ باقاعدہ وصول کی جاتی تھی اس لئے ایک کثیر رقم جمع ہو جاتی تھی اور خزانہ شاہی کی ایک بہت بڑی مد تھی اور اگر رسول کریمؐ چاہتے تو اپنی اولاد کے غرباء کا اس رقم میں سے ایک خاص حصہ مقرر کر سکتے تھے جس کی وجہ سے سادات ہمیشہ غربت سے بچ جاتے اور افلاس کی مصیبت سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتے لیکن رسول کریمؐ کے سینہ میں وہ دل تھا جو توکّل علی اللہ سے پر تھا اور آپ کی توجہ غیر اللہ کی طرف پھرتی ہی نہ تھی اس قدر رقم کثیر خزانہ میں آتی تھی۔ اور تھی بھی غرباء کے لئے۔ کسی کا حق نہ تھی کہ اس کی تقسیم ظلم سمجھی جاتی۔ ایسی حالت میں اگر آپ اپنی اولاد کے لئے بصورت غربت ایک حصہ مقرر کر جاتے تو یہ بات نہ لوگوں کے لئے قابل اعتراض ہوتی اور نہ کسی پر ظلم ہوتا۔ لیکن وہ باغیرت دل جو آپؐ کے سینہ میں تھا اور وہ متوکل قلب جو آپ رکھتے تھے کب برداشت کر سکتا تھا کہ آپ صدقہ وزکوٰۃ پر اپنی اولاد کے لئے صورت گزارہ مقرر کرتے۔ پھر آپ کو تو یقین تھا کہ خدا تعالیٰ ان کا متکفّل ہو گا اور خود ان کی مدد کرے گا۔ آپ کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں آسکتا

تھا کہ ان کے لئے کسی سامان کے مہیا کرنے کی مجھے ضرورت ہے اس لئے آپ نے اپنی اولاد کے لئے اس رقم میں سے کوئی حصہ ہی مقرر نہ کیا- اللہ اللہ - ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت ہوتی ہے وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اپنی اولاد اور رشتہ داروں کے لئے کچھ سامان کر جائیں لیکن آپ نے نہ صرف خود ہی اللہ تعالیٰ پر توکل کیا اور اپنی اولاد کے لئے زکوٰۃ میں سے کوئی حصہ نہ مقرر کیا بلکہ ان کو بھی خدا پر توکل کرنے کا سبق سکھایا اور انہیں حکم دے دیا کہ تمہارے لئے اس مال سے فائدہ اٹھانا ہی ناجائز ہے-

زکوٰۃ کے علاوہ جو لوگ اپنے پاس سے صدقات دیتے ہیں ممکن تھا کہ سادات کو وہ اس میں شریک کر لیتے لیکن رسول کریم ﷺ نے اپنی اولاد کو ایسا توکل کا سبق دینا چاہا کہ اسے صدقات سے بھی محروم کر دیا اور زکوٰۃ و صدقہ دونوں کی نسبت حکم دے دیا کہ میری اولاد اور اولاد کی اولاد کے لئے زکوٰۃ و صدقہ لینا ناجائز ہے-

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُؤْتٰی بِالتَّمْرِ عِنْدَ صِرَامِ النَّخْلِ فَیَجِیْءُ ھٰذَا بِتَمْرِہٖ وَھٰذَا مِنْ تَمْرِہٖ حَتّٰی یَصِیْرَ عِنْدَہٗ کَوْمًا مِنْ تَمْرٍ فَجَعَلَ الْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا یَلْعَبَانِ بِذٰلِکَ التَّمْرِ فَاَخَذَ اَحَدُھُمَا تَمْرَۃً فَجَعَلَھَا فِیْ فِیْہِ فَنَظَرَ اِلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَخْرَجَھَا مِنْ فِیْہِ فَقَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ اٰلَ مُحَمَّدٍ لَا یَاْکُلُوْنَ الصَّدَقَۃَ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اخذ صدقۃ التمر عند صرام النخل)

کھجور کے کٹنے کے وقت رسول کریم ﷺ کے پاس کھجوریں لائی جاتی تھیں- ہر ایک اپنی اپنی کھجوریں لاتا تھا اور رسول کریم ﷺ کے آگے رکھ دیتا یہاں تک کہ آپؐ کے پاس ایک ڈھیر ہو جاتا- ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما ان کھجوروں سے کھیلنے لگے اور ان میں سے ایک نے ایک کھجور لی اور اپنے منہ میں ڈال لی- پس ان کی طرف رسول کریمؐ نے دیکھا اور کھجور ان کے منہ سے نکال دی اور فرمایا کہ تجھے علم نہیں کہ آل محمدؐ صدقہ نہیں کھایا کرتے-

اللہ اللہ کیسی احتیاط ہے- کیا ہی توکل ہے ایک کھجور بچے نے منہ میں ڈال لی تو اس میں حرج نہ تھا- لیکن آپؐ کا توکل ایسا نہ تھا جیسا کہ عام لوگوں کا ہوتا ہے- آپؐ چاہتے تھے کہ بچپن سے ہی بچوں کے دلوں میں وہ ایمان اور توکل پیدا کر دیں کہ بڑے ہو کر وہ کبھی صدقات کی طرف توجہ نہ کریں اور خدا کی ہی ذات پر بھروسہ رکھیں-

رسول کریمؐ کی جائداد

نہ صرف یہ کہ رسول کریمؐ نے اپنی اولاد کو صدقہ سے محروم کردیا بلکہ خود بھی کوئی ایسی جائداد نہیں چھوڑی جس سے آپؐ کے بعد آپؐ کی بیویوں اور اولاد کی پرورش اور گزارہ کا انتظام ہو سکتا۔ ممکن تھا کہ یہ خیال کرلیا جاتا کہ گو آپؐ نے اپنی آل کیلئے ہمیشہ کے لئے کوئی سامان نہیں مہیا کیا لیکن اپنے موجودہ رشتہ داروں کے لئے کوئی سامان کردیا۔ لیکن یہ بھی نہیں ہؤا۔ اور جس وقت فوت ہوئے ہیں اس وقت آپؐ کے گھر میں کوئی روپیہ نہیں تھا۔ عمرو بن حرثؓ فرماتے ہیں مَا تَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ مَوْتِهٖ دِرْهَمًا وَلَا دِيْنَارًا وَلَا عَبْدًا وَلَا اَمَةً وَلَا شَيْئًا اِلَّا بَغْلَتَهُ الْبَيْضَاءَ وَ سِلَاحَهٗ وَ اَرْضًا جَعَلَهَا صَدَقَةً (بخاری کتاب الوصایا) رسول کریم ﷺ نے اپنی وفات کے وقت کچھ نہیں چھوڑا نہ کوئی درہم نہ دینار نہ غلام نہ لونڈی اور نہ کچھ اور چیز سوائے اپنی سفید خچر اور اپنے ہتھیاروں کے اور ایک زمین کے جسے آپؐ صدقہ میں دے چکے تھے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ آپؐ کی حیثیت ایک بادشاہ کی تھی اور آپؐ چاہتے تو اپنے رشتہ داروں کے لئے سامان کرسکتے تھے اور کم سے کم اس قدر روپیہ چھوڑ جانا تو آپؐ کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ جس سے آپؐ کی بیویوں اور اولاد کا گزارہ ہو سکے۔

آپؐ کے پاس صرف خزانہ کا روپیہ ہی نہ رہتا تھا کہ جس کا اپنی ذات پر خرچ کرنا آپؐ گناہ تصور فرماتے تھے اور اس کا ایک حبّہ بھی آپؐ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ خود آپؐ کی ذات کے لئے بھی آپکے پاس بہت مال آتا تھا اور صحابہؓ اس اخلاص اور عشق کے سبب جو انہیں آپؐ سے تھا بہت سے تحائف پیش کرتے رہتے تھے اور اگر آپؐ اس خیال سے کہ میرے بعد میرے رشتہ دار کس طرح گزارہ کریں گے ایک رقم جمع کر جاتے تو کرسکتے تھے لیکن آپؐ کے وسیع دل میں جو خدا تعالیٰ کی ہیبت اور اس کے جلال کا جلوہ گاہ تھا۔ جو یقین و معرفت کا خزانہ تھا یہ دنیاوی خیال سما بھی نہیں سکتا تھا۔ جو کچھ آتا آپؐ اسے غرباء میں تقسیم کردیتے اور اپنے گھر میں کچھ بھی نہ رکھتے حتیٰ کہ آپؐ کی وفات نے ثابت کردیا کہ وہ خدا کا بندہ جو دنیا سے نہیں بلکہ خدا سے تعلق رکھتا تھا دنیاوی آلائشوں سے پاک اپنے بھیجنے والے کے پاس چلا گیا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

رسول کریم ﷺ کی نہایت پیاری بیٹی موجود تھیں اور ان کی آگے اولاد تھی اور اولاد کی اولاد اپنی ہی اولاد ہوتی ہے مگر آپؐ نے نہ کوئی مال اپنی بیویوں کے لئے چھوڑا اور نہ اولاد کے لئے۔

ہاں بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ ہماری بیویاں اور اولاد خود دولتمند ہیں۔ ہمیں ان کے گزارہ کی کچھ فکر نہیں مگر یہاں یہ معاملہ بھی نہ تھا آپؐ کی بیویوں کی کوئی ایسی جائداد الگ موجود نہ تھی کہ جس سے وہ اپنا گزارہ کر سکیں نہ ہی آپؐ کی اولاد آسودہ حال تھی کہ جس سے آپ بے فکر ہوں ان کے پاس کوئی جائداد کوئی روپیہ کوئی مال نہ تھا کہ جس پر دنیا سے بے فکر ہو جائیں ایسی صورت میں اگر آپؐ ان لوگوں کے لئے خود کوئی اندوختہ چھوڑ جاتے تو کسی شریعت کسی قانون انسانیت کے خلاف نہ ہوتا اور دنیا میں کسی انسان کا حق نہ ہوتا کہ وہ آپؐ کے اس فعل پر اعتراض کرتا لیکن آپؐ ان جذبات اور خیالات کے ماتحت کام نہیں کرتے تھے جو ایک معمولی آدمی کے دل میں موجزن ہوتے ہیں۔ آپؐ کے محسوسات اور محرکات ہی اور تھے۔ آپؐ نے خدا تعالیٰ کی قدرت اور طاقت کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور اس کے فضلوں کی وسعت کو جانتے تھے۔ آپؐ کو یقین تھا کہ میں اپنے پیچھے اگر مال چھوڑ کر نہیں جاتا تو کچھ حرج نہیں میری وفات کے بعد میرے پسماندگان کا ایک نگران ہے جس پر کبھی موت نہیں آتی جو کبھی غافل نہیں ہوتا جو اپنے پیاروں کو ان کی مصیبتوں کے وقت کبھی نہیں چھوڑتا جو ان کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تیار رہتا اور ضرورتوں کے پیدا ہونے سے پہلے ان کے پورا کرنے کے سامان کر دیتا ہے خدا تعالیٰ کے وسیع خزانوں کو دیکھتے ہوئے آپؐ اس بات کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی پسند نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے پسماندگان کے لئے خود کوئی سامان کر جائیں خدا پر آپکو توکل تھا اور اس پر بھروسہ کرتے تھے اور یہ وہ توکل کا اعلیٰ مقام ہی تھا کہ جس پر قائم ہونے کی وجہ سے دنیاداروں کے خلاف آپؐ کی توجہ بجائے دنیاوی سامانوں کے آسمانی اسباب پر پڑتی تھی۔

مسیلمہ کا دعویٰ

جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں رسول کریمؐ کو کسی کام میں بھی دنیا اور اہل دنیا کی طرف توجہ نہ تھی اور ارضی اسباب کی طرف آپؐ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے بلکہ ہر کام میں آپ کی نظر خدا تعالیٰ ہی کی طرف لگی رہتی کہ وہی کچھ کرے گا گویا کہ توکل کا ایک کامل نمونہ تھے جس کی نظیر نہ پہلے انبیاء میں ملتی ہے نہ آپؐ کے بعد آپؐ کے سے توکل والا کوئی انسان پیدا ہؤا ہے۔

مسیلمہ کے نام سے سب مسلمان واقف ہیں اس شخص نے رسول کریم ﷺ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کی خلافت میں سخت مقابلہ کیا تھا اگرچہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں ہی یہ شخص نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا تھا مگر مقابلہ اور جنگ حضرت ابو بکرؓ کے لشکر ہی سے ہؤا اور ان ہی افواجِ قاہرہ نے اس

کو شکست دی۔ مسیلمہ رسول کریمؐ کی زندگی میں ایک لشکر جرار لے کر آپ کے پاس مدینہ میں آیا اور آپ سے اس بات کی درخواست کی کہ اگر آپ اسے اپنے بعد خلیفہ بنالیں تو وہ اپنی جماعت سمیت آپ کی اتباع اختیار کرلے گا اور اسلام کی حالت چاہتی تھی کہ آپ اس ذریعہ کو اختیار کر لیتے اور اس کی مدد سے فائدہ اٹھالیتے لیکن جس پاک وجود کو خدا تعالیٰ کی طاقت پر بھروسہ اور توکل تھا اور وہ انسانی منصوبوں کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہ کر سکتا تھا آپ نے اس کی درخواست کو فوراً رد کر دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قَدِمَ مُسَيْلِمَةُ الْكَذَّابُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ يَقُوْلُ إِنْ جَعَلَ لِيْ مُحَمَّدٌ الْاَمْرَ مِنْ بَعْدِهٖ تَبِعْتُهٗ وَقَدِمَهَا فِيْ بَشَرٍ كَثِيْرٍ مِنْ قَوْمِهٖ فَاَقْبَلَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهٗ ثَابِتُ ابْنُ قَيْسِ بْنِ شَمَّاسٍ وَ فِيْ يَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِطْعَةُ جَرِيْدٍ حَتّٰى وَقَفَ عَلٰى مُسَيْلِمَةَ فِيْ اَصْحَابِهٖ فَقَالَ لَوْ سَاَلْتَنِيْ هٰذِهِ الْقِطْعَةَ مَا اَعْطَيْتُكَهَا وَلَنْ تَعْدُوَ اَمْرَ اللّٰهِ فِيْكَ وَلَئِنْ اَدْبَرْتَ لَيَعْقِرَنَّكَ اللّٰهُ وَاِنِّيْ لَاَرَاكَ الَّذِيْ اُرِيْتُ فِيْهِ مَا رَاَيْتُ وَهٰذَا ثَابِتٌ يُجِيْبُكَ عَنِّيْ ثُمَّ انْصَرَفَ عَنْهُ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَسَاَلْتُ عَنْ قَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكَ اَرَى الَّذِيْ اُرِيْتُ فِيْهِ مَا رَاَيْتُ فَاَخْبَرَنِيْ اَبُوْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَا اَنَا نَائِمٌ رَاَيْتُ فِيْ يَدِيْ سِوَارَيْنِ مِنْ ذَهَبٍ فَاَهَمَّنِيْ شَاْنُهُمَا فَاُوْحِيَ اِلَيَّ فِي الْمَنَامِ اَنْ اَنْفُخْهُمَا فَنَفَخْتُهُمَا فَطَارَا فَاَوَّلْتُهُمَا كَذَّابَيْنِ يَخْرُجَانِ بَعْدِيْ اَحَدُهُمَا الْعَنْسِيُّ وَالْاٰخَرُ مُسَيْلِمَةُ (بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ و حدیث ثمامۃ بن اُثال)

رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں مسیلمہ کذاب آیا اور کہنے لگا کہ اگر محمد ﷺ اپنے بعد مجھے حاکم مقرر کردیں تو میں ان کا متبع ہو جاؤں اور اس وقت وہ اپنے ساتھ اپنی قوم میں سے ایک جماعت کثیر لایا تھا۔ رسول کریمؐ یہ بات سنکر اس کی طرف آئے اور ثابت ابن قیس ابن شماس رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے اور رسول کریمؐ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ کا ٹکڑا تھا۔ آپ آئے یہاں تک کہ مسیلمہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور وہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے یہ شاخ بھی مانگے تو میں تجھے نہ دوں اور جو کچھ خدا نے تیرے لئے مقدر کیا ہے تو اس سے آگے نہیں بڑھے گا اور اگر تو پیٹھ پھیر کر چلا جائے گا تو اللہ تعالیٰ تیری کونچیں کاٹ دے گا اور میں تو تجھے

وہی شخص پاتا ہوں جس کی نسبت مجھے وہ نظارہ دکھایا گیا تھا جو میں نے دیکھا اور یہ ثابت ہیں میری طرف سے تجھے جواب دیں گے پھر آپ وہاں سے چلے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے پوچھا کہ یہ رسول اللہ ؐ نے کیا فرمایا ہے کہ میں تو تجھے وہی شخص پاتا ہوں جس کی نسبت وہ نظارہ دکھایا گیا تھا جو میں نے دیکھا اس پر مجھے حضرت ابو ہریرہؓ نے بتایا کہ رسول کریم ؐ نے فرمایا تھا کہ ایک دفعہ میں سو رہا تھا کہ میں نے دیکھا میرے دونوں ہاتھوں میں دو کڑے ہیں جو سونے کے ہیں ان کا ہونا مجھے کچھ ناپسند سا معلوم ہؤا اس پر مجھے خواب میں وحی نازل ہوئی کہ میں ان پر پھونکوں جب میں نے پھونکا تو وہ دونوں اڑ گئے۔ پس میں نے تعبیر کی کہ دو جھوٹے ہوں گے جو میرے بعد نکلیں گے ایک تو عنسی ہے اور دوسرا مسیلمہ۔

اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو خدا تعالیٰ پر کیسا یقین تھا اور آپ خدا تعالیٰ کی مدد پر کیسے مطمئن تھے۔ آپ کے چاروں طرف کافروں کا زور تھا جو ہر وقت آپ کو دکھ دیتے اور ایذاء پہنچانے میں مشغول رہتے تھے اور جن جن ذرائع سے ممکن ہوتا آپ کو تکلیف پہنچاتے تھے۔ قیصر و کسریٰ بھی اپنے اپنے حکام کو آپ کے مقابلہ کے لئے احکام پر احکام بھیج رہے تھے بنی غسان لڑنے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے ایرانی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو حسد و حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ہر ایک حکومت اس نئی تحریک پر شک و شبہ کی نگاہیں ڈال رہی تھی۔ ایسے وقت میں جب تک ایک لشکر جرار آنحضرت ؐ کے ارد گرد جمع نہ ہوتا آپ کے لئے اپنے دشمنوں کی زد سے بچنا بظاہر مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا تھا مدینہ منورہ سے لے کر مکہ مکرمہ تک کی فتوحات نے آپ کو ہر ایک آس پاس کی حکومت کے مدمقابل کھڑا کر دیا تھا اور دوربین نگاہیں ابتداءِ امر میں ہی اس بڑھنے والی طاقت کو تباہ کر دینے کی فکر میں تھیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ طاقت اگر اور زیادہ بڑھ گئی تو ہمارے بڑے بڑے قصور محلات کی اینٹ سے اینٹ بجادے گی پھر آنحضرت ؐ ان عظیم الشان مظاہروں کے مقابلہ کے لئے جو کچھ بھی تیاری کرتے کم تھی۔ انسانی عقل ایسی حالت میں جس طرح دوست و دشمن کو اپنے ساتھ ملانا چاہتی ہے اور جن جن تدابیر سے غیروں کو بھی اپنے اندر شامل کرنا چاہتی ہے وہ تاریخ کے پڑھنے والوں کو آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔

لیکن وہ میرا پیارا زمینی نہیں بلکہ آسمانی تھا۔ بڑھتے ہوئے لشکر اور دوڑتے ہوئے گھوڑے۔ اٹھتے ہوئے نیزے اور چمکتی ہوئی تلواریں اس کی آنکھوں میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی تھیں وہ ملائکہ آسمانی کا نزول دیکھ رہا تھا اور زمین و آسمان کا پیدا کنندہ اس کے کان میں ہر دم تسلی آمیز کلام

ڈال رہا تھا اس کا دل یقین سے پر اور سینہ ایمان سے معمور تھا- غرضیکہ بجائے دنیاوی اسباب پر بھروسہ کرنے کے اس کا توکل خدا پر تھا- پھر بھلا ان مصائب سے وہ کب گھبرا سکتا تھا اس نے مسیلمہ اور اس کے لشکر پر بھروسہ کرنا ایک دم کے لئے بھی مناسب نہ جانا اور صاف کہہ دیا کہ خلافت کا دھوکہ دے کر تجھے اپنے ساتھ ملانا اور تیری قوم کی اعانت حاصل کرنی تو علیحدہ امر ہے ایک کھجور کی شاخ کے بدلہ میں بھی اگر تیری حمایت حاصل کرنی پڑے تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں-

اس غیور دل کی حالت پر غور کرو- اس متوکل انسان کی شان پر نظر ڈالو- اس یقین سے پر دل کی کیفیت کا احساس اپنے دلوں کے اندر پیدا کر کے دیکھو کہ کس یقین اور توکل کے ماتحت وہ مسیلمہ کو جواب دیتا ہے کیا کوئی بادشاہ ایسے اوقات میں اس جرأت اور دلیری کو کام میں لا سکتا ہے کیا تاریخ کسی گوشت اور پوست سے بنے ہوئے انسان کو ایسے مواقع میں سے اس سلامتی سے نکلتا ہؤا دکھا سکتی ہے اگر نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ آپ کی زندگی سے مقابلہ کرنا ہی غلط ہے کیونکہ آپ نبی تھے اگر آپؐ کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو انبیاءؑ سے مگر جو شان آپؐ کو حاصل ہے اس کی نظیر انبیاء میں بھی نہیں مل سکتی کیونکہ آپؐ کو سب انبیاء پر فضیلت ہے-

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیلمہ کو جواب دیتے وقت رسول کریم ﷺ کے یہ مد نظر نہ تھا کہ آپ حکومت کے حق کو اپنی اولاد کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ کا انکار توکل علی اللہ کے باعث نہیں بلکہ اپنی اولاد کی محبت کی وجہ سے قرار دیا جاتا لیکن رسول کریمؐ نے اپنی اولاد کو اپنے بعد اپنا جانشین نہیں بنایا بلکہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کی طرف اشارہ فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا انکار کسی دنیاوی غرض کے لئے نہ تھا بلکہ ایک بے پایاں یقین کا نتیجہ تھا-

اسی طرح یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیلمہ کذاب کی مدد حاصل کرنا بظاہر مذہبی لحاظ سے بھی مضر نہ تھا کیونکہ اگر وہ یہ شرط پیش کرتا کہ میں آپ کی اتباع اس شرط پر کرتا ہوں کہ آپ فلاں فلاں دینی باتوں میں میری مان لیں تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ اپنی بات کی پیچ کی وجہ سے آپ نے اس کے مطالبہ کا انکار کر دیا لیکن اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے معلوم ہو کہ وہ مذہب میں تبدیلی چاہتا تھا- پس آپ کا انکار صرف اس توکل اور یقین کا نتیجہ تھا جو آپ کو خدا تعالیٰ پر تھا-

ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آپ اگر چاہتے تو اس وقت مسیلمہ کو پکڑ کر مروا دیتے کیونکہ گو وہ ایک کثیر جماعت کے ساتھ آیا تھا مگر پھر بھی مدینہ میں تھا اور آپ کے ہاتھ کے نیچے

لیکن اس معاملہ میں بھی آپ نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا کہ وہ خود اس موذی کو ہلاک کرے گا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَ سَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اخلاص باللہ۔ یادِ الٰہی

خدا تعالیٰ کے ذکر پر آپ کو جوش آجاتا

رسول کریمؐ کی عادت تھی کہ بہت آرام اور آہستگی سے کلام کرتے تھے اور آپ کے کلام میں جوش نہ ہوتا تھا بلکہ بہت سہولت ہوتی تھی لیکن آپ کی یہ بھی عادت تھی کہ جہاں خدا تعالیٰ کا ذکر آتا آپ کو جوش آجاتا تھا اور آپ کی عبارت میں ایک خاص شان پیدا ہو جاتی تھی۔ چنانچہ احادیث کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ذکر کے آتے ہی آپ کو جوش آجاتا تھا اور آپ کے لفظ لفظ سے معلوم ہوتا تھا کہ عشق الٰہی کا دریا آپ کے اندر لہریں مار رہا ہے آپ کے کلام کو پڑھ کر محبت کی ایسی لپٹیں آتیں کہ پڑھنے والے کا دماغ معطر ہو جاتا۔ اللہ اللہ آپؐ صحابہؓ میں بیٹھ کر کس پیار سے باتیں کرتے ہیں ان کی دلجوئی کرتے ہیں انکی شکایات کو سنتے ہیں۔ پھر صحابہ ہی کا کیا ذکر ہے کافر و مؤمن آپ کی ہمدردی سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور ہر ایک تکلیف میں آپؐ مہربان باپ اور محبت کرنے والی ماں سے زیادہ ہمدرد و مہربان ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں جہاں اس کا اور غیر کا مقابلہ ہو جائے آپ بے اختیار ہو جاتے ہیں محبت ایسا جوش مارتی ہے کہ رنگ ہی اور ہو جاتا ہے۔ سننے والے کا دل ایک ایسی وابستگی پاتا ہے کہ آپؐ ہی کا ہمرنگ ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی وہ عظمت بیان کرتے ہیں کہ دل بے اختیار اس پر قربان ہونا چاہتا ہے وہ ہیبت بیان کرتے ہیں کہ بدن کانپ اٹھتا ہے وہ جلال بیان کرتے ہیں کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ایسا خوف دلاتے ہیں کہ مؤمن انسان کا دل تو خوف کے مارے پگھل ہی جاتا ہے پھر ایسی شفقت و محبت کا بیان کرتے ہیں کہ ٹوٹے ہوئے دل جڑ جاتے ہیں اور گری ہوئی ہمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اللہ اللہ آپؐ کے عام کلام کا مقابلہ اگر اس کلام سے کریں کہ جس میں بندوں کو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق معلوم دیتا ہے گویا خدا تعالیٰ کا ذکر آتے ہی آپؐ کا روآں روآں اس کی طرف جھک جاتا ہے اور ذرہ ذرہ اس کے احسانات کو یاد کرنے لگتا ہے اور زبان ان کی ترجمان ہوتی ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریمؐ سے سنا کہ

فرماتے تھے اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَ بَیْنَھُمَا مُشْبِھَاتٌ لَا یَعْلَمُھَا کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَی الشُّبْھَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَلِعِرْضِہٖ وَدِیْنِہٖ وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبْھَاتِ کَرَاعٍ یَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِکُ اَنْ یُّوَاقِعَہٗ اَلَا وَ اِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی اَلَا وَ اِنَّ حِمَی اللّٰہِ فِیْ اَرْضِہٖ مَحَارِمُہٗ اَلَا وَ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ (بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرا لدینہ) حلال بھی بیان ہو چکا ہے اور حرام بھی بیان ہو چکا اور ان دونوں کے درمیان کچھ ایسی چیزیں ہیں کہ مشابہ ہیں انہیں اکثر لوگ نہیں جانتے پس جو کوئی شبہات سے بچے اس نے اپنی عزت اور دین کو بچالیا اور جو کوئی ان شبہات میں پڑ گیا اس کی مثال ایک چرواہے کی ہے جو بادشاہ کی رکھ کے ارد گرد اپنے جانوروں کو چراتا ہے قریب ہے کہ اپنے جانوروں کو اندر ڈال دے۔ خبردار ہر ایک بادشاہ کی ایک رکھ ہوتی ہے خبردار اللہ کی رکھ اس کی زمین میں اس کے محارم ہیں۔ خبردار جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جائے تو سب جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو سب جسم خراب ہو جاتا ہے۔ خبردار اور وہ گوشت کا ٹکڑا قلب ہے۔

اس عبارت کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے دل میں اس وقت اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک دریا امڈ رہا تھا۔ آپ دیکھتے تھے کہ ایک دنیا اس پاک ہستی کے احکام کو توڑ رہی ہے اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے محترز ہے لوگ اپنے نفوس کے احکام کو مانتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ کے ارشادات کی تعمیل نہیں کرتے۔ پھر آپؐ کو خدا تعالیٰ سے جو محبت تھی اس کے رو سے آپ کب برداشت کر سکتے تھے کہ لوگ اس پیارے رب کو چھوڑ دیں۔ ان خیالات نے آپؐ پر یہ اثر کیا کہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی عظمت کا ذکر کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ دنیاوی بادشاہوں کی اطاعت کے بغیر انسان سکھ نہیں پا سکتا تو پھر اس قادر مطلق کی نافرمانی پر کب سکھ پا سکتا ہے جو سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

میں جب مذکورہ بالا حدیث کو پڑھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ آپؐ کس جوش کے ساتھ خدا کو یاد کرتے ہیں بناوٹ سے یہ کلام نہیں نکل سکتا اس خالص محبت کا ہی نتیجہ تھا جو آپؐ خدا سے رکھتے تھے کہ خدا تعالیٰ کے ذکر پر آپؐ کو اس قدر جوش آجاتا اور آپؐ چاہتے کہ کسی طرح لوگ ان نافرمانیوں کو چھوڑ دیں اور خدا تعالیٰ کی اطاعت میں لگ جائیں۔ اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو حیرت تھی کہ لوگ کیوں اس طرح دلیری سے ایسے کام کر لیتے ہیں جن

سے خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا خوف ہو۔

جس کام میں کسی حاکم کی ناراضگی کا خیال ہو۔ لوگ اس کے کرنے سے بچتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کوئی خوف نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ اس کی نافرمانی سے کچھ نقصان نہ ہو گا لیکن رسول کریمؐ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی ہی اصل ناراضگی ہے اور انسان کو چاہئے کہ نہ صرف گناہوں سے بچے بلکہ ان کاموں سے بھی بچے کہ جن کے کرنے میں شک ہو کہ یہ جائز ہیں یا ناجائز کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ان کاموں کے کرنے پر ہلاک ہو جائے اور وہ اسے خدا تعالیٰ کے رحم کے استحقاق سے محروم کر دیں۔ خدا تعالیٰ کے نام پر یہ جوش اور اس قدر اظہار خوف و محبت ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ کے دل میں محبت الٰہی اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہ ہر ایک انسان کی طاقت ہی نہیں کہ اس کا اندازہ بھی کر سکے۔

ذکرِ الٰہی کی تڑپ

پچھلی مثال سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاد الٰہی کے وقت آپ ﷺ کو کس قدر جوش آتا اور کس قدر محبت سے مجبور ہو کر آپؐ کے کلام میں خاص شان پیدا ہو جاتی تھی۔ اب میں ایک اور واقعہ بتاتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی یاد کا نہایت ہی شوق تھا اور آپؐ عبادات کے بجالانے میں کَمَاحَقُّہٗ مشغول رہتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو بوجہ سخت ضعف کے نماز پڑھانے پر قادر نہ تھے اس لئے آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ جب حضرت ابو بکرؓ نے نماز پڑھانی شروع کی تو آپؐ نے کچھ آرام محسوس کیا اور نماز کے لئے نکلے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ فَوَجَدَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ نَّفْسِہٖ خِفَّۃً فَخَرَجَ یُھَادٰی بَیْنَ رَجُلَیْنِ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ رِجْلَیْہِ تَخُطَّانِ الْاَرْضَ مِنَ الْوَجْعِ فَاَرَادَ اَبُوْبَکْرٍ اَنْ یَّتَاَخَّرَ فَاَوْمَاَ اِلَیْہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ مَکَانَکَ ثُمَّ اُتِیَ بِہٖ حَتّٰی جَلَسَ اِلٰی جَنْبِہٖ وَکَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ وَاَبُوْبَکْرٍ یُصَلِّیْ بِصَلَاتِہٖ وَالنَّاسُ یُصَلُّوْنَ بِصَلَاۃِ اَبِیْ بَکْرٍ (بخاری کتاب الآذان باب حد المریض ان یشھد الجماعۃ) کہ حضرت ابو بکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دینے کے بعد جب نماز شروع ہو گئی تو آپؐ نے مرض میں کچھ خفت محسوس کی پس آپؐ نکلے کہ دو آدمی آپ کو سہارا دے کر لے جارہے تھے اور اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ نظارہ ہے کہ شدت درد کی وجہ سے آپؐ کے قدم زمین سے چھوتے جاتے تھے۔ آپؐ کو دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے ارادہ کیا کہ پیچھے ہٹ آئیں۔ اس ارادہ کو معلوم کر کے رسول کریم ﷺ نے

ابوبکرؓ کی طرف اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہ پر رہو۔ پھر آپؐ کو وہاں لایا گیا اور آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے پاس بیٹھ گئے اس کے بعد رسول کریمؐ نے نماز پڑھنی شروع کی اور حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھنی شروع کی اور اور باقی لوگ حضرت ابوبکرؓ کی نماز کی اتباع کرنے لگے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کیسی ہی خطرناک بیماری ہو خدا تعالیٰ کی یاد کو نہ بھلاتے۔ عام طور پر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ذرا تکلیف ہوئی اور سب عبادتیں بھول گئیں اور نماز باجماعت اور دوسرے شرائط کی ادائیگی میں تو اکثر کوتاہی ہو جاتی ہے لیکن آپؐ کا یہ حال تھا کہ معمولی بیماری تو الگ رہی اس مرض میں کہ جس میں آپؐ فوت ہو گئے اور جس کی شدت کا یہ حال تھا کہ آپؐ کو بار بار غش آجاتے تھے اٹھنے سے قاصر تھے لیکن جب نماز شروع ہو گئی تو آپؐ برداشت نہ کر سکے کہ خاموش بیٹھ رہیں اسی وقت دو آدمیوں کے کاندھے پر سہارا لے کر باوجود اس کمزوری کے قدم لڑکھڑاتے جاتے تھے نماز باجماعت کے لئے مسجد میں تشریف لے آئے۔ بے شک ظاہراً یہ بات معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا رسول کریمؐ کی اس حالت کو دیکھو جس میں آپؐ مبتلا تھے پھر اس ذکر الٰہی کے شوق کو دیکھو کہ جس کے ماتحت آپؐ نماز کے لئے دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر تشریف لائے تو معلوم ہو گا کہ یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ آپؐ کے دل میں ذکر الٰہی کا جوش تھا اس کے اظہار کا ایک آئینہ تھا۔ ہر ایک صاحب بصیرت سمجھ سکتا ہے کہ ذکر الٰہی آپؐ کی غذا تھی اور اس کے بغیر آپؐ اپنی زندگی میں کوئی لطف نہ پاتے تھے۔ اسی کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا ہے کہ جن چیزوں سے مجھے محبت ہے ان میں سے ایک قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ یعنی نماز میں میری آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ شریعت کے لحاظ سے آپؐ کا باجماعت نماز پڑھنا یا مسجد میں آنا کوئی ضروری امر نہ تھا کیونکہ بیماری میں شریعت اسلام کسی کو ان شرائط کے پورا کرنے پر مجبور نہیں کرتی لیکن یہ عشق کی شریعت تھی یہ محبت کے احکام تھے بے شک شریعت آپؐ کو اجازت دیتی تھی کہ آپؐ گھر میں ہی نماز ادا فرماتے لیکن آپؐ کو ذکر الٰہی سے جو محبت تھی وہ مجبور کرتی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو آپؐ ہر ایک تکلیف برداشت کر کے تمام شرائط کے ساتھ ذکر الٰہی کریں اور اپنے پیارے کو یاد کریں جب اس تکلیف کی حالت میں آپؐ کو ذکر الٰہی سے یہ وابستگی تھی تو صحت کی حالت میں قیاس کیا جا سکتا ہے۔

میں پیچھے لکھ چکا ہوں کہ رسول کریمؐ کو اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق تھا کہ خدا تعالیٰ کا ذکر آتے ہی آپؐ کے اندر ایک جوش پیدا ہو جاتا اور یہ کہ آپؐ کو خدا تعالیٰ سے ایسی محبت تھی کہ تندرستی

اور بیماری میں خدا تعالیٰ کا ذکر ہی آپؐ کی غذا تھا۔ اب میں ایک اور واقعہ یہاں درج کرتا ہوں جس سے معلوم ہو گا کہ آپؐ جہاں تک ہو سکتا لوگوں میں خدا تعالیٰ کے ذکر کی عادت پیدا کرتے۔

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ذَهَبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰی بَنِیْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ لِيُصْلِحَ بَيْنَهُمْ فَحَانَتِ الصَّلٰوةُ فَجَاءَ الْمُؤَذِّنُ اِلٰی اَبِیْ بَكْرٍ فَقَالَ اَتُصَلِّیْ لِلنَّاسِ فَاُقِيْمُ قَالَ نَعَمْ فَصَلّٰی اَبُوْبَكْرٍ فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ فِی الصَّلٰوةِ فَتَخَلَّصَ حَتّٰی وَقَفَ فِی الصَّفِّ فَصَفَّقَ النَّاسُ وَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ لَا يَلْتَفِتُ فِیْ صَلٰوتِهٖ فَلَمَّا اَكْثَرَ النَّاسُ التَّصْفِيْقَ اِلْتَفَتَ فَرَاٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَشَارَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنِ امْكُثْ مَكَانَكَ فَرَفَعَ اَبُوْبَكْرٍ يَدَيْهِ فَحَمِدَ اللّٰہَ عَلَيْهِ مَا اَمَرَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ ذٰلِكَ ثُمَّ اسْتَاْخَرَ اَبُوْبَكْرٍ حَتّٰی اسْتَوٰی فِی الصَّفِّ وَتَقَدَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰی فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ يَا اَبَا بَكْرٍ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَثْبُتَ اِذْ اَمَرْتُكَ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ مَا كَانَ لِابْنِ اَبِیْ قُحَافَةَ اَنْ يُّصَلِّیَ بَيْنَ يَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالِیْ رَاَيْتُكُمْ اَكْثَرْتُمُ التَّصْفِيْقَ مَنْ رَابَهٗ شَیْءٌ فِیْ صَلٰوتِهٖ فَلْيُسَبِّحْ فَاِنَّهٗ اِذَا سَبَّحَ الْتُفِتَ اِلَيْهِ وَاِنَّمَا التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَاءِ (بخاری کتاب الآذان باب من دخل لیئوم الناس) رسول کریم ﷺ بنی عمرو بن عوف میں گئے تاکہ ان میں صلح کروائیں پس نماز کا وقت آگیا اور مؤذّن حضرت ابو بکرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ کیا آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھوائیں گے۔ میں اقامت کہوں آپ نے جواب دیا کہ ہاں پھر حضرت ابو بکرؓ نماز کیلئے کھڑے ہوئے اتنے میں رسول کریمؐ تشریف لے آئے اور لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپؐ صف چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور پہلی صف میں جا کر کھڑے ہو گئے جب آپؐ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو لوگ تالیاں پیٹنے لگے (تا حضرت ابو بکرؓ کو معلوم ہو جائے) لیکن حضرت ابو بکرؓ نماز میں دوسری طرف کچھ توجہ نہ فرماتے جب تالیاں پیٹنا طول پکڑ گیا تو آپ متوجہ ہوئے اور معلوم کیا کہ رسول کریمؐ تشریف لائے ہیں رسول کریم ﷺ نے آپؓ کی طرف اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو اس پر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور اس عزت افزائی پر خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور حمد کی پھر آپؓ پیچھے ہٹ گئے اور صف میں مل گئے اور رسول کریم ﷺ آگے بڑھے اور نماز پڑھائی۔ سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کہ اے ابو بکرؓ جب میں نے حکم دیا تھا تو پھر آپ رضی اللہ عنہ کو کونسی چیز مانع ہوئی کہ نماز پڑھاتے رہتے۔ حضرت ابو بکرؓ نے

جواب دیا کہ ابن ابی قحافہ کی کیا حیثیت تھی کہ رسول کریمؐ کے آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھاتا (ابو قحافہ حضرت ابو بکرؓ کے والد تھے) پھر آپ نے (لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر) فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ تم لوگوں نے اس قدر تالیاں پیٹیں۔ جسے نماز میں کوئی حادثہ پیش آئے اسے چاہیے کہ سبحان اللہ کہے کیونکہ جب وہ سبحان اللہ کہے گا تو خود ہی اسکی طرف توجہ ہو گی اور تالیاں پیٹنا تو عورتوں کا کام ہے۔

اس حدیث سے اگرچہ اور بہت سے سبق ملتے ہیں لیکن اس جگہ مجھے صرف ایک امر کی طرف متوجہ کرنا ہے اور وہ یہ کہ آنحضرتؐ کی تمام عمر کی کوشش یہی تھی کہ جس جس طرح سے ہو سکے لوگوں کی زبان پر خدا کا نام جاری کیا جائے۔ خود تو جس طرح آپؐ ذکر میں مشغول رہتے اس کا حال میں بیان کر چکا ہوں مگر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر ایک کی زبان پر یہی لفظ دیکھنا چاہتے تھے۔

آپؐ کی آمد کی اطلاع دینے کے لئے اگر صحابہؓ نے تالیاں بجائیں تو یہ ان کا ایک رواج تھا اور ہر ایک ملک میں اطلاع عام کے لئے یا متوجہ کرنے کے لئے لوگ تالیاں بجاتے ہیں آج کل بھی جلسوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کسی لیکچرار کی کوئی بات پسند آئے تو اس پر تالیاں پیٹتے ہیں تاکہ لوگوں کو توجہ پیدا ہو کہ یہ حصۂ لیکچر خاص توجہ کے قابل ہے پس تالیاں بجانا اس کام کے لئے رائج ہے لیکن رسول کریمؐ کی یاد الٰہی سے محبت دیکھو کہ آپؐ نے دیکھا کہ بعض دفعہ ضرورت تو ہوتی ہے کہ لوگوں کو کسی کام کی طرف متوجہ کیا جائے پھر کیوں نہ اس ضرورت کے موقع پر بجائے اس بے معنی حرکت کے لوگوں کو اس طرف لگا دیا جائے کہ وہ اپنے خیالات اور جوشوں کے اظہار کے لئے بجائے تالیاں بجانے کے سبحان اللہ کہہ دیا کریں۔ کم سے کم ایسے موقع پر ہی خدا کا ذکر ان کی زبان پر جاری ہو گا۔

یہ وہ حکمت و فلسفہ ہے جسے دنیا کے کسی رہنما اور رہادی نے نہیں سمجھا اور کوئی مذہب نہیں جو اس حکم کی نظیر پیش کر سکے کہ اس نے بھی بجائے لغویات کے لوگوں کو ایسی تعلیم کی طرف متوجہ کیا ہو کہ جو ان کے لئے مفید ہو سکے تالیاں بجانا بے شک جذبات انسانی کا ترجمان تو ہو سکتا ہے لیکن وہ ایسا ہی ترجمان ہے کہ جیسے ایک گونگے کے خیالات کا ترجمہ اس کے اشارات ہو جاتے ہیں کیونکہ تالیاں بجانے سے صرف اسی قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی جوش ہے اور یہ اس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہے یا یہ کہ کسی کو غلطی پر دیکھ کر اسے اس کی غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا

ہے لیکن اس سے زیادہ اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا لیکن رسول کریم ﷺ صرف اسی پر اکتفا نہ کر سکتے تھے آپ ایک طرف تو کُل لغویات کو مٹانا چاہتے تھے دوسری طرف آپ کے دل میں یہ جوش موجزن رہتا کہ خدا تعالیٰ کے نام کی کثرت ہو اور ہر ایک مجلس اور مقام میں اسی کا ذکر کیا جائے اس لئے آپ نے بجائے ان بے معنی اشارات کے جن سے گو اشارۃً حصول مطلب ہو جاتا تھا ایسے الفاظ مقرر کئے کہ جن سے نہ صرف حصول مطلب ہوتا ہے بلکہ انسان کی روحانیت میں ازدیاد کا باعث ہے اور عین موقع کے مناسب ہیں اور پھر خدا تعالیٰ کا ذکر بھی ہو جاتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان جب کبھی کسی شَے کی طرف توجہ کرتا ہے اسے ناپسند کرنے کی وجہ سے یا پسندیدگی کے باعث۔ تو ان دونوں صورتوں میں سبحان اللہ کے کلمہ کا استعمال نہایت باموقع اور بامحل ہے۔ اگر کسی انسان کے کسی فعل کو ناپسند کرتا ہے تو سبحان اللہ اس لئے کہتا ہے کہ آپ سے کوئی سہو ہؤا ہے۔ سہو سے تو صرف خدا کی ہی ذات پاک ہے ورنہ ہر ایک انسان سے سہو ممکن ہے۔ اس مفہوم کو سمجھ کر آدمی اپنی غلطی پر متنبہ ہو جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی شخص کوئی عمدہ کام کرے تو اس میں بھی سبحان اللہ کہا جاتا ہے جس کی یہ غرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام نقصوں سے پاک ہے اور جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اسے بھی پاک ہی پیدا کیا ہے یہ کام جو کسی سے سرزد ہؤا ہے یا یہ قول جو کسی کی زبان پر جاری ہؤا ہے اپنی خوبی اور حسن میں خدا تعالیٰ کی پاکیزگی اور طہارت یاد دلاتا ہے جو تمام خوبیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

غرض کہ سبحان اللہ کا کلمہ اس ضرورت کو پورا کرتا ہے جس کے لئے توجہ دلائی جاتی ہے اور افسوس اور خوشی دونوں کا اظہار اس سے ایسی عمدگی سے ہوتا ہے جو اور کسی کلمہ سے نہیں ہو سکتا۔ پس اس کلمہ کے مقابلہ میں تالیاں بجانا اور سیٹیاں مارنا بالکل لغو اور بے فائدہ ہے اور ان لغو حرکات کے مقابلہ پر ایسا پاک کلمہ رکھ دینا رسول کریمؐ کی ہی پاک طبیعت کا کام تھا ورنہ ہزاروں سال سے اس لغو حرکت کو روکنے کی کسی اور کے دل میں تحریک نہیں ہوئی ہاں صرف رسول کریمؐ ہی ہیں جو اس نکتہ تک پہنچے اور آپؐ نے ایسے موقع پر خدا تعالیٰ کا نام لینے کی تعلیم دے کر ثابت کر دیا ہے کہ آپؐ ہر ایک موقع پر خدا تعالیٰ کا ذکر کرنا پسند فرماتے اور اسی کا ذکر آپؐ کے لئے غذا تھا۔

اس واقعہ کے علاوہ اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ چاہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کا ذکر زیادہ کیا جائے چنانچہ چھینک پر' کھانا شروع کرتے وقت' پھر ختم ہونے کے بعد' سوتے وقت' جاگتے وقت' نمازوں کے بعد' کوئی بڑا کام کرتے وقت' وضو کرتے وقت غرضیکہ اکثر

اعمال میں آپ نے خدا تعالیٰ کے ذکر کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف خود ہی ذکر الٰہی میں زیادہ مشغول رہتے تھے بلکہ دوسروں سے بھی چاہتے تھے کہ وہ بھی یاد الٰہی میں مشغول رہیں جو کہ آپؐ کے کمال محبت پر دال ہے۔

میں نے بہت آدمی دیکھے ہیں کہ ذرا عبادت کی اور مغرور ہو گئے چند دن کی نمازوں یا عبادتوں کے بعد وہ اپنے آپ کو فرعون بے سامان یا فخر اولیاء سمجھنے لگتے ہیں اور دنیا و مافیہا ان کی نظروں میں حقیر ہو جاتی ہے بڑے سے بڑے آدمی کی حقیقت کچھ نہیں جانتے بلکہ انسان کا تو کیا کہنا ہے خدا تعالیٰ پر بھی اپنا احسان جتاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو عبادات ہم نے کی ہیں گویا خدا تعالیٰ پر احسان کیا ہے اور وہ ہمارا ممنون ہے کہ ہم نے اس کی عبادت کی ورنہ اگر عبادت نہ کرتے تو وہ کیا کر لیتا جو لوگ اس طرز کے نہیں ہوتے ان میں سے بھی اکثر ایسے دیکھے گئے ہیں کہ عبادت کر کے کچھ تکبر ضرور آجاتا ہے اور بہت ہی کم ہیں کہ جو عبادت کے بعد بھی اپنی حالت پر قائم رہیں اور یہی نیکوں کا گروہ ہے پھر سمجھ سکتے ہو کہ نیکوں کے سردار اور نبیوں کے سربر آوردہ حضرت رسول کریم ﷺ کا کیا حال ہو گا۔

آپ تو کُل خوبیوں کے جامع اور کل نیکیوں کے سرچشمہ تھے عبادت کسی تکبر یا بڑائی کے لئے کرنا تو الگ رہا جس قدر خدا تعالیٰ کی بندگی بجالاتے اتنی ہی ان کی آتش شوق تیز ہوتی اور آپؐ بجائے عبادت پر خدا تعالیٰ کو اپنا ممنون احسان بنانے کے خود شرمندہ احسان ہوتے کہ الٰہی اس قدر توفیق جو عبادت کی ملتی ہے تو تیرے ہی فضل سے ملتی ہے۔ آپؐ کی عبادت ایک تسلسل کا رنگ رکھتی ہے کچھ حصہ وقت جب عبادت میں گذارتے تو خیال کرتے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس کام کی توفیق دی اس احسان کا شکر بجالانا ضروری ہے اس جذبہ ادائیگی شکر سے بے اختیار ہو کر کچھ اور عبادت کرتے اور پھر اسے بھی خدا تعالیٰ کا ایک احسان سمجھتے کہ شکر بجالانا بھی ہر ایک کا کام نہیں جب تک خدا تعالیٰ کا احسان نہ ہو۔ پھر اور بھی زیادہ شوق کی جلوہ نمائی ہوتی اور پھر اپنے رب کی عبادت میں مشغول ہو جاتے اور یہ راز و نیاز کا سلسلہ ایسا وسیع ہوتا کہ بارہا عبادت کرتے کرتے آپؐ کے پاؤں سوج جاتے صحابہؓ عرض کرتے یا رسول اللہ اس قدر عبادت کی آپؐ کو کیا حاجت ہے آپؐ کے تو گناہ معاف ہو چکے ہیں اس کا جواب آپ یہی دیتے کہ پھر کیا میں شکر نہ کروں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں اِنْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیَقُوْمُ لِیُصَلِّیَ

حَتّٰی تَرِمَ قَدَمَاهُ اَوْسَاقَاهُ فَيُقَالُ لَهٗ فَيَقُوْلُ اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا (بخاری کتاب التہجد باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللیل) رسول کریم نماز کے لئے کھڑے ہوا کرتے تھے تو اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ آپ کے قدم (یا کہا) پنڈلیاں سوج جاتیں۔ لوگ آپ سے جب کہتے (کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں) تو آپ جواب دیتے کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

اللہ اللہ کیا عشق ہے کیا محبت کیا پیار ہے خدا تعالیٰ کی یاد میں کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا خون کا دوران نیچے کی طرف ہو جاتا ہے اور آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے ہیں لیکن محبت اس طرف خیال ہی نہیں جانے دیتی آس پاس کے لوگ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں کہ یہ کرتے کیا ہیں اور آپ کے درد سے تکلیف محسوس کرکے آپ کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں اور کیوں اپنے آپ کو اس تکلیف میں ڈالتے ہیں اور اس قدر دکھ اٹھاتے ہیں آخر کچھ تو اپنی صحت اور اپنے آرام کا بھی خیال کرنا چاہئے مگر وہ دکھ جو لوگوں کو بے چین کر دیتا ہے اور جس سے دیکھنے والے متاثر ہو جاتے ہیں۔ آپ پر کچھ اثر نہیں کرتا اور عبادات میں کچھ سستی کرنے اور آئندہ اس قدر لمبا عرصہ اپنے رب کی یاد میں کھڑے رہنا ترک کرنے کی بجائے آپ ان کی اس بات کو ناپسند کرتے ہیں اور انہیں جواب دیتے ہیں کہ کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں وہ مجھ پر اس قدر احسان کرتا ہے اس قدر فضل کرتا ہے اس شفقت کے ساتھ مجھ سے پیش آتا ہے پھر کیا اس کے اس حسن سلوک کے بدلہ میں اس کے نام کا ورد نہ کروں؟ اس کی بندگی میں کوتاہی شروع کر دوں۔

کیا اخلاص سے بھرا اور کیسی شکر گزاری ظاہر کرنے والا یہ جواب ہے اور کس طرح آپ کے قلب مطہر کے جذبات کو کھول کر پیش کر دیتا ہے خدا کی یاد اور اس کے ذکر کی یہ تڑپ اور کسی کے دل میں ہے۔ کیا کوئی اور اس کا نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ کیا کسی اور قوم کا بزرگ آپ کے اس اخلاص کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ میں اس مضمون کے پڑھنے والے کو اس طرف بھی متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس عبادت کے مقابلہ میں اس بات کا خیال بھی رکھنا چاہئے کہ آپ کس طرح کاموں میں مشغول رہتے تھے اور یہی نہیں کہ رات کے وقت عبادت کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور دن بھر سوئے رہتے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس شوق اور تڑپ کا پتہ نہ لگتا جو اس صورت میں ہے کہ دن بھر بھی آپ خدا تعالیٰ کے نام کی اشاعت اور اطاعت و فرمانبرداری کا رواج دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ خود پانچ اوقات میں امام ہو کر نماز پڑھاتے تھے دور دور کے جو وفود اور سفراء آتے

تھے ان کے ساتھ خود ہی ملاقات کرتے اور ان کے مطالبات کا جواب دیتے۔ جنگوں کی کمان بھی خود ہی کرتے۔ صحابہؓ کو قرآن شریف کی تعلیم بھی دیتے۔ جج بھی خود تھے تمام دن جس قدر جھگڑے لوگوں میں ہوتے ان کا فیصلہ کرتے۔ عُمّال کا انتظام، بیت المال کا انتظام، ملک کا انتظام، دین اسلام کا اجراء اور پھر جنگوں میں فوج کی کمان، بیویوں کے حقوق کا ایفاء۔ پھر گھر کے کام کاج میں شریک ہونا یہ سب کام آپ دن کے وقت کرتے اور ان کے بجالانے کے بعد بجائے اس کے کہ چُور ہو کر بستر پر جا پڑیں اور سورج کے نکلنے تک اس سے سر نہ اٹھائیں بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے تحمید کرتے اور نصف رات کے گزرنے پر اٹھ کر وضو کرتے اور تن تنہا جب چاروں طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا ہوتا اپنے رب کے حضور میں نہایت عجز و نیاز سے کھڑے ہو جاتے اور تلاوت قرآن شریف کرتے اور اتنی اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے حتّٰی کہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا تو اس قدر تکلیف ہوئی کہ قریب تھا کہ میں نماز توڑ کر بھاگ جاتا کیونکہ میرے قدم اب زیادہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور میری طاقت سے باہر تھا کہ زیادہ کھڑا رہ سکوں۔ یہ بیان اس شخص کا ہے جو نوجوان اور رسول کریم ﷺ سے عمر میں کہیں کم تھا جس سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ آپؐ کی ہمت اور جذبہ محبت ایسا تیز تھا کہ باوجود پیری کے اور دن بھر کام میں مشغول رہنے کے آپؐ عبادت میں اتنی اتنی دیر کھڑے رہتے کہ جوان اور پھر مضبوط جوان جن کے کام آپ کے کاموں کے مقابلہ میں پاسنگ بھی نہ تھے آپ کے ساتھ کھڑے نہ رہ سکے اور تھک کر رہ جاتے۔

یہ عبادت کیوں تھی اور کس وجہ سے آپؐ یہ مشقت برداشت کرتے تھے۔ صرف اسی لئے کہ آپ ایک شکر گزار بندے تھے اور آپ کا دل خدا تعالیٰ کے احسانات کو دیکھ کر ہر وقت اس کے ذکر کرنے کی طرف مائل رہتا چنانچہ جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں جب آپؐ سے سوال کیا گیا کہ آپ اس قدر عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں تو آپ نے یہی جواب دیا کہ کیا میں خدا تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

غرضیکہ جس محبت اور شوق سے آپ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور ان مشاغل کے باوجود جو آپ کو دن کے وقت در پیش رہتے تھے اس کی نظیر دنیا میں اور کسی ہادی کی زندگی میں نہیں مل سکتی اول تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر دنیا کے دیگر ہادیان کے اشغال کا آپ کے اشغال سے مقابلہ کیا جائے تو ان کے اشغال ہی آپ کے مقابلہ میں بہت کم نکلیں گے لیکن اس فرق کو نظر انداز کر کے

بھی ان کی زندگی میں ذکرِ الٰہی کی یہ کثرت نہ پائی جائے گی۔

بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے احسانات کا مطالعہ جس غور سے رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے اور کسی انسان نے نہیں کیا۔ اسی لئے جس محبت سے آپ اپنے پیارے کا نام لیتے تھے اور کسی انسان نے نہیں لیا۔ ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے محبّین اور ذاکرین میں بڑے بڑے لوگ ہوئے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ آپ جیسا ذاکر اور مُحبّ اور کوئی نہیں مل سکتا۔

موت کے وقت بھی خدا ہی یاد تھا

سوائے شاذ و نادر کے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ انسان اپنی زندگی پر حریص ہوتا ہے حتیٰ کہ ڈاکٹروں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جو شخص خودکشی کرتا ہے وہ ضرور پاگل ہو جاتا ہے یا خودکشی کے وقت اسے جنون کا دورہ ہوتا ہے ورنہ عقل و خرد کی موجودگی میں انسان ایسا کام نہیں کرتا۔

جب موت قریب ہو تو اس وقت تو اکثر آدمی اپنے مشاغل کو یاد کر کے افسوس کرتے ہیں کہ اگر اور کچھ دن زندگی ہوتی تو فلاں کام بھی کر لیتے اور فلاں کام بھی کر لیتے جوانی میں اس قدر حرص نہیں ہوتی جس قدر بڑھاپے میں ہو جاتی ہے اور یہی خیال دامنگیر ہو جاتا ہے کہ اب بچوں کے بچے دیکھیں اور پھر ان کی شادیاں دیکھیں اور جب موت قریب آتی ہے تو اور بھی توجہ ہو جاتی ہے اور بہت سے لوگوں کا بستر مرگ دیکھا گیا ہے کہ حسرت و اندوہ کا مظہر اور رنج و غم کا مقام ہوتا ہے اور "اگر" اور "کاش" کا اعادہ اس کثرت سے کیا جاتا ہے کہ عمر بھر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مرنے والا پے درپے اپنی خواہشات کا ذکر کرتا ہے اور اپنے وقت کو وصیت میں صرف کرتا ہے میرے فلاں مال کو فلاں کے سپرد کرنا اور میری بیوی سے یہ سلوک کرنا اور بیٹیوں سے یوں حسن سلوک سے پیش آنا فلاں سے میں نے اس قدر روپیہ لینا ہے اور فلاں کو اس قدر دینا ہے غرض اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو روزانہ ہر گھر میں دوہرائی جاتی ہیں اور چونکہ موت کا سلسلہ ہر جگہ لگا ہوا ہے اور ہر فرد بشر کو اس دروازہ سے گزرنا پڑتا ہے اس لئے تمام لوگ ان کیفیات کو جانتے ہیں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

میرا آقا جہاں اور ہزاروں باتوں میں دوسرے انسانوں سے اعلیٰ اور مختلف ہے وہاں اس بات میں بھی دوسروں سے بالاتر ہے۔ اس میرے سردار کی موت کا واقعہ کوئی معمولی سا واقعہ نہیں کس گمنامی کی حالت سے ترقی پا کر اس نے اس عظیم الشان حالت کو حاصل کیا تھا اور کس طرح خدا تعالیٰ نے اسے ہر دشمن پر فتح دی تھی اور ہر میدان میں غالب کیا تھا۔ ایک بہت بڑی حکومت کا مالک اور

بادشاہ تھا اور ہزاروں قسم کے انتظامات اس کے زیر نظر تھے لیکن اپنی وفات کے وقت اسے ان چیزوں میں سے ایک کا بھی خیال نہیں۔ نہ وہ آئندہ کی فکر کرتا ہے نہ تدابیر ملکی کے متعلق وصیت کرتا ہے نہ اپنے رشتہ داروں کے متعلق ہدایات لکھواتا ہے بلکہ اس کی زبان پر اگر کوئی فقرہ جاری ہے تو یہی کہ اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی اے میرے اللہ مجھے رفیق اعلیٰ میں جگہ دے اے میرے اللہ مجھے رفیق اعلیٰ میں جگہ دے۔

اس فقرہ کو ذرا ان مضطربانہ حرکات سے مقابلہ کر کے دیکھو جو عام طور سے مرنے والوں سے سرزد ہوتی ہیں کیسا اطمینان ثابت ہوتا ہے۔ کیسی محبت ہے۔ ساری عمر آپ خدا تعالیٰ کو یاد کرتے رہے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے۔ خلوت و جلوت غرضیکہ ہر جگہ آپ کو خدا ہی خدا یاد تھا اور اسی کا ذکر آپ کی زبان پر جاری تھا اور اب جبکہ وفات کا وقت آیا تب بھی بجائے کسی اور دنیاوی غرض یا مطلب کی طرف متوجہ ہونے کے خدا ہی کی یاد آپ کے سینہ میں تھی اور جن کو چھوڑ چلے تھے ان کی فرقت کے صدمہ کی بجائے جن سے ملنا تھا ان کی ملاقات کی تڑپ تھی اور زبان پر اپنے رب کا نام جاری تھا۔

آہ! کیسا مبارک وہ وجود تھا۔ کیا احسان ماننے والا وہ انسان تھا۔ اس کی زندگی بہتر سے بہتر انسانوں کے لئے اسوہ حسنہ اور مہذب سے مہذب روحوں کے لئے ایک نمونہ تھی اس نے اپنے پیدا ہونے سے مرنے تک کوئی وقت اپنے رب کی یاد سے غافل نہیں گزارا۔ وہ پاک وجود خدا تعالیٰ میں بالکل محو ہی ہو گیا تھا اور اس کی نظر میں سوائے اس وحدہٗ لاشریک خدا کے جو لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ہے اور کوئی وجود جچتا ہی نہ تھا۔ پھر بھلا جو ذکر کہ تمام عمر اس کی زبان پر رہا وفات کے وقت وہ اسے کہاں بھلا سکتا تھا۔ جو کچھ انسان ساری عمر کہتا یا کرتا رہا ہو وہی اسے وفات کے وقت بھی یاد آتا ہے۔ پھر جس کی عمر کا مشغلہ ہی یاد الٰہی ہو اور زندگی بھر جس کی روحانی غذا ہی ذکر الٰہی ہو وہ وفات کے وقت اور کسی چیز کو کب یاد کر سکتا تھا۔

مجھے میرا مولا پیارا ہے اور مجھے محمد رسول اللہ ﷺ بھی پیارا ہے کیونکہ وہ میرے مولا کا سب سے بڑا عاشق اور دلدادہ ہے اور جسے جس قدر میرے رب سے زیادہ الفت ہے مجھے بھی وہ اسی قدر عزیز ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

ذکرالٰہی ہروقت

میں نے پیچھے بعض واقعات سے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو ذکر الٰہی سے کیسی محبت تھی اور آپؐ کس طرح ہر موقع پر خدا تعالیٰ کا نام لینا پسند فرماتے تھے اور صرف خود ہی پسند نہ فرماتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے اور وفات کے وقت بھی آپؐ کی زبان پر خدا تعالیٰ کا ہی ذکر تھا۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپؐ خدا تعالیٰ کے ذکر پر چشم پُرنم ہو جاتے تھے اور آپؐ کا خدا تعالیٰ کا ذکر کرنا یا سننا معمولی بات نہ تھی بلکہ ایک عاشقانہ درد اور محبانہ ولولہ اس کا محرک اور باعث تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں قَالَ لِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِقْرَأْ عَلَیَّ قُلْتُ اَقْرَأُ عَلَیْكَ وَعَلَیْكَ اُنْزِلَ قَالَ فَاِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَہٗ مِنْ غَیْرِیْ فَقَرَأْتُ عَلَیْہِ مِنْ سُوْرَۃِ النِّسَآءِ حَتّٰی بَلَغْتُ فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا قَالَ اَمْسِكْ فَاِذَا عَیْنَاہُ تَذْرُفَانِ (بخاری کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ کیف اذا جئنا من کلّ امۃ بشھید) مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے کچھ قرآن سناؤ میں نے کہا کہ کیا میں آپؐ کو قرآن سناؤں حالانکہ قرآن شریف آپؐ ہی پر نازل ہؤا ہے۔ فرمایا کہ مجھے یہ بھی پسند ہے کہ میں دوسرے کے منہ سے سنوں۔ پس میں نے سورۃ نساء میں سے کچھ پڑھا یہاں تک کہ میں اس آیت تک پہنچا کہ پس کیا حال ہو گا جب ہر ایک امت میں سے ہم ایک شہید لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر شہید لائیں گے اس پر آپؐ برداشت نہ کر سکے اور فرمایا کہ بس کرو۔ اور میں نے دیکھا کہ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

اللہ اللہ کیسا عشق ہے اور پھر کیسا ایمان ہے۔ آپؐ قرآن شریف کو جو خدا تعالیٰ کا کلام ہے خود پڑھنے اور دوسروں کو سنانے کا حکم دیتے تھے اور پھر اپنے محبوب کا کلام سنکر چشم پر آب ہو جاتے آپ ایسے بہادر تھے کہ میدان کارزار میں آپ تک دشمن کی رسائی نہ ہوتی اور حضرت علیؓ جیسے بہادر آدمی فرماتے ہیں کہ جس جگہ آپ کھڑے ہوتے تھے وہاں وہی آدمی کھڑا ہو سکتا تھا جو نہایت دلیر اور بہادر ہو اور معمولی آدمی کی جرأت نہ پڑ سکتی تھی کہ آپ کے پاس کھڑا ہو۔ پھر ایسا بہادر انسان کہ جس کے سامنے بڑے بڑے بہادروں کی روح کانپتی تھی اور ان کی گردنیں جھک جاتی تھیں وہ بہادر انسان جس کے نام کو سنکر بادشاہ خوف کھاتے تھے جس کی بہادری کا شہرہ تمام عرب اور شام اور ایران میں ہو رہا تھا جس کی ہمت بلند کے سامنے قیصرو کسریٰ کے ارادے پست ہو رہے تھے وہ خدا تعالیٰ کا کلام سنکر روتا ہے اور آپؐ کے دل کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ زیادہ سننا گویا اس کے لئے برداشت سے بڑھ کر ہے۔ کیا یہ بات مطہر قلب پر دلالت نہیں کرتی کیا اس سے یہ ثابت

نہیں ہوتا کہ ایک محبت کا دریا اس کے سینہ میں بہہ رہا تھا اور عشق کی آگ اس کے اندر بھڑک رہی تھی۔ کیا خدا تعالیٰ کے ذکر پر یہ حالت اور پھر ایسے بہادر انسان کی جو کسی بشر سے خائف نہ تھا اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ خدا تعالیٰ کی محبت نے آپؐ کے روئیں روئیں میں دخل کیا ہؤا تھا اور خدا تعالیٰ کا ذکر آپ کی غذا ہو گیا تھا اور اس کا جلال اور اس کی عظمت آپ کے سامنے ہر وقت موجود رہتی تھی اور اپنے مولا کا ذکر سنتے ہی آپ بے چین ہو جاتے۔ کلام الٰہی آپ کی تسلی کا باعث تھا اور یہی آپ کے عشق کو تیز کرتا اور آپ اپنے پیارے کو یاد کر کے بے اختیار ہو جاتے آپ بڑی شان کے آدمی تھے اور خدا تعالیٰ سے جو آپ کو تعلق تھا وہ اور کسی انسان کو حاصل نہیں ہؤا لیکن پھر بھی جب آپؐ خدا تعالیٰ کی ملاقات کو یاد کرتے اور قیامت کا نظارہ آپؐ کی آنکھوں کے آگے آتا تو باوجود ایک مضبوط دل رکھنے کے آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے۔

اخلاص باللہ۔ شرک سے نفرت

ایک خاص بات جو رسول کریمؐ کی زندگی میں دیکھی جاتی ہے اور جس میں کوئی نبی اور ولی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ آپؐ کے قریب بھی نہیں پہنچتا وہ آپ کا شرک سے بیزار ہونا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ کل انبیاء شرک سے بچانے کے لئے دنیا میں آئے اور بلا استثناء ہر ایک نبی کی تعلیم یہی تھی کہ خدا تعالیٰ کو ایک سمجھا جائے خواہ کوئی نبی ہندوستان میں۔ جو شرک و بت پرستی کا گھر ہے پیدا ہؤا یا مصر میں جو رب الارباب کے عقیدہ کا مرکز تھا ظاہر ہؤا خواہ آتش پرستان ایران میں جلوہ نما ہؤا یا وادی کنعان میں نور افشاں ہؤا یہ بات سب میں پائی جاتی ہے کہ وہ شرک کو بیخ و بن سے اکھیڑنے کے درپے رہے اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ خدا تعالیٰ کو ایک سمجھا جائے اور اس کی ذات یا صفات یا اسماء میں کسی کو اس کا شریک نہ سمجھا جائے نہ بنایا جائے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء آیت ۲۶) اور ہم نے نہیں بھیجا تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اس کی طرف وحی کی کہ کوئی معبود نہیں مگر اللہ پس میری عبادت کرو۔ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (النحل آیت: ۳) اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ساتھ اپنے حکم سے فرشتوں کو اپنے بندوں میں سے جس پر پسند کرتا ہے اتارتا ہے لوگوں کو ڈراؤ کہ سوائے میرے کوئی معبود نہیں پس میرا تقویٰ اختیار کرو۔

ان آیات کی بناء پر ہم ایمان لائے ہیں کہ سب انبیاءؑ کا مشترکہ مشن اشاعت توحید اور تخریب

شرک تھا مگر بڑے سے بڑے نبیوں اور مرسلین کی زندگی کا رسول کریم کی زندگی سے مقابلہ کر کے دیکھ لو جو فکر اور فہم آپؐ کو شرک کی بیخکنی کا تھا اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو ایک خدا کی پرستش کی تبلیغ کی۔ حضرت مسیح ناصریؑ نے ایک سائل کو کہا کہ سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ تو اس خدا کو جو آسمان پر ہے اپنے سچے دل اور سچی جان سے پیار کر۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے بتوں کو توڑ کر ان پر شرک کے عقیدہ کا بطلان ثابت کیا۔ حضرت نوحؑ نے بھی اپنی قوم کو واحد خدا کی پرستش کی طرف بلایا لیکن ہمارے سردار و آقا ہادی برحق ﷺ نے جس طرح شرک مٹانے کے لئے جدوجہد کی ہے اس کی مثال اور کسی نبی کی ذات میں نہیں ملتی۔ بے شک دیگر انبیاء نے اپنی عمر کا ایک حصہ شرک کے مٹانے پر خرچ کیا مگر جو دھت اس مرض کو مٹانے کی خاتم النبیّن ﷺ کو لگی ہوئی تھی وہ اور کسی کو نہ تھی۔ آپ نے اپنے دعویٰ کے بعد ایک ہی کام کو مد نظر رکھا کہ ایک خدا کی پرستش کروائی جائے۔ تمام اہل عرب جو شرک میں ڈوبے ہوئے تھے آپ کے مخالف ہو گئے اور یہاں تک آپ سے درخواست کی کہ جس طرح ہو آپ ہمارے معبودوں کی تردید کو جانے دیں اور ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ جو مطالبہ بھی پیش کریں گے ہم اسے قبول کریں گے حتّٰی کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بھی بنا لیں گے اور ایسا بادشاہ کہ جس کے مشورہ کے بغیر ہم کوئی کام نہ کریں گے۔ مگر باوجود اس تحریص و ترغیب کے اور باوجود طرح طرح کے ظلم و ستم کے جو آپ پر اور آپؐ کی امت پر توڑے جاتے تھے آپ نے ایک لحہ اور ایک سیکنڈ کے لئے بھی یہ برداشت نہ کیا کہ خدا تعالیٰ کی وحدت کے بیان میں سستی کریں بلکہ آپ نے ترغیب و تحریص دینے والوں کو یہی جواب دیا کہ اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لا کھڑا کرو تب بھی میں خدا تعالیٰ کی وحدت کا بیان واقرار ترک نہ کروں گا جو تکالیف لوگوں کی طرف سے شرک کی تردید کی وجہ سے آپؐ کو پہنچیں ویسی اور کسی نبی کو نہیں پہنچیں۔ اور جس طرح آپؐ کو اور آپ کے متّبعین کو خدا تعالیٰ کے ایک ماننے پر ستایا اور دکھ دیا گیا ہے اس طرح اور کسی کو تکلیف نہیں دی گئی۔ مگر پھر بھی آپ اپنے کام میں بجائے سست و غافل ہونے کے روز بروز زیادہ سے زیادہ مشغول ہوتے گئے۔ حتّٰی کہ بعض صحابہ قتل کئے گئے۔ آپ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ رشتہ دار چھوڑنے پڑے۔ زخمی ہوئے۔ ان تمام تکالیف کے بعد آپ اپنے مخالفین کو بھی جواب دیتے کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ۔ پہلے انبیاء نے اپنی اپنی قوم سے مقابلہ کیا اور خوب کیا لیکن ہمارے آنحضرت ﷺ نے ایک قوم سے نہیں دو قوموں سے نہیں بلکہ اس وقت

کی سب قوموں اور مذاہب سے خدا کے لئے مقابلہ کیا۔ اس وقت ایک بھی ایسی قوم نہ تھی جو شرک کی مرض میں گرفتار نہ ہو عرب تو سینکڑوں بتوں کے پجاری تھے ہی اور مجوسی تو آگ کے آگے ناصیہ فرسائی کرتے ہی تھے یہود جو تورات کے پڑھنے والے اور حضرت موسیٰؑ کے ماننے والے تھے وہ بھی عزیر ابن اللہ پکار رہے تھے اور اپنے احبار کو صفات الوہیت سے متصف یقین کرتے تھے اور ان سے بھی بڑھ کر نصاریٰ تھے جو سب سے قریب تھے۔ حضرت مسیحؑ کی امت ہو کر اس قدر بڑھ گئے تھے کہ خود مسیح کو جو اللہ تعالیٰ کی پرستش قائم کرنے آئے تھے قابل پرستش سمجھنے لگے تھے۔ ہندوستان اور چین کی تو کچھ پوچھو ہی نہیں گھر گھر میں بت تھے اور شہر شہر میں مندر تھے پھر ایسی شورش کے زمانہ میں آپ کا توحید باری کے ثابت کرنے کے لئے کھڑا ہو جانا اور تمام قوموں کو پکار پکار کر سنانا کہ تم جس قدر معبود میرے خدا کے سوا پیش کرتے ہو سب جھوٹے اور بے ثبوت ہیں ایک ایسا کام تھا جسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے اور جس قدر آپ کی اس کوشش و ہمت پر غور کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شرک سے ایسے بیزار تھے کہ ایک ساعت کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کے سامنے اپنا سر جھکائے۔ خدا تعالیٰ کی محبت میں ایسے سرشار ہوئے کہ دنیا بھر کے مذاہب اور قوموں کو اپنا دشمن بنا لیا اور یکدم سب سے اپنا قطع تعلق کر لیا اور صرف اس سے صلح رکھی جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کیا۔ اس وقت جو معبود باطلہ تھے ان کے مٹانے اور اڑانے کے علاوہ آپ نے اپنی تعلیم میں اس بات کا التزام رکھا کہ مسلمانوں کو پوری طرح سے خبردار کیا جائے کہ آئندہ بھی کسی وجہ سے مرض شرک میں مبتلا نہ ہو جاویں اسلام کیا ہے سب سے پہلے اس کا اقرار کرنا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مسلمانوں کو دن میں پندرہ دفعہ بلند مکان پر سے یا منارہ پر سے یہ پیغام اب تک پہنچایا جاتا ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پھر تمام عبادات میں خدا تعالیٰ کی وحدت کا اقرار کرایا جاتا ہے۔ مسلمان تو مسلمان غیر مذاہب کے پیرو بھی اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ جس قدر اسلام شرک کو مٹاتا ہے اتنا اور کوئی مذہب اس کا استیصال نہیں کرتا اور یہ کیوں ہے اسی نفرت کی وجہ سے جو آنحضرت ﷺ کو شرک سے تھی۔ عمر بھر آپؐ اس مرض کے مٹانے میں لگے رہے حتّٰی کہ آپؐ نے اپنی وفات سے پہلے وہ خوشی دیکھی جو اور کسی نبی کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی کہ آپ کی سب قوم ایک خدا کو ماننے والی ہو گئی مگر پھر بھی وفات کے وقت جو خیال آپؐ کو سب سے زیادہ تھا وہ یہی تھا کہ کہیں میرے بعد میری قوم مجھے خدا تعالیٰ کا شریک نہ بنائے اور جس طرح پہلی امتوں نے اپنے انبیاءؑ کو صفات الوہیت سے متصف

کیا تھا یہ بھی مجھ سے ویسا ہی سلوک نہ کریں۔ اس خیال نے آپ پر ایسا اثر کیا کہ آپؐ نے اپنی مرض الموت میں یہود و نصاریٰ پر لعنت کی کہ انہوں نے اپنے احبار کی قبور کو سجدہ گاہ بنالیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں قَالَ فِیْ مَرَضِہِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْہِ لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَآءِ ھِمْ مَسَاجِدَ قَالَتْ لَوْ لَا ذٰلِکَ لَاَبْرَزُوْا قَبْرَہٗ (بخاری کتاب الجنائز باب مایکرہ من اتخاذ المساجد علی القبور) آنحضرت ﷺ نے اس مرض میں جس میں وفات پائی فرمایا اللہ تعالیٰ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیاءؑ کی قبور کو مساجد بنالیا ہے اور حضرت عائشہؓ نے یہ بھی زائد کیا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو صحابہؓ آپؐ کی قبر کو بند نہ کرتے بلکہ ظاہر کرتے اس حدیث سے پتہ لگ سکتا ہے کہ آپ کو شرک سے کیسی نفرت تھی وفات کے وقت سب سے بڑا خیال آپ کو یہ تھا کہ میں عمر بھر جو ایک خدا کی تعلیم دیتا رہا ہوں لوگ اسے بھول نہ جائیں اور میرے بعد پھر کہیں شرک میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور اگر پہلے معبودوں کو چھوڑا ہے تو اب مجھے ہی معبود نہ بنا بیٹھیں اور اپنے اس نقص کے دور کرنے کے لئے ایسے سخت الفاظ استعمال فرمائے جن سے صحابہ کرامؓ ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے خوف کے مارے آپ کی قبر کو بھی ظاہر کرنا پسند نہ کیا تا آپ کے حکم کے خلاف نہ ہو جائے چنانچہ اب تک وہ قبر مبارک ایک بند مکان میں ہے جس تک جانے کی لوگوں کو اجازت نہیں۔

طہارت نفس

آنحضرت ﷺ کی پاک سیرت پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں اسی لئے میں نے ابتداء میں ان مشکلات کو بیان کر کے بتایا تھا کہ سیرت تین طرح لکھی جا سکتی ہے۔ تواریخ سے 'احادیث سے 'قرآن کریم سے اور میں نے بتایا تھا کہ سردست میں احادیث سے اور پھر احادیث میں سے بھی جو سیرۃ بخاری سے معلوم ہوتی ہے وہ اس جگہ درج کروں گا۔ میں نے سیرت کے عام ابواب پر بحث کرنے کے بعد لکھا تھا کہ سیرت انسانی کے تین حصہ ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا تعالیٰ سے تعلقات کے متعلق ہو جس کا نام میں نے اخلاص باللہ رکھا تھا اور دوسرا جو خود اپنے نفس کے متعلق ہو اس کا نام طہارت نفس مناسب معلوم ہوتا ہے اور چونکہ اخلاص باللہ کا حصہ میں ختم کر چکا ہوں اس لئے اب دوسرے حصہ کو شروع کیا جاتا ہے جو طہارت نفس کے ہیڈنگ کے ماتحت ہو گا۔

بدی سے نفرت

طہارت نفس کے باب میں سب سے پہلے اس بات کے متعلق شہادت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو بدی سے سخت نفرت تھی۔ اگرچہ بظاہر یہ بات کوئی

عجیب نہیں معلوم ہوتی اور سوال اٹھتا ہے کہ آپ کو بدی سے کیوں نفرت نہ ہوتی جب ایک عظیم الشان قوم کے آپ رہبر اور ہادی تھے اور ہر وقت اپنے متبعین کو بدیوں سے روکتے رہتے تھے اور جس کا کام رات دن یہی ہو کہ وہ لوگوں کو بدیوں سے روکے اور امر بالمعروف کرے۔ اسے تو اپنے اعمال میں بہت محتاط رہنا ہی پڑتا ہے ورنہ اس پر الزام آتا ہے اور لوگ اسے طعنہ دیتے ہیں کہ تم دوسروں کو منع کرتے ہو اور خود اس کام کو کرتے ہو لیکن اگر غور کیا جائے تو دنیا میں وعظ کہنے والے تو بہت ملتے ہیں مگر ایسے واعظ جو اپنے نمونہ سے دنیا میں نیکی پھیلائیں بہت کم ہیں ایسے واعظ تو اس وقت بھی ہزاروں ہیں جو لوگوں کو پاکیزگی اور انقطاع الی اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ لیکن کیا ایسے لوگوں کی بھی کوئی کثیر جماعت پائی جاتی ہے جو خود عمل کر کے لوگوں کے لئے خضرِ راہ بنیں اِلاَّ مَاشَآءَ اللّٰہُ وَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کسی شاعر نے کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے کہ

ہر کسے ناصح برائے دیگراں

ہر ایک دوسروں کے لئے ناصح ہے اپنے نفس کا حال بھلائے ہوئے ہے پھر ایک شاعر کہتا ہے

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند -:- چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

یہ واعظ جو محراب و منبر پر جلوہ افروز ہو کر لوگوں کے لئے ناصح بنتے ہیں جب خلوت میں جاتے ہیں تو ان کے اعمال بالکل اور ہی ہوتے ہیں اور ان اعمال کا پتہ بھی نہیں چلتا جن کا وعظ وہ منبر پر سے کیا کرتے تھے اس وقت مسلمان علماء کو دیکھو۔ قرآن شریف کو ہاتھ میں لے کر خشیت الٰہی کے وعظ بڑے زور سے کہتے ہیں لیکن خود خدا کا خوف نہیں کرتے۔ پادری انجیل سے یہ روایت لوگوں کو سناتے ہیں کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا اگر کوئی تیری ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسری بھی پھیر دے لیکن دولتمند پادری موجود ہیں پھر ان میں سے کتنے ہیں جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسری پھیر دیں تو درکنار دوسرے مذاہب کے بانیوں کی نسبت بدگوئی میں ابتداء سے ہی بچتے اور پرہیز کرتے ہوں۔ پنڈت دان اور پن کے متعلق طول طویل کتھائیں پڑھ کر لوگوں کو اس طرف مائل کرتے ہیں مگر اپنے آپ کو کسی قسم کے دان پن سے بری سمجھتے ہیں۔ غرضیکہ جب روزانہ زندگی کا مشاہدہ کیا جائے تو اکثر واعظ ایسے ہی ملتے ہیں کہ جو کل پند و نصائح کو دوسروں کے لئے واجب العمل قرار دیتے ہیں مگر اپنے نفوس کو بنی نوع انسان سے خارج کر لیتے ہیں اور ایسے بہت ہی کم ہیں کہ جن کا قول و فعل برابر ہو اور وہ لوگوں کو نصیحت کرتے وقت ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی ملامت کرتے جائیں بلکہ لوگوں کو کہنے سے پہلے اپنے نفس کی اصلاح کریں۔ پس گو یہ

بات بظاہر بالکل معمولی معلوم ہوتی ہے کہ واعظ تو بدیوں سے بچتے ہی ہوں گے لیکن دراصل یہ ایک نہایت مشکل اور کٹھن راستہ ہے جس پر چل کر بہت کم لوگ ہی منزل مقصود کو پہنچتے ہیں اور ابتداء دنیا سے آج تک جس قدر واعظ ایسے گزرے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ دوسروں کو کہا اس پر خود بھی عامل ہوئے ان کے سردار اور رئیس ہمارے آنحضرت ﷺ تھے آپ کی ساری زندگی میں ایک بات بھی ایسی نہیں ملے گی کہ آپ کی اور دوسروں کی مصلحتیں ایک ہی ہوں مگر پھر بھی آپؐ نے دوسروں کو اور حکم دیا ہو اور اپنے لئے کچھ اور ہی تجویز کر لیا ہو۔

بعض اوقات خود صحابہؓ چاہتے تھے کہ آپؐ آرام فرمائیں اور اس قدر محنت نہ کریں لیکن آپؐ قبول نہ فرماتے۔ اگر لوگوں کو عبادت الٰہی کا حکم دیتے تو خود بھی کرتے اگر لوگوں کو بدیوں سے روکتے تو خود بھی رکتے غرضیکہ آپ نے جس قدر تعلیم دی ہے ہم بغیر کسی منکر کے انکار کے خوف کے کہہ سکتے ہیں کہ اس پر آپ خود عامل تھے اور شریعت اسلام کے جس قدر احکام آپ کی ذات پر وارد ہوتے تھے سب کو نہایت کوشش اور تعہّد کے ساتھ بجالاتے مگر اس وقت جس بات کی طرف خاص طور سے میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ بدی سے نفرت ہے۔

اعمال بد تو انتہائی درجہ ہے ادنیٰ درجہ تو بداخلاقی اور بدکلامی ہے جس کا انسان مرتکب ہوتا ہے اور جب اس پر دلیر ہو جاتا ہے تو پھر اور زیادہ جرأت کرتا ہے اور بد اعمال کی طرف راغب ہوتا ہے لیکن جو شخص ابتدائی نقائص سے ہی پاک ہو وہ دوسرے سخت ترین نقائص اور کمزوریوں میں کب مبتلا ہو سکتا ہے اور میں انشاء اللہ تعالیٰ آگے جو کچھ بیان کروں گا اس سے معلوم ہو جائے گا کہ آپؐ کیسے پاک تھے اور کس طرح ہر ایک نیکی میں آپؐ دوسرے بنی نوع پر فائق و برتر تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں لَمْ یَکُنِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا وَکَانَ یَقُوْلُ اِنَّ مِنْ خِیَارِکُمْ اَحْسَنَکُمْ اَخْلَاقًا (بخاری کتاب المناقب باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) نبی کریم ﷺ نہ بد خلق تھے نہ بدگو اور فرمایا کرتے تھے کہ تم میں بہتر وہی ہیں جو تم سے اخلاق میں افضل ہوں۔

اللہ اللہ کیا پاک وجود تھا۔ آپؐ حسن اخلاق برتتے تب لوگوں کو نصیحت کرتے۔ آپ بدکلامی سے بچتے تب دوسروں کو بھی اس سے بچنے کے لئے حکم دیتے اور یہی وہ کمال ہے کہ جس کے حاصل ہونے کے بعد انسان کامل ہو سکتا ہے اور اس کی زبان میں اثر پیدا ہوتا ہے اب لوگ چلّا چلّا کر مر جاتے ہیں کوئی سنتا ہی نہیں۔ نہ ان کے کلام میں اثر ہوتا ہے نہ کوشش میں برکت۔ اس کی وجہ یہی

ہے کہ وہ خود عامل نہیں ہوتے لوگوں کو کہتے ہیں مگر رسول کریمؐ خود عامل ہو کر لوگوں کو تبلیغ کرتے جس کی وجہ سے آپؐ کے کلام میں وہ تاثیر تھی کہ تئیس سال میں لاکھوں آدمیوں کو اپنے رنگ میں رنگین کر لیا۔

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے اس قول اور شہادت کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ اول تو وہ ہروقت رسول کریمؐ کی صحبت میں رہتے تھے اور جو اکثر اوقات ساتھ رہے اسے بہت سے مواقع ایسے مل سکتے ہیں کہ جن میں وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس شخص کے اخلاق کیسے ہیں۔ کبھی کبھی ملنے والا تو بہت سی باتیں نظرانداز بھی کر جاتا ہے بلکہ کسی بات پر بھی یقینی شہادت نہیں دے سکتا۔ لیکن جنہیں ہروقت کی صحبت میسر ہو اور ہر مجلس میں شریک ہوں وہ خوب اچھی طرح اخلاق کا اندازہ کر سکتے ہیں پس عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ان صحابہؓ میں سے تھے جنہیں رسول کریمؐ کے ساتھ رہنے کا خاص موقع ملتا تھا اور جو آپؐ کے کلام کے سننے کے نہایت شائق تھے ان کا ایسی گواہی دینا ثابت کرتا ہے کہ درحقیقت آپ کوئی ایسی شان رکھتے تھے کہ عسرویسر میں اپنے اخلاق کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ پیش کرتے تھے۔ ورنہ کبھی تو آپؐ کے ہروقت کے ہم صحبتوں کو ایسا موقع بھی پیش آتا کہ جس میں آپؐ کو کسی وجہ سے چیں بہ جبیں دیکھتے لیکن ایسے موقع کا نہ ملنا ثابت کرتا ہے کہ آپ کے اخلاق نہایت اعلیٰ اور ارفع تھے اور کوئی انسان ان میں نقص نہیں بتا سکتا تھا۔

ایک طرف اگر عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی گواہی جو اعلیٰ پایہ کے صحابہؓ میں سے تھے نہایت معتبر اور وزنی ہے تو دوسری طرف یہ بات بھی خاص طور سے مطالعہ کرنے کے قابل ہے کہ یہ فقرہ کس شخص کی شان میں کہا گیا ہے معمولی حیثیت کے آدمی کی نسبت اور معمولی واقعات کی بناء پر اگر اس قسم کی گواہی کسی کی نسبت دے بھی دی جائے تو گو اس کے اخلاق اعلیٰ سمجھے بھی جائیں مگر اس شہادت کو وہ اہمیت نہیں دی جاسکتی جو اس شہادت کو ہے اور وہ شہادت ایک معمولی انسان کے اخلاق کو ایسا روشن کر کے نہیں دکھاتی جیسی کہ یہ شہادت رسول کریم ﷺ کے اخلاق کو کیونکہ یہ اخلاق جن واقعات کی موجودگی میں دکھائے گئے ہیں وہ کسی اور انسان کو پیش نہیں آتے۔

دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ایک وہ جو عسر میں نہایت بدخلق ہو جاتے ہیں دوسرے وہ جو یسر میں چڑچڑے بن جاتے ہیں۔ رسول کریمؐ پر یہ دونوں حالتیں اپنے کمال کے ساتھ وارد ہوئی ہیں اور دونوں حالتوں میں آپؐ کے اخلاق کا اعلیٰ رہنا ثابت کرتا ہے کہ کوئی انسان آپؐ کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو تکلیفیں اور دکھ آپؐ کو پہنچے ہیں وہ اور کونسا انسان ہے جسے پہنچے ہوں مکہ کی تیرہ سالہ

زندگی کے حالات سے کون نہیں واقف' مدینہ کے ابتدائی ایام سے کون بے خبر ہے' کن شدائد کا آپ کو سامنا ہؤا' کن مشکلات سے پالا پڑا' دوست دشمن ناراض تھے' رشتہ دار جواب دے بیٹھے' اپنے غیروں کی نسبت زیادہ خون کے پیاسے ہو رہے تھے' ملنا جلنا قطعاً بند تھا' ایک وادی میں تین سال محصور رہنا پڑا' نہ کھانے کو نہ پینے کو' جنگل کے درخت اور بوٹیاں غذا بنیں' شہر میں آنا منع ہو گیا' پھر چمکتی ہوئی تلواریں ہر وقت سامنے نظر آتی تھیں' رؤساء سے قیام امن کی امید ہوتی وہ بھی مخالف ہو گئے' بلکہ نوجوانوں کو اور اکسا اکسا کر دکھ دینے پر مائل کرتے رہے' باہر نکلتے ہیں تو گالی گلوچ تو کچھ چیز ہی نہیں پتھروں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے' اپنے رب کے حضور گرتے ہیں تو اونٹ کی اوجھڑی سر پر رکھ دی جاتی ہے' حتّٰی کہ وطن چھوڑ دیتے ہیں' پھر وطن بھی وہ وطن جس میں ہزاروں سال سے قیام تھا' اپنے جد امجد کے ہاتھوں سے بسایا ہؤا شہر جس کو دنیا کے ہزاروں لالچوں کے باوجود آباء واجداد نے نہ چھوڑا تھا' ایک شریروں اور بدمعاشوں کی جماعت کے ستانے پر چھوڑنا پڑتا ہے' مدینہ میں کوئی راحت کی زندگی نہیں ملتی بلکہ یہاں آگے سے بھی تکلیف بڑھ جاتی ہے' ایک طرف منافق ہیں کہ خود آپؐ کی مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور بات بات پر سنا سنا کر طعنہ دیتے ہیں' آپؐ کے سامنے آپ کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں' ممکن سے ممکن طریق پر ایذاء دیتے ہیں اور پھر جھٹ توبہ کر کے عفو کے طالب ہوتے ہیں' اپنے مہربان اہل وطن مکہ سے اخراج کے منصوبوں پر ہی کفایت نہیں کرتے جب دیکھتے ہیں کہ جسے ہم تباہ کرنا چاہتے تھے ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا ہے اور اب ایک اور شہر میں جا بسا ہے تو وہاں بھی پیچھا کرتے ہیں' آس پاس کے قبیلوں کو اکساتے ہیں' اور اپنے ساتھ شریک کر کے دگنی طاقت سے اسے مٹانا چاہتے ہیں' یہود و نصارٰی اہل کتاب تھے ان پر کچھ امید ہو سکتی تھی وہ بغض و حسد کی آگ میں جل مرتے ہیں اور امی اور مشرک اقوام سے بھی زیادہ بغض و عناد کا اظہار کرتے ہیں' پڑھے ہوؤں کی شرارتیں بھی کہتے ہیں بڑھی ہوئی ہوتی ہیں انہوں نے نہ صرف خود مقابلہ شروع کیا بلکہ دور دور تک آپ کی مخالفت کا بیج بونا شروع کیا نصارٰی بدحواس ہو کر قیصر روم کی چوکھٹ پر جبین نیاز گھسنے گئے تو یہود اپنی سازشوں کے پیٹھ ٹھونکنے والے ایرانیوں کے دربار میں جا فریادی ہوئے کہ للہ اس اٹھتی ہوئی طاقت کو دباؤ کہ گو بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے مگر انداز کیے دیتے ہیں کہ چند ہی سال میں تمہارے تختوں کو الٹ دے گی اور عنان حکومت تمہارے ہاتھوں سے چھین لے گی- یہ سب ستم و قہر کس پر تھے ایک ایسے انسان پر جو دنیا کی اصلاح اور ترقی کے سوا کوئی اور مطلب ہی نہ رکھتا تھا جس کے کسی گوشۂ

دماغ میں ملک گیری کے خیالات نہ تھے جو اپنا قبلہ توجہ خدا تعالیٰ کی وحدت کے قیام کو بنائے بیٹھا تھا۔ پھر کس جماعت کے خلاف یہ دیو ہیکل طاقتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں جو اپنی مجموعی تعداد میں جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اب ان تکالیف میں ایک قابل سے قابل حوصلہ مند سے حوصلہ مند انسان کا گھبرا جانا اور چڑچڑاہٹ کا اظہار کرنا اور بد خلقی دکھانا بالکل قرین قیاس ہو سکتا ہے لیکن ان واقعات کی بناء پر بھی عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ لَمْ یَکُنْ فَاحِشًا وَّ لَا مُتَفَحِّشًا۔ نہ بد خلق تھے نہ بد گو تھے۔

اگر کہو کہ ایک جماعت ایسی بھی تو ہوتی ہے جس کے اخلاق بجائے تکالیف کے خوشی کے ایام میں بگڑتے ہیں تو خوشی کی گھڑیاں بھی آپؐ نے دیکھی ہیں۔ آپؐ خدا کے رسول اور اس کے پیارے تھے یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام دنیا سے اٹھا لیتا وفات سے پہلے پہلے خدا تعالیٰ نے آپ کو اپنے دشمنوں پر غلبہ دے دیا اور دشمن جس تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اسی سرعت سے پیچھے ہٹنے لگا۔ قیصر و کسریٰ تو بے شک آپ کی وفات کے بعد تباہ ہوئے اور آپ کے غلاموں کے ہاتھوں ان کا غرور ٹوٹا لیکن کفار عرب، جماعت منافقین یہود و نصاریٰ کے وہ قبائل جو عرب میں رہتے تھے وہ تو آپ کے سامنے آپ کے ہاتھوں سے نہایت ذلت سے ٹھوڑیوں کے بل گرے اور سوائے اس کے کہ طلبگار عفو ہوں اور کچھ نہ بن پڑا۔ اس بیکسی اور بے بسی کے بعد جس کا نقشہ پہلے کھینچ چکا ہوں بادشاہت کی کرسی پر آپؐ فروکش ہوئے اور سب دشمن پامال ہو گئے۔ مگر باوجود ان فاتحانہ نظاروں کے ان ایام ترقی کی ان ساعات بہجت و فرحت کے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لَمْ یَکُنِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَّ لَا مُتَفَحِّشًا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ بد اخلاق تھے نہ بد گو۔

ایک پاک دعا

میں عبداللہ بن عمروؓ کی شہادت سے بتا چکا ہوں کہ آنحضرتؐ کو بدی سے کیسی نفرت تھی اور بدی کرنا یا بد خلقی کا اظہار کرنا تو الگ رہا آپ بد کلامی اور بد گوئی تک سے محترز تھے اور باوجود ہر قسم کے عسر و یسر میں سے گزرنے کے کسی وقت اور کسی حال میں بھی آپ نے نیکی اور تقویٰ کو نہیں چھوڑا اور آپؐ کے منہ پر کوئی نازیبا لفظ کبھی نہیں آیا جو ایک عظیم الشان معجزانہ طاقت کا ثبوت ہے جو آپ کے ہر کام میں اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔

اب میں ایک اور ثبوت پیش کرتا ہوں کہ آپ بدی اور ظلمت سے سخت متنفر تھے اور آپ کے دل کے ہر گوشہ میں نور ایمان متمکن تھا اور وہ ثبوت آپؐ کی ایک دعا ہے جو آپ کے دلی جذبات

کی مظہر ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپ صبح کی سنتوں کے بعد یہ دعا مانگتے۔
اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَ فِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَعَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَعَنْ یَسَارِیْ نُوْرًا وَفَوْقِیْ نُوْرًا وَتَحْتِیْ نُوْرًا وَاَمَامِیْ نُوْرًا وَخَلْفِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا (بخاری کتاب الدعوات باب الدعاء اذا نتبه من اللّیل) یعنی اے اللہ میرے دل کو نور سے بھر دے اور میری آنکھوں کو نورانی کر دے اور میرے کانوں کو بھی نور سے بھر دے اور میری دائیں طرف بھی نور کر دے اور بائیں طرف بھی اور میرے اوپر بھی نور کر دے اور نیچے بھی نور کر دے۔ اور نور کو میرے آگے بھی کر دے اور پیچھے بھی کر دے۔ اور میرے لئے نور ہی نور کر دے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو یہ دعا مانگتے ہوئے سننے کا اتفاق مجھے اس طرح ہوا کہ میں اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک دن سویا جو رسول کریمؐ کی ازواج مطہرات میں سے تھیں اور میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ اس طرح دعا مانگتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ پس یہ دعا ایسے خلوت کے وقت کی ہے کہ جس وقت انسان اپنے خدا سے آزادی کے ساتھ اپنا حال دل عرض کرتا ہے۔ اور اگرچہ خدا تعالیٰ پہلے ہی سے انسان کے خفیہ سے خفیہ خیالات کو جانتا ہے پھر بھی چونکہ فطرت انسانی اسے عرض حال پر مجبور کرتی ہے اس لئے بہتر سے بہتر وقت جس وقت انسان کی حقیقی خواہشات کا علم ہوسکتا ہے وہ وقت ہے کہ جب وہ سب دنیا سے علیحدہ ہو کر اپنے گھر میں اپنے رب سے عاجزانہ التجا کرتا ہے کہ میری فلاں فلاں خواہش کو پورا کر دیں یا فلاں فلاں انعام مجھ پر فرما دیں۔

غرض کہ یہ دعا ایسے وقت کی ہے جب کہ خدا تعالیٰ کے سوا آپ کا محرم راز اور کوئی نہ تھا اور صرف ایک نابالغ بچہ اس وقت پاس تھا اور وہ بھی اپنے آپ کو علیحدہ رکھ کر چپکے چپکے آپ کے اعمال و حرکات کا معائنہ کر رہا تھا۔ اب اس دعا پر نظر ڈالو کہ یہ کس طرح آپ کے تقویٰ اور طہارت پر روشنی ڈالتی ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ آپؐ ہر ایک قسم کی بدکلامی و بدگوئی، بداخلاقی اور بداعمالی سے پاک تھے اور یہی نہیں کہ پاک تھے بلکہ آپ کو بدی سے سخت نفرت اور نور اور نیکی اور تقویٰ سے پیار تھا اور یہی انسانی کمال کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ہے یعنی وہ بدی سے بچے اور تقویٰ کی زندگی بسر کرے۔ ظلمت سے متنفر ہو اور نور سے محبت رکھے مگر اس حدیث سے پچھلی حدیث پر اور بھی روشنی پڑ جاتی ہے کیونکہ پچھلی حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا تھا کہ آپؐ بدی سے متنفر تھے مگر اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ فعل بالا تھا عادتاً نہ تھا اور یہ اور بھی کمال پر دلالت کرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے کام انسان عادتاً کرتا ہے یا فطرتاً بعض کاموں کی طرف راغب ہوتا ہے اور بعض سے بچتا ہے بہت سے لوگ دنیا میں دیکھے جاتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے یا چوری نہیں کرتے۔ اور ان کے جھوٹ سے بچنے یا چوری نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ جھوٹ سے دل میں سخت متنفر ہیں یا چوری کو برا جانتے ہیں بلکہ ان کا یہ کام صرف ان کی نیک فطرت کی وجہ سے ہی ہوتا ہے اور بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرف عادت کے نہ ہونے کی وجہ سے ان بدیوں سے بچتے ہیں۔ اگر ان کی عادت انہیں ڈال دی جائے تو وہ ان افعال کے مرتکب بھی ہو جائیں۔ ایسا ہی بعض لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ کسی نہ کسی وجہ سے رحم مادر سے ہی ان کے غصہ یا غضب کی صفت میں ضعف آچکا ہوتا ہے اور وہ باوجود سخت سے سخت اسباب طیش انگیز کے کبھی اظہار غضب نہیں کرتے بلکہ ان کا دل غیرت و حیا کے جذبات سے بالکل خالی ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ نرم دل کہلائیں گے لیکن ان کا غضب سے بچنا ان کی صفات حمیدہ میں سے نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ یہ ان کا کمال نہیں بلکہ قدرت نے ہی انہیں ان جوشوں سے مبرّا رکھا ہے۔ لیکن ایک ایسا انسان جو غضب سے صرف اس وجہ سے بچتا ہے کہ وہ اسے برا جانتا ہے اور رحم سے محبت رکھتا ہے اور باوجود اس کے کہ اسے طیش دلایا جائے اپنے جوشوں کو قابو میں رکھتا ہے وہ تعریف کے لائق ہے اور پھر وہ شخص اور بھی قابل قدر ہے کہ جس کے افعال اس سے بالارادہ سرزد ہوتے ہیں نہ خود بخود۔

رسول کریم ﷺ کا اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگنا کہ یا اللہ مجھے ظلمت سے بچا کر نور کی طرف لے جا اور بدی سے مجھے بچا لے ثابت کرتا ہے کہ آپ کا بد کلامی یا بد اخلاقی سے بچنا اس تقویٰ کے ماتحت تھا جس سے آپ کا دل معمور تھا اور یہی وجہ تھی کہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا بھی مانگتے تھے ورنہ جو لوگ نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی فطرت کی وجہ سے بعض گناہوں سے بچے ہوئے ہوتے ہیں وہ ان سے بچنے کی دعا یا خواہش نہیں کیا کرتے کیونکہ ان کے لئے ان اعمال بد کا کرنا نہ کرنا برابر ہوتا ہے اور ان سے احتراز صرف اس لئے ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش میں ہی کسی نقص کی وجہ سے بعض جذبات میں کمی آجاتی ہے جن کے استعمال سے خاص خاص بدیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس بات کے ثابت کرنے کے بعد کہ آنحضرت ﷺ کے تمام اعمال بالارادہ تھے اور اگر کسی کام سے آپ بچتے تھے تو اسے برا سمجھ کر اس سے بچتے تھے نہ کہ عادتاً اور اگر کوئی کام آپ کرتے تھے تو اسی لئے کہ آپ اسے نیک سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ جانتے

تھے۔ اب میں اس دعا کی تشریح کرنی چاہتا ہوں تا معلوم ہو کہ آپ کے بدی سے تنفر اور نیکی سے عشق کا درجہ کہاں تک بلند تھا۔

انسان جو کرتا ہے اس کی اصل وجہ اس کے دل کی ناپاکی اور عدم طہارت ہوتی ہے۔ اگر دل پاک ہو تو گناہ بہت کم سرزد ہو سکتا ہے کیونکہ پھر جو گناہ ہو گا وہ غلطی سے ہو گا یا نافہمی سے نہ کہ جان بوجھ کر۔ ہاں جب دل گندہ ہو جائے تو اس کا اثر جو روح پر پڑتا ہے اور وہ قسم قسم کے گناہوں کا ارتکاب شروع کر دیتے ہیں۔ ایک چور بے شک اپنے ہاتھ سے کسی کا مال اٹھاتا ہے لیکن دراصل ہاتھ ایک باطنی حکم کے ماتحت ہو کر کام کر رہا ہے اور اصل باعث وہ دل کی حرص ہے جس نے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غیر کا مال اٹھا لے۔ اسی طرح اگر ایک جھوٹا جھوٹ بولتا ہے تو گو خلاف واقعہ کلمات اس کی زبان پر ہی جاری ہوتے ہیں لیکن نہیں کہہ سکتے کہ زبان نے جھوٹ بولا کیونکہ وہ دل کے اشارہ پر کام کرتی ہے اور اسے جس طرح اس کا حکم پہنچا اس نے کام کر دیا۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ (بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرا لدینہ) جسمِ انسان میں ایک لو تھڑا ہے کہ جب وہ درست ہو جائے تو سب جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سب جسم بگڑ جاتا ہے۔ خبردار ہو کر سنو کہ وہ دل ہے۔ پس دل کے نیک ہونے سے جوارح سے بھی نیک اعمال ظاہر ہوتے ہیں اور اس کے خراب ہو جانے سے ہاتھ پاؤں آنکھیں کان اور زبان سب خراب ہو جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے اپنی دعا میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ الٰہی میرے دل میں نور بھر دے۔ جب دل میں نور بھر اگیا تو پھر ظلمت کا گزر کیونکر ہو سکتا ہے اور گناہ ظلمت سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

جس طرح گناہ دل سے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح دل کو خراب کرنے کے لئے کوئی بیرونی سامان ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے دل اپنی اصل حالت سے نکل جاتا ہے اس لئے رسول کریم ﷺ نے دل میں نور بھرنے کی درخواست کے بعد دعا فرمائی کہ جن ذریعوں سے قلب انسانی بیرونی اشیاء سے متاثر ہوتا ہے ان میں بھی نور ہی بھر دے یعنی آنکھوں اور کانوں کو نورانی کر دے۔ میری آنکھیں کوئی ایسی بات نہ دیکھیں کہ جس کا دل پر خراب اثر پڑے۔ نہ کان وہ باتیں سنے جن سے دل بدی کی طرف مائل ہو۔ پھر اس سے بڑھ کر آپ نے یہ سوچا کہ کان اور آنکھیں بھی تو آخر

وہی سنتے اور دیکھتے ہیں جو ان کے ارد گرد ہوتا ہے۔ اگر ارد گرد ظلمت کے سامان ہی نہ ہوں اور بدی کی تحریک اور میلان پیدا کرنے والے ذرائع ہی مفقود ہوں تو پھر انہوں نے دل پر کیا خراب اثر ڈالنا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ عَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَیَسَارِیْ نُوْرًا وَفَوْقِیْ نُوْرًا وَتَحْتِیْ نُوْرًا وَاَمَامِیْ نُوْرًا وَخَلْفِیْ نُوْرًا (بخاری کتاب الدعوات باب الدعاء اذا انتبہ من اللیل) اے اللہ میری بینائی اور شنوائی کو نور سے منور کر کے یہ بھی کر کہ میرے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے جہات ستہ میں نور ہی نور ہو جائے اور جن باتوں سے آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ دل پر برا اثر پڑتا ہے وہی میرے ارد گرد سے فنا ہو کر ان کی بجائے تقویٰ اور طہارت کے پیدا کرنے والے نظارے مجھے چاروں طرف سے گھیرلیں۔ پھر اس خیال سے کہ پوشیدہ در پوشیدہ ذرائع سے بھی دل ملوث ہوتا ہے۔ فرمایا کہ وَاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا میرے لئے نور کے دروازے کھول دے ظلمت سے میرا کچھ تعلق ہی نہ رہے نور ہی سے میرا واسطہ ہو اس دعا کو پڑھ کر ہر ایک تعصب سے کورا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ بدیوں سے کیسے متنفر تھے۔

شفقت علی النّفس

بہت سے انسان اپنی حماقت سے بجائے فائدہ کے الٹا نقصان کر لیتے ہیں اور اپنے نزدیک جسے خوبی سمجھتے ہیں وہ دراصل برائی ہوتی ہے اور اس پر عامل ہو کر تکلیف اٹھاتے ہیں۔ بہت سے لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ وہ اپنے نفس کو خواہ مخواہ کی مشقت میں ڈال کر تکلیف دیتے ہیں اور اسے فخر سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ جانتے ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا کوئی آسان امر نہیں پہلے انسان پوری طرح سے اپنے نفس کو مارے اور اپنے ہر فعل اور قول کو اس کی رضا کے مطابق بنائے اپنی خواہشات کو اس کے لئے قربان کر دے۔ اپنی آرزوؤں کو اس کے منشا کے مقابلہ میں مٹا دے۔ اپنے ارادوں کو چھوڑ دے۔ اس کی خاطر ہر ایک دکھ اور تکلیف اٹھانے کو تیار ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں کسی چیز کی خاک عظمت نہ سمجھے اور جس چیز کے قرب سے اس سے دوری ہو اسے ترک کر دے۔ اپنے اوقات کو ضائع ہونے سے بچائے تب ہی انسان خدا تعالیٰ کے فضل کو حاصل کر سکتا ہے اور جب اس کا فضل نازل ہو تو اس کی رحمت کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں اور وہ ان اسرار کا مشاہدہ کرتا ہے جو اس سے پہلے اس کے واہمہ میں بھی نہیں آتے تھے اور یہ حالت انسان کے لئے ایک جنت ہوتی ہے جسے اسی دنیا میں حاصل کر لیتا ہے اور خدا تعالیٰ کے انعامات کا ایسے ایسے رنگ میں مطالعہ کرتا ہے کہ عقل حیران ہو جاتی ہے اور جنت کی تعریف ان کشوف پر صادق

آتی ہے کہ مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ۔

لیکن باوجود اس بات کے پھر بھی نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ مشقت اٹھانے سے حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ بہت سے انسان اپنی عمر کو رائگاں کر دیتے ہیں اور کسی اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچتے۔ اہل ہنود میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو اپنے ہاتھ سکھا دیتے ہیں۔ ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ جو سردیوں میں پانی میں کھڑے رہتے ہیں اور گرمیوں میں اپنے اردگرد آگ جلا کر اس کے اندر اپنا وقت گزارتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ جو سارا دن سورج کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہتے ہیں اور جدھر سورج پھرتا جائے ان کی نظر اس کے ساتھ پھرتی جاتی ہے۔ پھر ایسے بھی ہیں جو نجاست اور گندگی کھاتے ہیں مردوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ غرض کہ طرح طرح کی مشقتوں اور تکالیف کو برداشت کرتے ہیں اور ان کا منشا یہی ہوتا ہے کہ وہ خدا کو پالیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ لوگ بجائے روحانیت میں ترقی کرنے کے اور گرتے جاتے ہیں۔ مسیحیوں میں بھی ایک جماعت پادریوں کی ہے جو نہانے سے پرہیز کرتی ہے۔ نکاح نہیں کرتی۔ صوف کے کپڑے پہنتی اور بہت اقسام طیبات سے محترز رہتی ہے لیکن اسے وہ نور قلب عطا نہیں ہوتا جس سے سمجھا جائے کہ خدا تعالیٰ انہیں حاصل ہو گیا بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان لوگوں کے اخلاق عام مسیحیوں کی نسبت گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سارا سال روزہ رکھتے ہیں اور ہمیشہ روزہ سے رہتے ہیں حالانکہ رسول کریم ﷺ نے دائمی روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے پھر بعض لوگ طیبات سے پرہیز کرتے ہیں۔ اپنے نفس کو خواہ مخواہ کی مشقتوں میں ڈالتے ہیں لیکن پھر بھی کوئی کمال حاصل نہیں ہوتا۔ غرض کہ جس طرح بغیر محنت و کوشش کے خدا تعالیٰ نہیں ملتا اسی طرح اپنے نفس کو بلا فائدہ مشقت میں ڈالنے سے بھی خدا نہیں ملتا بلکہ الٹا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ جنہوں نے اول اول تو شوق سے سخت سے سخت محنت اٹھا کر بعض عبادات کو بجالانا شروع کیا اور اپنے نفس پر وہ بوجھ رکھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور آخر تھک کر ایسے چور ہوئے کہ عبادت تو کجا خدا تعالیٰ کی ہستی سے ہی منکر ہو گئے اور کہنے لگے کہ اگر کوئی خدا ہوتا تو ہماری ان محنتوں کو ضائع کیوں کرتا ہم تو اس کوشش و محنت سے ورد و ظائف کرتے رہے لیکن وہاں سے ہمیں کچھ اجر بھی نہیں ملا اور آسمان کے دروازے چھوڑ آسمان کی کوئی کھڑکی بھی ہمارے لئے نہیں کھلی۔ اور جب یہ شکوک ان کے دلوں میں پیدا ہونے شروع ہوئے تو وہ گناہوں پر دلیر ہو گئے اور وعظ و پند کو بناوٹ سمجھ لیا اور خیال کر لیا کہ ہم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں وہ بھی

ہماری ہی طرح تھے اور نعوذ باللہ ان کے دل ہماری طرح ہی تاریک تھے اور لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے بڑے بڑے دعوے کرتے تھے۔

ان واقعات سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بے فائدہ مشقت بھی خطرناک ہوتی ہے اور نفس کو ایسے ابتلاؤں میں ڈالنا کہ جو غیر ضروری ہیں بجائے فائدہ کے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ جو تمام دنیا کے لئے رحمت ہو کر آئے تھے اپنے صحابہؓ کو روکتے تھے کہ وہ اپنے نفوس کو حد سے زیادہ مشقت میں نہ ڈالیں چنانچہ لکھا ہے کہ ایک صحابیؓ ایک دوست کے ہاں گئے تو آپ کو معلوم ہؤا کہ وہ سارا دن روزہ رکھتا اور رات کو تہجد میں وقت گزارتا ہے۔ اس پر انہوں نے انہیں ڈانٹا جس پر یہ معاملہ آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچا آپؐ نے فرمایا اس نے ٹھیک ڈانٹا کیونکہ انسان پر بہت سے حقوق ہیں ان کا پورا کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔

خود آنحضرتؐ کا عمل ثابت کرتا ہے کہ آپؐ ہمیشہ احکام الٰہی کے پورا کرنے میں چست رہتے اور ایسے جوش کے ساتھ خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے کہ جوان جوان صحابہؓ آپؐ کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے جیسا کہ میں بالتفصیل آپ کی عبادت کے ذکر میں لکھ آیا ہوں لیکن باوجود اس کے آپؐ آسان راہ کو قبول کرتے اور اپنے نفس کو بے فائدہ دکھ نہ دیتے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت تک عبادت کرو جب تک دل ملول نہ ہو جائے۔ حضرت عائشہؓ آپؐ کے اعمال کی نسبت فرماتی ہیں مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَمْرَيْنِ اِلَّا اَخَذَ اَيْسَرَهُمَا مَالَمْ يَكُنْ اِثْمًا فَاِنْ كَانَ اِثْمًا كَانَ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ (بخاری کتاب بدء الخلق باب صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم) رسول اللہ ﷺ کو کسی دو باتوں میں اختیار نہیں دیا گیا مگر آپؐ نے اسے قبول کیا جو دونوں میں سے آسان تر تھی بشرطیکہ گناہ نہ ہو اور اگر کسی کام میں گناہ ہوتا تو سب لوگوں سے زیادہ آپؐ اس سے بچتے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ آسان راہ کو اختیار کیا کرتے تھے اور تکلیف میں اپنے آپ کو نہ ڈالتے۔ ایک خیال جو اس حدیث سے پیدا ہو سکتا تھا کہ گویا آپؐ خدا کے راستہ میں مشقت نہ برداشت کر سکتے تھے (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ) اس کا رد بھی خود حضرت عائشہؓ نے فرما دیا کہ یہ بات اسی وقت تک تھی کہ جہاں دین کا معاملہ نہ ہو۔ اگر کسی موقع پر آسانی اختیار کرنا دین میں نقص پیدا کرتا ہو تو پھر آپ سے زیادہ اس آسانی کا دشمن کوئی نہ ہوتا۔ یہ وہ کمال ہے جس سے آپ کی ذات تمام انبیاء پر فضیلت رکھتی ہے کہ وہ اپنے اپنے رنگ میں کامل تھے لیکن آپؐ ہر رنگ میں کامل تھے۔ کوئی پہلو بھی تو انسانی زندگی کا ایسا نہیں جس میں آپؐ دوسروں سے پیچھے ہوں یا ان

کے برابر ہوں- ہر بات میں کمال ہے اور دوسروں سے بڑھ کر قدم مارا ہے اور ہر خوبی کو اپنی ذات میں جمع کر لیا ہے-

بے شک بہت سے لوگ ہیں کہ جو اپنی جان کو آرام میں رکھتے ہیں مگر خدا کو ناراض کرتے ہیں- لوگوں کو خوش کرتے ہیں- بعض خدا کو راضی کرنے کی کوشش میں اپنے نفس کو ایسے مصائب میں ڈالتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا قرب بھی نصیب نہیں ہوتا اور آگے سے بھی گمراہ ہوتے جاتے ہیں مگر میرا پیارا ہادی تو ساری دنیا کے لئے ہادی ہو کر آیا تھا وہ کسی خاص طرز یا مذاق کے لوگوں کا رہبر نہ تھا- ہر ملک اور قوم کے آدمی اسکی غلامی میں آئے تھے اس نے اپنے اخلاق کا ایک ایسا بے لوث اور مکمل نمونہ دکھایا ہے کہ کوئی آدمی اس کی غلامی میں آئے ناکام و نامراد نہیں رہتا بلکہ اپنے کامل دلی مقصد اور مدعا کو پالیتا ہے-

در حقیقت تعصب کو ایک طرف رکھ کر اگر دیکھا جائے تو آپ کی یہ صفت ایک ایسی حکیمانہ صفت تھی کہ اس پر جس قدر غور کیا جائے اس کے فوائد زیادہ روشن ہوتے جاتے ہیں- ایک ہی نسخہ ہوتا ہے جسے طبیب بھی بتاتا ہے اور ایک بڑھیا بھی بتاتی ہے لیکن وہ طبیب تو حکمت کی بناء پر اسے تجویز کرتا ہے اور بڑھیا صرف اس وجہ سے کہ اس کے کسی رشتہ دار کو کبھی اس سے فائدہ پہنچا تھا- یہی فرق روحانیت کے مدارج میں بھی ہوتا ہے- بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کوشش کرتے ہیں مگر ان کے افعال کی بناء جہالت پر ہوتی ہے اور وہ حکمت سے کام نہیں لیتے مگر رسول کریم ﷺ کے تمام کاموں کی بناء علم پر تھی- آپؑ خوب جانتے تھے کہ کسی چیز سے اپنی طاقت سے زیادہ کام لینے کے یہ معنے ہیں کہ اسے ہمیشہ کے لئے کام سے معطل کر دیا جائے- اس لئے آپ اپنے قویٰ کو بر محل اور بر موقع استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ سب مقابلہ کرنے والوں سے آگے نکل گئے اور کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جو آپؑ سے آگے نکلنا تو کجا آپ کی برابری بھی کر سکے- اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ-

وقار

وقار ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں عالی حوصلگی، حلم اور بڑائی، چونکہ لوگ عام طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے اس کے معانی سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے معنے کر دوں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ جب میں وقار کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میری مراد کیا ہوتی ہے- چونکہ عام طور سے یہ لفظ اردو میں عزت کے معنے میں استعمال ہونے لگا ہے اور عام لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑے وقار والا ہے اور اس سے

ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ بڑی عزت والا ہے یا معزز ہے لیکن دراصل اس لفظ سے گو بڑائی اور عزت کے معنے نکلتے ہیں لیکن اس سے مراد نفس کی بڑائی ہوتی ہے یعنی جس شخص میں چھچھوراپن، کمینگی اور ہلکاپن نہ ہو- ذرا ذرا سی بات پر چڑ نہ جائے لوگوں کی باتیں سنکر ان پر حوصلہ نہ ہار دے- مخالف کی باتوں کو ایک حد تک برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہو- اسے صاحب وقار کہیں گے- اور جو رذیل لوگوں کی صحبت میں رہتا ہو' چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑ جاتا ہو، ذرا ذرا سی تکلیف پر گھبرا جاتا ہو، چھوٹے چھوٹے مصائب پر ہمت ہار بیٹھتا ہو وہ صاحب وقار نہیں ہوگا- خواہ اسکے پاس کتنی ہی دولت ہو اور کیسے ہی عظیم الشان عہدہ پر مقرر ہو- پس گو وقار کے معنوں میں عظمت اور بڑائی بھی ہے مگر میری اس جگہ وقار سے وہی مراد ہے جو مَیں نے پہلے بیان کر دی ہے-

آنحضرت ﷺ کو جو عہدہ اور شان اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی وہ دنیاوی بادشاہوں سے کسی صورت میں کم نہ تھی- اور گو آپ خود اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے اپنی عظمت کا اظہار نہ کرتے ہوں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ آپؐ ایک بادشاہ تھے اور تمام عرب آپؐ کے ماتحت ہو گیا تھا اور اگر آپؐ ان سب طریقوں کو اختیار کر لیتے جو اس وقت کے بادشاہوں میں مروج تھے تو دنیاوی نقطۂ خیال سے آپؐ پر کوئی الزام قائم نہیں ہو سکتا تھا اور آپؐ دنیاوی حکومتوں کی نظر میں بالکل حق بجانب ہوتے لیکن آپؐ کی عزت اس بادشاہت کی وجہ سے نہ تھی جو شہروں اور ملکوں پر حکومت کے نام سے مشہور ہے بلکہ دراصل آپؐ کی عزت اس بادشاہت کی وجہ سے تھی جو آپؐ کو اپنے دل پر حاصل تھی- جو آپؐ کو دوسرے لوگوں کے دلوں پر حاصل تھی- آپ نے باوجود بادشاہ ہونے کے اس طریق کو اختیار نہ کیا جس پر بادشاہ چلتے ہیں اور اپنی عظمت کے اظہار کے لئے وہ نمائشیں نہ کیں جو سلطان کیا کرتے ہیں کیونکہ آپ نبیؐ تھے اور نبیوں کے سردار تھے اور بادشاہ ہو کر جو معاملہ آپؐ نے اتباع سے کیا وہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ آپؐ کا نفس کیسا پاک تھا اور ہر قسم کے بد اثرات سے کیسا منزّہ تھا-

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سَاَلْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الصَّلٰوۃُ عَلٰی وَقْتِھَا قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ اَلْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ حَدَّثَنِیْ بِھِنَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَوِ اسْتَزَدْتُہٗ لَزَادَنِیْ (صحیح بخاری کتاب المواقیت باب فضل الصلوۃ لوقتھا) میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پیارا ہے- فرمایا نماز اپنے وقت پر ادا کرنا- میں نے عرض کیا یارسول

اللہ پھر کونسا عمل- فرمایا کہ والدین سے نیکی کرنا- میں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر کون سا عمل ہے- فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کوشش کرنا- عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ مجھ سے نبی کریمؐ نے یہ بیان فرمایا اور اگر میں آپؐ سے اور پوچھتا تو آپؐ اور بتاتے-

بظاہر تو یہ حدیث ایک ظاہر بین کو معمولی معلوم ہوتی ہوگی لیکن غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپؐ کا وقار کیسا تھا کہ صحابہؓ آپؐ سے جس قدر سوال کئے جائیں آپؐ گھبراتے نہ تھے بلکہ جواب دیتے چلے جاتے اور صحابہؓ کو یقین تھا کہ آپؐ ہمیں ڈانٹیں گے نہیں- امراء کو ہم دیکھتے ہیں کہ ذرا کسی نے دو دفعہ سوال کیا اور چیں بجبیں ہو گئے- کیا کسی کی مجال ہے کہ کسی بادشاہ وقت سے بار بار سوال کرتا جائے اور وہ اسے کچھ نہ کہے بلکہ بادشاہوں اور امراء سے تو ایک دفعہ سوال کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور وہ سوالات کو پسند ہی نہیں کرتے اور سوال کرنا اپنی شان کے خلاف اور بے ادبی جانتے ہیں اور اگر کوئی ان سے سوال کرے تو اس پر سخت غضب نازل کرتے ہیں-

اس کے مقابلہ میں ہم رسول کریم ﷺ کو جانتے ہیں کہ باوجود ایک ملک کے بادشاہ ہونے کے طبیعت میں ایسا وقار ہے کہ ہر ایک چھوٹا بڑا جو دل میں آئے آپ سے پوچھتا ہے اور جس قدر چاہے سوال کرتا ہے- لیکن آپ اس پر بالکل ناراض نہیں ہوتے بلکہ محبت اور پیار سے جواب دیتے ہیں اور اس محبت کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے دلوں میں یقین کر لیتے ہیں کہ ہم جس قدر بھی سوال کرتے جائیں آپ ان سے اکتائیں گے نہیں- کیونکہ جو حدیث مَیں اوپر لکھ آیا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اس موقع پر آپؐ اعتراضات سے نہ گھبرائے بلکہ آپؐ کی یہ عادت تھی کہ آپؐ دین کے متعلق سوالات سے نہ گھبراتے تھے کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جتنے سوال آپؐ سے کئے آپ نے ان کا جواب دیا- اور پھر فرماتے ہیں کہ لَوِ اسْتَزَدْتُہٗ لَزَادَ - اگر میں اور سوال کرتا تو آپؐ پھر بھی جواب دیتے- اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ آپ جس قدر سوالات بھی کرتے جائیں آنحضرت ﷺ اس پر ناراض نہ ہوں گے بلکہ ان کا جواب دیتے جائیں گے اور یہ نہیں ہو سکتا تھا جب تک رسول کریم ﷺ کی عام عادت یہ نہ ہو کہ آپ ہر قسم کے سوالات کا جواب دیتے جائیں-

دیگر احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ صحابہؓ کے سوالات پر خفا نہ ہوتے تھے بلکہ بڑی خندہ پیشانی سے ان کے جواب دیتے تھے اور یہ آپؐ کے وقار کے اعلیٰ درجہ پر شاہد ہے کیونکہ معمولی طبیعت کا آدمی بار بار سوال پر گھبرا جاتا ہے مگر آپؐ باوجود ایک ملک کے بادشاہ ہونے کے

رحمت و شفقت کا ایسا اعلیٰ نمونہ دکھاتے رہے جو عام انسان تو کجا دیگر انبیاء بھی نہ دکھا سکے۔

اس حدیث کے علاوہ ایک اور حدیث بھی ہے جس سے آپ ؐ کے وقار کا علم ہو سکتا ہے۔ اور گو یہ حدیث مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں کیونکہ اس سے آپ ؐ کے یقین اور ایمان پر بھی روشنی پڑتی ہے لیکن چونکہ اس حدیث سے آپ کے وقار کا حال بھی کھلتا ہے اس لئے اس جگہ بھی بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سراقہ بن جعشم کہتا ہے کہ جب رسول کریم ؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو مجھے اطلاع ملی کہ آپ ؐ کے لئے اور حضرت ابو بکرؓ کے لئے مکہ والوں نے انعام مقرر کیا ہے جو ایسے شخص کو دیا جائے گا جو آپ ؐ کو قتل کر دے یا قید کرلائے۔ اس پر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا اور چاہا کہ جس طرح ہو آپکو گرفتار کرلوں تا اس انعام سے متمتع ہو کر اپنی قوم میں مالدار رئیس بن جاؤں۔ جب میں آپ کے قریب پہنچا میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں زمین پر گر پڑا۔ اس پر میں نے اٹھ کر تیروں سے فال نکالنی چاہی کہ آیا یہ کام اچھا ہے یا برا کروں یا نہ کروں اور تیروں میں سے وہ جواب نکلا جسے میں ناپسند کرتا تھا یعنی مجھے آپ کا تعاقب نہیں کرنا چاہیے۔ مگر پھر بھی میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور آپ کے پیچھے بھاگا اور اس قدر نزدیک ہو گیا کہ آپ کی قراءت کی آواز آنے لگی اور میں نے آپ ؐ کو دیکھا کہ آپ ؐ بالکل کسی طرف نہ دیکھتے تھے مگر حضرت ابو بکرؓ بار بار ادھر ادھر دیکھتے جاتے تھے۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ میں صفت وقار نہایت اعلیٰ درجہ پر تھی اور آپ ؐ خطرناک سے خطرناک اوقات میں بھی اپنے نفس کی بڑائی کو نہ چھوڑتے تھے۔ اور خواہ آپ ؐ کو گھر میں بیٹھے ہوئے اپنے شاگردوں سے معاملہ کرنا پڑے جو دین کی جدت کی وجہ سے بار بار سوال کرنے پر مجبور تھے اور خواہ میدان جنگ میں دشمن کے ملک میں خطرناک دشمنوں کے مقابلہ میں آنا پڑے ہر دو صورتوں میں آپ ؐ اپنے وقار کو ہاتھ سے نہ دیتے۔ اور جس وقت صابر سے صابر اور دلیر سے دلیر انسان چڑ چڑاہٹ اور گھبراہٹ کا اظہار کرے اس وقت بھی آپ ؐ وقار پر قائم رہتے اور تعلیم اور جنگ دو ہی موقعہ ہوتے ہیں جہاں وقار کا امتحان ہوتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی وجہ سے استادوں کو اپنے اخلاق کے درست کرنے کی کیسی ضرورت رہتی ہے اور جو استاد اس بات سے غافل ہو جائے اور اپنی ذمہ داری کو نہ سمجھے بہت جلد طلباء اس کے اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں یہی حال میدان جنگ میں بہادر سپاہی کا ہوتا ہے جو باوجود جرأت اور بہادری کے بعض اوقات وقار کھو بیٹھتا ہے اور چھچھوراپن اور گھبراہٹ کا اظہار کر بیٹھتا ہے مگروہ نیکوں کلنیک

بہادروں کا بہادر ان سب عیوب سے پاک تھا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ۔

جرأت

انسان کی اعلیٰ درجہ کی خصال میں سے ایک جرأت بھی ہے۔ جرأت کے بغیر انسان بہت سے نیک کاموں سے محروم رہ جاتا ہے۔ جرأت کے بغیر انسان دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا۔ جرأت کے بغیر انسان اپنے ہم عصروں کی نظروں میں ذلیل و سبک رہتا ہے۔ غرض کہ جرأت ' بہادری ' دلیری اعلیٰ درجہ کی صفات میں سے ہیں اور جس انسان میں یہ خصلتیں ہوں وہ دوسروں کی نظر میں ذلیل نہیں ہو سکتا۔

جب کہ آنحضرت ﷺ جامع کمالات انسانی تھے اور ہر ایک بات میں جو انسان کی زندگی کو بلند اور اعلیٰ کرنے والی ہو دوسرے کے لئے نمونہ اور اسوہ حسنہ تھے اور جو عمل یا قول یا خوبی یا نیکی سے تعبیر کیا جا سکے اس کے آپ معلّم تھے اور کل پاک جذبات کو ابھارنے کے لئے ان کا وجود خضر راہ تھا تو ضروری تھا کہ آپؐ اس صفت میں بھی خاتم الانبیاء والاولیاء بلکہ خاتم الناس ہوں اور کوئی انسان اس حسن میں آپ پر فائق نہ ہو سکے چنانچہ آپ کی زندگی پر غور کرنے والے معلوم کر سکتے ہیں کہ آپ نے اپنی عمر میں بہادری اور جرأت کے وہ اعلیٰ درجہ کے نمونے دکھائے ہیں کہ دنیا میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی بلکہ تاریخیں بھی ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں لیکن چونکہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ موجودہ صورت میں مَیں صرف وہ واقعات جو بخاری میں درج ہیں پیش کروں گا اس لئے اس جگہ صرف ایک دو واقعات پر کفایت کرتا ہوں۔

دراصل اگر غور کیا جائے تو آنحضرت ﷺ کی مکہ کی زندگی ہی بہادری کا ایک ایسا اعلیٰ نمونہ ہے کہ اسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تیرہ سال تک ایک ایسے مقام پر رہنا کہ جہاں سوائے چند انفاس کے اور سب لوگ دشمن اور خون کے پیاسے ہیں اور بغیر خوف کے لوگوں کو اپنے دین کی باتیں سنانا اور پھر ایسے دین کی جو لوگوں کی نظر میں نہایت حقیر اور مکروہ تھا۔ کوئی ایسا کام نہیں جس کے معلوم ہونے پر آپ کے کمالات کا نقشہ آنکھوں تلے نہ کھنچ جاتا ہو۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں کیسے کیسے دشمنوں کا آپ کو مقابلہ کرنا پڑا۔ انواع و اقسام کے عذابوں سے انہوں نے آپؐ کے قدم صدق کو ڈگمگانا چاہا لیکن آپؐ نے وہ بہادری کا نمونہ دکھایا کہ ہزارہا دشمنوں کے مقابلہ میں تن تنہا سینہ سپر رہے اور اپنے دشمنوں کے سامنے اپنی آنکھ نیچی نہ کی اور جو پیغام خدا کی طرف سے لے کر آئے تھے اسے کھلے الفاظ میں بغیر کسی اخفاء و اسرار کے لوگوں تک پہنچاتے رہے غرض کہ آپؐ کی زندگی تمام کی تمام جرأت و دلیری کا ایک بے مثل نمونہ ہے مگر جگہ کی قلت کی وجہ سے میں ایک

دو واقعات سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ کَانَ فَزَعٌ بِالْمَدِیْنَۃِ فَاسْتَعَارَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَرَسًا لَنَا یُقَالُ لَہٗ مَنْدُوْبٌ فَقَالَ مَا رَاَیْنَا مِنْ فَزَعٍ وَاِنْ وَجَدْنَاہُ لَبَحْرًا (بخاری کتاب الجھاد باب اسم الفرس والحمار) مدینہ میں کچھ گھبراہٹ تھی پس نبی کریم ﷺ نے ہمارا گھوڑا مستعار لیا جس کا نام مندوب تھا اور فرمایا کہ ہم نے کوئی گھبراہٹ کی بات نہیں دیکھی اور ہم نے تو اس گھوڑے کو سمندر پایا یعنی نہایت تیز و تند۔ حضرت انسؓ نے ایک حدیث میں اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ایک دفعہ مدینہ میں کسی غنیم کے حملہ آور ہونے کی خبر تھی اور مسلمانوں کو ہر وقت اس کے حملہ آور ہونے کا انتظار تھا۔ایک رات اچانک شور ہوا اور دور کچھ آوازیں سنائی دیں۔ صحابہؓ فوراً جمع ہونے شروع ہوئے اور ارادہ کیا کہ جمع ہو کر چلیں اور دیکھیں کہ کیا غنیم حملہ آور ہونے کے لئے آرہا ہے۔ وہ تو ادھر جمع ہوتے اور تیار ہوتے رہے اور ادھر رسول کریم ﷺ بغیر کسی کو اطلاع دیئے ایک صحابیؓ کا گھوڑا لے کر سوار ہو کر جدھر سے آوازیں آرہی تھیں ادھر دوڑے اور جب لوگ تیار ہو کر چلے تو آپؐ انہیں مل گئے اور فرمایا کہ گھبراہٹ کی تو کوئی وجہ نہیں شور معمولی تھا۔ اور اس گھوڑے کی نسبت فرمایا کہ بڑا تیز گھوڑا ہے اور سمندر کی طرح ہے یعنی لہریں مار کر چلتا ہے۔

اس واقعہ سے ہر ایک شخص معلوم کر سکتا ہے کہ آپؐ کیسے دلیر و جری تھے کہ شور سنتے ہی فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کی خبر لینے کو چلے گئے اور اپنے ساتھ کوئی فوج نہ لی۔ لیکن جب اس واقعہ پر نظر غائر ڈالی جائے تو چند ایسی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں کہ جن کی وجہ سے اس واقعہ کو معمولی جرأت و دلیری کا کام نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ واقعہ خاص طور پر ممتاز معلوم ہوتا ہے۔

اول امر جو قابل لحاظ ہے یہ ہے کہ جرأت و دلیری دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ جو بعض اوقات بزدل سے بزدل انسان بھی دکھا دیتا ہے اور اس کا اظہار کمال مایوسی یا انقطاع اسباب کے وقت ہوتا ہے اور ایک وہ جو سوائے دلیر اور قوی دل کے اور کوئی نہیں دکھا سکتا۔ پہلی قسم کی دلیری ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے ایسے جانوروں سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے جو جرأت کی وجہ سے مشہور نہیں ہیں مثلاً مرغی ان جانوروں میں سے نہیں ہے کہ جو جرأت کی صفت سے متصف ہیں بلکہ نہایت ڈرپوک جانور ہے مگر بعض اوقات جب بلی یا چیل اس کے بچوں پر حملہ کرے تو یہ اپنی چونچ سے اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ اور بعض اوقات تو ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ چیل مرغی کا بچہ اٹھا کر لے گئی تو وہ اس کے پیچھے اس زور سے کودی کہ دو دو گز تک اس کا مقابلہ کیا۔ حالانکہ مرغی لڑنے والے جانوروں میں

سے نہیں ہے۔ مرغی تو خیر پھر بھی بڑا جانور ہے چڑیا تک اپنے سے کئی کئی گنے جانوروں کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتی ہے مگر یہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ دیکھ لے کہ اب کوئی مفرّ نہیں اور میری یا میرے بچوں کی خیر نہیں۔ جب جانوروں میں اس قدر عقل ہے کہ وہ جب مصیبت اور بلا میں گھر جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اب سوائے موت کے اور کوئی صورت نہیں تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور حتّی الوسع دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں تو انسان جو اشرف المخلوقات ہے وہ اس صفت سے کب محروم رہ سکتا ہے چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بعض انسان جو معمولی اوقات میں نہایت بزدل اور کمزور ثابت ہوئے تھے جب کسی ایسی مصیبت میں پھنس گئے کہ اس سے نکلنا ان کی عقل میں محالات سے تھا تو انہوں نے اپنے دشمنوں کا ایسی سختی سے مقابلہ کیا کہ ان پر غالب آ گئے اور جیت گئے اور ایسی جرأت دکھائی کہ دوسرے مواقع میں بڑے بڑے دلیروں سے بھی نہ ظاہر ہوتی تھی۔ پس ایک جرأت وہ ہوتی ہے جو انقطاع اسباب کے وقت ظاہر ہوتی ہے اور بزدل کو بہادر اور ضعیف کو توانا اور ڈرپوک کو دلیر بنا دیتی ہے مگر یہ کوئی اعلیٰ درجہ کی صفت نہیں کیونکہ اس میں چھوٹے بڑے، ادنیٰ اور اعلیٰ سب شریک ہیں قابل تعریف جرأت وہ ہے جو ایسے اوقات میں ظاہر ہو کہ اسباب کا انقطاع نہ ہوا ہو۔ بہت کچھ امیدیں ہوں۔ بھاگنے اور بچنے کے راستے کھلے ہوں یعنی انسان اپنی مرضی سے جان بوجھ کر کسی خطرہ کی جگہ میں چلا جائے نہ یہ کہ اتفاقاً کوئی مصیبت سر پر آ پڑی تو اس پر صبر کر کے بیٹھ رہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ رسولؐ کریم ﷺ سے جو اس وقت جرأت کا اظہار ہوا ہے تو یہ جرأت دوسری قسم کی ہے اگر آپ اتفاقاً کہیں جنگل میں دشمن کے نرغہ میں آ جاتے اور اس وقت جرأت سے اس کا مقابلہ کرتے تو وہ اور بات ہوتی اور یہ اور بات تھی کہ آپؐ رات کے وقت تن تنہا بغیر کسی محافظ دستہ کے دشمن کی خبر لینے کو نکل کھڑے ہوئے۔ اگر آپؐ نہ جاتے تو آپؐ مجبور نہ تھے۔ ایسے وقت میں باہر نکلنا افسروں کا کام نہیں ہوتا۔ صحابہؓ آپ خبر لاتے اور اگر جانا ہی تھا تو آپؐ دوسروں کا انتظار کر سکتے تھے مگر وہ قوی دل جس کے مقابلہ میں شیر کا دل بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا اس بات کی کیا پرواہ کرتا تھا۔ شور کے سنتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر خبر لانے کو چل دیئے اور ذرا بھی کسی قسم کا تردّد یا فکر نہیں کیا۔

دوسرا امر جو اس واقعہ کو ممتاز کر دیتا ہے یہ ہے کہ آپؐ نے ایسے وقت میں ایسا گھوڑا لیا جس پر سواری کے آپ عادی نہ تھے حالانکہ ہر ایک گھوڑے پر سوار ہونا ہر ایک آدمی کا کام نہیں ہوتا۔

ایسے خطرہ کے وقت ایک ایسے تیز گھوڑے کو لے کر چلے جانا جو اپنی سختی میں مشہور تھا یہ بھی آپ کی خاص دلیری پر دلالت کرتا ہے۔

تیسرا امر جو اس واقعہ کو عام جرأت کے کارناموں سے ممتاز کرتا ہے وہ آپؐ کی حیثیت ہے۔ اگر کوئی معمولی سپاہی ایسا کام کرے تو وہ بھی تعریف کے قابل تو ہوگا مگر ایسا نہیں ہو سکتا جیسا کہ افسرو بادشاہ کا فعل۔ کیونکہ اس سپاہی کو وہ خطرات نہیں جو بادشاہ کو ہیں۔ اول تو سپاہی کو مارنے یا گرفتار کرنے کی ایسی کوشش نہیں کی جاتی جتنی بادشاہ یا امیر کے گرفتار کرنے یا مارنے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ اس کے مارنے یا قید کر لینے سے فیصلہ ہی ہو جاتا ہے۔ دوسرے سپاہی اگر مارا جائے تو چنداں نقصان نہیں بادشاہ کی موت ملک کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ پس باوجود ایک بادشاہ کی حیثیت رکھنے کے آپؐ کا اس وقت دشمن کی تلاش میں جانا ایک ایسا ممتاز فعل ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

غزوۂ حنین رسول کریم ﷺ ہی دنیا کے لئے ایک کامل نمونہ ہو سکتے ہیں کیونکہ آپؐ ہر ایک امر میں دوسرے انسانوں سے افضل ہیں اور ہر ایک نیکی میں دوسروں کے لئے رہنما ہیں۔ ہر ایک پاک صفت آپ میں پائی جاتی ہے اور آپ کا کمال دیکھ کر آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں اور آپ کے نور سے دل منور ہو جاتے ہیں۔ علماء میں آپؐ سربر آوردہ ہیں۔ متقیوں میں آپؐ افضل ہیں۔ انبیاء میں آپؐ سردار ہیں۔ ملک داری میں آپ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جرأت میں آپؐ فرد وحید ہیں۔ غرض کہ ہر ایک امر میں آپؐ خاتم ہیں اور آپؐ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

میں نے پیچھے آپؐ کی جرأت کا ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ کس طرح آپؐ سب صحابہؓ سے پہلے خطرہ کے معلوم کرنے اور دشمن کی خبر لینے کے لئے تن تنہا چلے گئے۔ اب میں ایک اور واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے پڑھنے والے کو خوب اچھی طرح سے معلوم ہو جائے گا کہ جو کرشمے بہادری اور جرأت کے آپؐ نے دکھلائے وہ کوئی اور انسان نہیں دکھا سکتا۔

جو لوگ جنگ کی تاریخ سے واقف و آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ دشمن کا سب سے زیادہ زور افسروں اور جرنیلوں کو نقصان پہنچانے پر خرچ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ اسی بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ سردار لشکر اور اس کے سٹاف کو قتل و ہلاک کر دیا جائے اور یہ اصل ایسی ہے کہ پرانے زمانہ سے اس پر عمل ہوتا چلا آیا ہے بلکہ پرانے زمانہ میں تو جنگ کا دارومدار ہی اس پر تھا کہ افسر کو

قتل یا قید کرلیا جائے۔ اور اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ پچھلے زمانہ میں خود بادشاہ میدان جنگ میں آتے تھے اور آپ ہی فوج کی کمان کرتے تھے اس لئے ان کا قتل یا قید ہو جانا بالکل شکست کے مترادف ہوتا تھا اور بادشاہ کے ہاتھ سے جاتے رہنے پر فوج بے دل ہو جاتی تھی اور اس کے قدم اکھڑ جاتے تھے اور اس کی مثال ایسی ہی ہو جاتی تھی جیسے بے سر کا جسم۔ کیونکہ جس کی خاطر لڑتے تھے وہی نہ رہا تو لڑائی سے کیا فائدہ۔ پس بادشاہ یا سردار کا قتل یا قید کرلینا بڑی سے بڑی شکستوں سے زیادہ مفید اور نتائج قطعیہ پر منتج تھا اس لئے جس قدر خطرہ بادشاہ کو ہوتا تھا اتنا اور کسی انسان کو نہ ہوتا۔

اس بات کو جو شخص اچھی طرح سمجھ لے اسے ذیل کا واقعہ محو حیرت بنا دینے کے لئے کافی ہے عَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا اَنَّہٗ قَالَ لَہٗ رَجُلٌ اَفَرَرْتُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ حُنَیْنٍ قَالَ لٰكِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ یَفِرَّ اِنَّ هَوَازِنَ كَانُوْا قَوْمًا رُمَاةً وَاِنَّا لَمَّا لَقِیْنَا هُمْ حَمَلْنَا عَلَیْهِمْ فَانْهَزَمُوْا فَاَقْبَلَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلَی الْغَنَائِمِ وَاسْتَقْبَلُوْنَا بِالسِّهَامِ فَاَمَّا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ یَفِرَّ فَلَقَدْ رَاَیْتُہٗ وَاِنَّہٗ لَعَلٰی بَغْلَتِہِ الْبَیْضَآءِ وَاِنَّ اَبَا سُفْیَانَ اٰخِذٌ بِلِجَامِهَا وَالنَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَنَا النَّبِیُّ لَا كَذِبْ۔ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ (بخاری کتاب الجهاد باب من قاد دابۃ غیرہ فی الحرب)

براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ آپ سے کسی نے کہا کہ کیا تم لوگ جنگ حنین کے دن رسول کریمؐ کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ آپؓ نے جواب میں کہا کہ رسول کریم ﷺ نہیں بھاگے۔ ہوازن ایک تیرانداز قوم تھی اور تحقیق ہم جب ان سے ملے تو ہم نے ان پر حملہ کیا اور وہ بھاگ گئے۔ ان کے بھاگنے پر مسلمانوں نے ان کے اموال جمع کرنے شروع کئے لیکن ہوازن نے ہمیں مشغول دیکھ کر تیر برسانے شروع کئے پس اور لوگ تو بھاگے مگر رسول کریم ﷺ نہ بھاگے بلکہ اس وقت میں نے دیکھا تو آپؐ اپنی سفید خچر پر سوار تھے اور ابو سفیان نے آپؐ کے خچر کی لگام پکڑی ہوئی تھی اور آپؐ فرما رہے تھے میں نبیؐ ہوں یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں عبد المطلب کی اولاد میں سے ہوں۔

اس واقعہ کی اہمیت کے روشن کرنے کے لئے میں نے پہلے بتایا تھا کہ بادشاہ لشکر میں سب سے زیادہ خطرہ میں ہوتا ہے کیونکہ جو نقصان بادشاہ کے قتل یا قید کرلینے سے لشکر کو پہنچتا ہے وہ کوئی ہزار

سپاہیوں کے مارے جانے سے نہیں پہنچتا۔ پس دشمن کو جس قدر آپ کا تجسّس ہو سکتا تھا اور کسی کا نہیں۔ پس جبکہ اچانک دشمن کا حملہ ہؤا اور وہ اپنے پورے زور سے ایک عارضی غلبہ پانے میں کامیاب ہؤا اور لشکر اسلام اپنی ایک غلطی کی وجہ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہؤا تو دشمن کے لئے ایک غیر مترقبہ موقع تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ پر حملہ کرتا اور اپنے مدت کے بغض اور عناد کو عملی جامہ پہناتا۔ پس ایسی صورت میں آپؐ کا وہاں کھڑا رہنا ایک نہایت خطرناک امر تھا جو نہایت بہادری اور جرأت چاہتا تھا اور عام عقل انسانی اس واقعہ کی تفصیل کو دیکھ کر ہی حیران ہو جاتی ہے کہ کس طرح صرف چند آدمیوں کے ساتھ آپؐ وہاں کھڑے رہے۔

آپؐ کے ساتھ اس وقت بارہ ہزار بہادر سپاہی تھے جو ایک سے ایک بڑھ کر تھا اور سینکڑوں مواقع پر کمال جرأت دکھلا چکا تھا مگر حنین میں کچھ ایسی ابتری پھیلی اور دشمن نے اچانک تیروں کی ایسی بوچھاڑ کی کہ بہادر سے بہادر سپاہی کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ تاب مقابلہ نہ لا سکا حتّٰی کہ جنگ کا عادی بلکہ میدان جنگ کا تربیت یافتہ عرب کا گھوڑا بھی گھبرا کر بھاگا اور بعض صحابہؓ کا بیان ہے کہ اس شدت کا حملہ تھا کہ ہم باوجود کوشش کے نہ سنبھل سکتے تھے اور چاہتے تھے کہ پاؤں جما کر لڑیں مگر قدم نہ جمتے تھے اور ہم اپنے گھوڑوں کو واپس کرتے تھے لیکن گھوڑے نہ لوٹتے اور ہم اس قدر ان کی باگیں کھینچتے تھے کہ گھوڑے دوہرے ہو جاتے تھے مگر پھر آگے کو ہی بھاگتے تھے اور واپس نہ لوٹتے تھے۔ پس اس خطرناک وقت میں جب ایک جرار لشکر پیٹھ پھیر چکا ہو ایک شخص تن تنہا صرف چند وفادار خدام کے ساتھ دشمن کے مقابلہ میں کھڑا رہے اور تیروں کی بارش کی ذرا بھی پرواہ نہ کرے تو یہ ایک ایسا فعل نہیں ہو سکتا جو کسی معمولی جرأت یا دلیری کا نتیجہ ہو بلکہ آپ کے اس فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے سینہ میں ایک ایسا دل رکھتے تھے جو کسی سے ڈرنا جانتا ہی نہ تھا اور خطرناک دشمن کے مقابلہ میں ایسے وقت جبکہ اس کے پاس کوئی ظاہر سامان موجود نہ ہو کھڑا رہنا اس کے لئے ایک معمولی کام تھا اور یہ ایک ایسا دلیرانہ کام ہے ایسی جرأت کا اظہار ہے کہ جس کی نظیر اولین و آخرین کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

آپؐ (فداہ ابی و امی) خوب جانتے تھے کہ کفار عرب کو اگر کسی جان کی ضرورت ہے تو میری جان کی۔ اگر وہ کسی کے دشمن ہیں تو میرے دشمن ہیں۔ اگر وہ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو مجھے۔ مگر باوجود اس علم کے 'باوجود بے یار و مددگار ہونے کے آپؐ ایک قدم پیچھے نہ ہٹے بلکہ اس خیال سے کہ کہیں خچر ڈر کر نہ بھاگ جائے ایک آدمی کو باگ پکڑوا دی کہ اسے پکڑ کر آگے بڑھاؤ تا یہ بے بس

ہو کر بھاگ نہ جائے۔ بے شک چند آدمی آپؐ کے ساتھ اور بھی رہ گئے تھے مگر وہ اول تو اس عشق کی وجہ سے جو انہیں رسول کریمؐ کے ساتھ تھا وہاں کھڑے رہے دوسرے ان کی جان اس خطرہ میں نہ تھی جس میں آنحضرت کی جان تھی۔ پس باوجود کمال دلیری کے آپؐ کی جرأت کا مقابلہ وہ لوگ بھی نہیں کر سکتے جو اس وقت آپؐ کے پاس کھڑے رہے۔ اس جگہ ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایسے وقت میں ایک بہادر انسان اپنی ذلت کے خوف سے جان دینے پر آمادہ بھی ہو جائے اور بھاگنے کا خیال چھوڑ بھی دے تب بھی وہ یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ دشمن کو للکارے اور اگر للکارے بھی تو کمال مایوسی کا اظہار کرتا ہے اور جان دینے کے لئے آمادگی ظاہر کرتا ہے مگر آپؐ نے اس خطرناک وقت میں بھی پکار کر کہا کہ میں خدا کا نبی ہوں یہ جھوٹ نہیں اور میں عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں جس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خطرناک وقت میں بھی آپ گھبرائے نہیں بلکہ ان لوگوں کو پکار کر سنا دیا کہ میں تو سچا ہوں اور خدا کی طرف سے ہوں تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو۔ پس ایسے خطرناک موقع پر خون کے پیاسے دشمنوں کے مقابلہ میں کھڑا رہنا پھر انہیں اپنی موجودگی کی اطلاع خود نعرہ مار کر دینا پھر کامل اطمینان اور یقین سے فتح کا اظہار کرنا ایسے امور ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے کوئی شخص میرے آقاؐ کے مقابلہ میں جرأت و دلیری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

مال کے متعلق احتیاط

آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق بادشاہ بھی بنا دیا تھا اور گو آپؐ کے مخالفین نے ناخنوں تک زور مارا مگر خدا کے وعدوں کو پورا ہونے سے کون روک سکتا ہے باوجود ہزاروں بلکہ لاکھوں دشمنوں کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنے دشمنوں پر فتح دی اور وہ سب آپؐ کے سامنے گردنیں جھکا دینے پر مجبور ہوئے اور انہیں چار و ناچار آپؐ کے آگے سر نیاز مندی جھکانا پڑا۔ مختلف ممالک سے زکوۃ وصول ہو کر آنے لگی جس کا انتظام آپؐ ہی کرتے تھے مگر جس رنگ میں کرتے تھے اسے دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے۔

آجکل کے بادشاہوں کو دیکھو کہ وہ لوگوں کا روپیہ کس طرح بے دریغ اڑا رہے ہیں۔ وہ مال جو غرباء کے لئے جمع ہو کر آتا ہے اسے اپنے اوپر خرچ کر ڈالتے ہیں اور ان کے خزانوں کا کوئی حساب نہیں۔ اگر وہ اپنے خاص اموال کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں تو ان پر کوئی اعتراض نہ ہو مگر غرباء کے اموال جو صرف تقسیم کرنے کے لئے ان کے سپرد کئے جاتے ہیں ان پر بھی وہ ایسا دست تصرف پھیرتے ہیں کہ جیسے خاص ان کا اپنا مال ہے اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں۔ مگر آنحضرت

ﷺ کا حال بالکل اس کے برخلاف تھا۔ آپ کبھی لوگوں کے اموال پر ہاتھ نہ ڈالتے بلکہ باوجود اپنے لاثانی تقویٰ اور بے نظیر خشیت الٰہی کے آپ لوگوں کے اموال کو اپنے گھر بھی رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت عقبہ ؓ فرماتے ہیں کہ صَلَّیْتُ وَرَآءَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِیْنَۃِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ مُسْرِعًا یَتَخَطّٰی رِقَابَ النَّاسِ اِلٰی بَعْضِ حُجَرِ نِسَآئِہٖ فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِہٖ فَخَرَجَ عَلَیْھِمْ فَرَاٰی اَنَّھُمْ عَجِبُوْا مِنْ سُرْعَتِہٖ فَقَالَ ذَکَرْتُ شَیْئًا مِنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا فَکَرِھْتُ اَنْ یَّحْبِسَنِیْ فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِہٖ (بخاری کتاب الصلوۃ باب من صلی بالناس فذکر حاجۃً) میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے مدینے میں عصر کی نماز پڑھی۔ پس آپ نے سلام پھیرا اور جلدی سے کھڑے ہو گئے اور لوگوں کی گردنوں پر سے کودتے ہوئے اپنی بیویوں میں سے ایک کے حجرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ لوگ آپکی اس جلدی کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ پس جب باہر تشریف لائے تو معلوم کیا کہ لوگ آپؐ کی جلدی پر متعجب ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے یاد آ گیا کہ تھوڑا سا سونا ہمارے پاس رہ گیا ہے اور میں نے ناپسند کیا کہ وہ میرے پاس پڑا رہے اس لئے میں نے جا کر حکم دیا کہ اسے تقسیم کر دیا جائے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مال کے معاملہ میں نہایت محتاط تھے اور کبھی پسند نہ فرماتے کہ کسی بھول چوک کی وجہ سے لوگوں کا مال ضائع ہو جائے۔ آپ کی نسبت یہ تو خیال کرنا بھی گناہ ہے کہ نعوذ باللہ آپ اپنے نفس پر اس بات سے ڈرے ہوں کہ کہیں اس سونے کو میں نہ خرچ کر لوں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ آپ اس بات سے ڈرے کہ کہیں جہاں رکھا ہو وہیں نہ پڑا رہے اور غرباء اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائیں۔ اور اس خیال کے آتے ہی آپ دوڑ کر تشریف لے گئے اور فوراً وہ مال تقسیم کروایا اور پھر مطمئن ہوئے۔

اس احتیاط کو دیکھو اور اس بے احتیاطی کو دیکھو جس میں آج مسلمان مبتلا ہو رہے ہیں۔ امانتوں میں کس بے دردی سے خیانت کی جا رہی ہے۔ لوگ کس طرح غیروں کا مال شیر مادر کی طرح کھا رہے ہیں۔ حقوق کا اتلاف کس زور و شور سے جاری ہے مگر کوئی نہیں جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔

آنحضرت ﷺ جیسا پاک انسان جس پر گناہ کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غرباء کے اموال کی نسبت ایسی احتیاط کرے کہ ان کا مال استعمال کرنا تو الگ رہا اتنا بھی پسند نہ فرمائے کہ اسے اپنے گھر میں پڑا رہنے دے اور اب گھر میں رکھنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمارے پاس اپنے اموال رکھوائیں تاہم پھر انہیں واپس نہ دیں۔ کاش ہمارے رؤساء اس نکتہ کو

سمجھتے اور آنحضرت ﷺ کی پیروی اختیار کرتے جو باوجود معصوم ہونے کے اپنے نفس پر ایسا محاسبہ رکھتے کہ ذرہ سی غفلت میں بھی نہ پڑنے دیتے اور یہ لوگ دیکھتے کہ ہم تو اپنے نفوس پر ایسے قابو یافتہ نہیں پھر بغیر کسی حساب کے لوگوں کے اموال کو جمع کرنا ہمارے لئے کیسا خطرناک ہو گا مگر اس طرف قطعاً توجہ نہیں اور کل روپیہ بجائے غرباء کی خبرگیری کے اپنے ہی نفس پر خرچ کر دیتے ہیں اور جن کے لئے روپیہ جمع کیا جاتا ہے اور جن پر خرچ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں کو دیا ہے ان کی کوئی خبر ہی نہیں لیتا۔ آنحضرت ﷺ کا یہ فعل ہمیشہ کے لئے مسلمان بادشاہوں کے لئے ایک نمونہ ہے جس پر عمل کرنے سے وہ فلاح دارین پا سکتے ہیں۔ اگر رعایا کو یقین ہو جائے کہ ان کے اموال بے جا طور سے نہیں خرچ کئے جاتے تو وہ اپنے بادشاہ کے خلاف سازشوں کی مرتکب نہ ہو مگر ہمارے بادشاہوں نے اپنے حقوق کو آنحضرت ﷺ کے حقوق سے کچھ زیادہ ہی سمجھ لیا ہے اور اپنے نفس پر آپ سے بھی زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔

حضرت فاطمہؓ کا سوال

پچھلے واقعہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسا محتاط تھے کہ غرباء کا مال جبتک ان کے پاس نہ پہنچ جائے آپ کو آرام نہ آتا اور آپ کسی کے حق کے ادا کرنے میں کسی قسم کی سستی یا دیر کو روا نہ رکھتے۔ لیکن وہ واقعہ جو میں آگے بیان کرتا ہوں ثابت کرتا ہے کہ آپؐ اموال کی تقسیم میں بھی خاص احتیاط سے کام لیتے اور ایسا کوئی موقع نہ آنے دیتے کہ لوگ کہیں کہ آپ نے اموال کو خود اپنے ہی لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں اَنَّ فَاطِمَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا شَکَتْ مَا تَلْقٰی مِنْ اَثَرِ الرَّحَا فَاَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْیٌ فَانْطَلَقَتْ فَلَمْ تَجِدْہُ فَوَجَدَتْ عَائِشَۃَ فَاَخْبَرَتْہَا فَلَمَّا جَآءَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَتْہُ عَائِشَۃُ بِمَجِیْئِ فَاطِمَۃَ قَالَ فَجَاءَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَیْنَا وَقَدْ اَخَذْنَا مَضَاجِعَنَا فَذَھَبْتُ لِاَقُوْمَ قَالَ عَلٰی مَکَانِکُمَا فَقَعَدَ بَیْنَنَا حَتّٰی وَجَدْتُ بَرْدَ قَدَمَیْہِ عَلٰی صَدْرِیْ وَقَالَ اَلَا اُعَلِّمُکُمَا خَیْرًا مِمَّا سَاَلْتُمَانِیْ اِذَا اَخَذْتُمَا مَضَاجِعَکُمَا تُکَبِّرَا اَرْبَعًا وَّ ثَلَاثِیْنَ وَتُسَبِّحَا ثَلَاثًا وَّ ثَلَاثِیْنَ وَ تَحْمَدَا ثَلَاثَۃً وَّ ثَلَاثِیْنَ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمَا مِنْ خَادِمٍ (بخاری کتاب المناقب باب مناقب علی بن ابی طالبؓ) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے شکایت کی کہ چکی پیسنے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ اسی عرصہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ غلام آئے۔ پس آپ آنحضرتؐ کے پاس تشریف لے گئیں لیکن آپ کو گھر پر نہ پایا اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی آمد کی وجہ سے اطلاع دے کر گھر لوٹ آئیں۔

جب آنحضرت ﷺ گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے جناب ؐ کو حضرت فاطمہ کی آمد کی اطلاع دی جس پر آپؐ ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم اپنے بستروں پر لیٹ چکے تھے میں نے آپ کو آتے دیکھ کر چاہا کہ اٹھوں مگر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اپنی اپنی جگہ پر لیٹے رہو۔ پھر ہم دونوں کے درمیان آکر بیٹھ گئے یہاں تک کہ آپؐ کے قدموں کی خنکی میرے سینہ پر محسوس ہونے لگی۔ جب آپؐ بیٹھ گئے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں کوئی ایسی بات نہ بتادوں جو اس چیز سے جس کا تم نے سوال کیا ہے بہتر ہے اور وہ یہ کہ جب تم اپنے بستروں پر لیٹ جاؤ تو چونتیس دفعہ تکبیر کہو اور تینتیس دفعہ سُبْحَانَ اللہ کہو اور تینتیس دفعہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہو پس یہ تمہارے لئے خادم سے اچھا ہو گا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اموال کی تقسیم میں ایسے محتاط تھے کہ باوجود اس کے کہ حضرت فاطمہؓ کو ایک خادم کی ضرورت تھی اور چکی پیسنے سے آپ کے ہاتھوں کو تکلیف ہوتی تھی مگر پھر بھی آپؐ نے ان کو خادم نہ دیا بلکہ دعا کی تحریک کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی متوجہ کیا۔ آپؐ اگر چاہتے تو حضرت فاطمہؓ کو خادم دے سکتے تھے کیونکہ جو اموال تقسیم کے لئے آپؐ کے پاس آتے تھے وہ بھی صحابہؓ میں تقسیم کرنے کے لئے آتے تھے اور حضرت علیؓ کا بھی ان میں حق ہو سکتا تھا اور حضرت فاطمہؓ بھی اس کی حقدار تھیں لیکن آپؐ نے احتیاط سے کام لیا اور نہ چاہا کہ ان اموال میں سے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو دے دیں کیونکہ ممکن تھا کہ اس سے آئندہ لوگ کچھ کا کچھ نتیجہ نکالتے اور بادشاہ اپنے لئے اموال الناس کو جائز سمجھ لیتے پس احتیاط کے طور پر آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کو ان غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو آپؐ کے پاس اس وقت بغرض تقسیم آئیں کوئی نہ دی۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جن اموال میں آپؐ کا اور آپ کے رشتہ داروں کا خدا تعالیٰ نے حصہ مقرر فرمایا ہے ان سے آپؐ خرچ فرما لیتے تھے اور اپنے متعلقین کو بھی دیتے تھے ہاں جب تک کوئی چیز آپؐ کے حصہ میں نہ آئے اسے قطعاً خرچ نہ فرماتے اور اپنے عزیز سے عزیز رشتہ داروں کو بھی نہ دیتے۔ کیا دنیا کسی بادشاہ کی مثال پیش کر سکتی ہے جو بیت المال کا ایسا محافظ ہو۔ اگر کوئی نظیر مل سکتی ہے تو صرف اسی پاک وجود کے خدام میں سے۔ ورنہ دوسرے مذاہب اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتے۔

مذکورہ بالا واقعات سے روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نہایت

محتاط تھے اور ہر معاملہ میں کمال احتیاط سے کام کرتے تھے خصوصاً اموال کے معاملہ میں آپؐ نہایت احتیاط فرماتے کہ کسی کا حق نہ مارا جائے اور عارضی طور پر بھی لوگوں کو حق رسی میں دیر کرنا پسند نہ فرماتے بلکہ فوراً غرباء کو حقوق دلوا دیتے تھے۔ اب میں اسی امر کی شہادت کے لئے ایک اور واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کے اموال کا خیال رکھنے کے علاوہ ان کے ایمانوں کا بھی خیال رکھتے تھے اور کبھی ایسے چندوں کو قبول نہ فرماتے جو بعد میں کسی وقت چندہ دہندگان کے لئے وبال جان ثابت ہوں یا کسی وقت اسے افسوس ہو کہ میں نے کیوں فلاں مال اپنے ہاتھ سے کھو دیا آج اگر میرے پاس ہوتا تو میں اس سے فائدہ اٹھاتا۔

مکہ میں جب تکالیف بڑھ گئیں اور ظالموں کے ظلموں سے تنگ آکر آنحضرت ﷺ کو پہلے اپنے صحابہؓ کو دوسرے ممالک میں نکل جانے کا حکم دینا پڑا اور بعد ازاں خود بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اپنا وطن عزیز ترک کر کے مدینہ کی طرف ہجرت اختیار کرنی پڑی تو آپؐ پہلے مدینہ سے کچھ فاصلہ پر بنی عمرو بن عوف کے مہمان رہے اور دس دن سے کچھ زیادہ وہاں ٹھہرے اس کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لائے اور چونکہ یہاں مستقل طور پر رہنا تھا اس لئے مکانات کی بھی ضرورت تھی اور سب سے زیادہ ایک مسجد کی ضرورت تھی جس میں نماز پڑھی جائے اور سب مسلمان وہاں اکٹھے ہو کر اپنے رب کا نام لیں اور اس کے حضور میں اپنے عجز و انکسار کا اظہار کریں اور آنحضرت ﷺ جو ہر وقت اللہ تعالیٰ ہی کے خیال میں رہتے تھے اور آپ کا ہر ایک فعل عظمت الٰہی کو قائم کرنے والا تھا آپؐ کو ضرور بالضرور سب سے پہلے تعمیر مسجد کا خیال پیدا ہونا چاہئے تھا۔ چنانچہ جب آپؐ مدینہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے جو کام کیا وہ یہی تھا کہ آپؐ اپنے محبوب و مطلوب کے ذکر کا مقام اور اس کے حضور گرنے اور عبادت کرنے کی جگہ تیار کریں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور ہمارے مطاع و آقا خاتم النبیّن ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں آپ نے ایک طویل حدیث میں تمام واقعہ ہجرت مفصل بیان فرمایا ہے۔ آپ فرماتی ہیں فَلَبِثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ بَنِیْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ بِضْعَ عَشْرَةَ لَیْلَةً وَاُسِّسَ الْمَسْجِدُ الَّذِیْ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى وَصَلّٰى فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ رَکِبَ رَاحِلَتَہٗ فَسَارَ یَمْشِیْ مَعَہُ النَّاسُ حَتّٰى بَرَکَتْ عِنْدَ مَسْجِدِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِیْنَةِ وَھُوَ یُصَلِّیْ فِیْہِ یَوْمَئِذٍ رِجَالٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَکَانَ مِرْبَدًا لِلتَّمْرِ لِسُھَیْلٍ وَسَھْلٍ غُلَامَیْنِ یَتِیْمَیْنِ فِیْ حَجْرِ سَعْدِ بْنِ

زُرَارَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ بَرَكَتْ بِهٖ رَاحِلَتُهٗ هٰذَا اِنْشَاءَ اللّٰهُ الْمَنْزِلُ ثُمَّ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغُلَامَيْنِ فَسَاوَمَهُمَا بِالْمِرْبَدِ لِيَتَّخِذَهٗ مَسْجِدًا فَقَالَا بَلْ نَهَبُهٗ لَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَبٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّقْبَلَهٗ مِنْهُمَا هِبَةً حَتّٰى اِبْتَاعَهٗ مِنْهُمَا ثُمَّ بَنَاهُ مَسْجِدًا (بخاری باب ھجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ)

نبی کریم ﷺ بنی عمرو بن عوف میں کچھ دن ٹھہرے۔ دس دن سے کچھ اوپر اور اس مسجد کی بنیاد رکھی جس کی نسبت قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی اور اس میں رسول کریم ﷺ نے نماز پڑھی پھر آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور آپ کے ساتھ لوگ پاپیادہ چلنے لگے۔ آپ کی اونٹنی چلتی گئی یہاں تک کہ وہ مدینہ کے اس مقام پر پہنچ کر بیٹھ گئی جہاں بعد میں مسجد نبوی تیار کی گئی اور اس وقت وہاں مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس مقام پر کھجوریں سکھائی جاتی تھیں اور وہ دو یتیم لڑکوں کا تھا جن کا نام سہیل اور سہل تھا اور جو سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی ولایت میں پلتے تھے۔ جب یہاں آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ انشاء اللہ یہاں ہی ٹھہریں گے۔ پھر رسول کریم ﷺ نے ان دونوں لڑکوں کو بلوایا اور ان سے چاہا کہ اس جگہ کی قیمت طے کر کے انہیں قیمت دے دیں تاکہ وہاں مسجد بنائیں۔ اور دونوں لڑکوں نے جواب میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم قیمت نہیں لیتے بلکہ آپ کو ہبہ کرتے ہیں مگر رسول اللہ ﷺ نے ہبہ لینے سے انکار کیا اور آخر قیمت دے کر اس جگہ کو خرید لیا۔

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ مدینہ میں داخل ہوتے ہی پہلا خیال آپ کو یہی آیا کہ مسجد بنائیں اور پہلے آپ نے اس کے لئے کوشش شروع کی اور آپؐ کے دل میں اللہ تعالے کی محبت کا جو جوش تھا اس کا کسی قدر پتہ اس واقعہ سے لگ جاتا ہے۔ دوسرے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ آپ معاملات میں کیسے محتاط تھے۔

اہل مدینہ نے بار بار درخواست کر کے آپؐ کو بلایا تھا اور خود جا کر عرض کی تھی کہ آپؐ ہمارے شہر میں تشریف لائیں اور ہم آپ کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور جان و مال سے آپؐ کی خدمت کریں گے اور جہاں تک ہماری طاقت ہوگی آپؐ کو آرام پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ غرض کہ بار بار کی درخواستوں اور اصرار کے بعد آپ خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت تشریف لائے اور مدینہ والوں کا فرض تھا کہ آپ کو جگہ دیتے اور حق مہمان نوازی ادا کرتے اور مسجد بھی

تیار کراتے اور آپ کی رہائش کے لئے بھی مکان کا بندوبست کرتے اور وہ لوگ حق کو سمجھتے بھی تھے اور ہر طرح خدمت کے لئے حاضر تھے مگر چونکہ آپ کے تمام کام اللہ تعالیٰ کے سپرد تھے اور ہر ایک فعل میں آپ اسی پر اتکال کرتے تھے اس لئے آپ نے اپنی رہائش کے لئے ایسی جگہ کو پسند کیا جہاں اللہ تعالیٰ آپ کو رکھنا پسند کرے اور بجائے خود جگہ پسند کرنے کے اپنی اونٹنی کو چھوڑ دیا کہ خدا تعالیٰ جہاں اسے کھڑا کرے وہیں مسجد بنائی جائے اور وہیں رہائش کا مکان بنایا جائے۔ اب جس جگہ آپؐ کی اونٹنی کھڑی ہوئی وہ دو یتیموں کی جگہ تھی اور وہ بھی آپکے خدام میں تھے اور ہر طرح آپؐ پر اپنا جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار تھے اور بطور ہبہ کے وہ زمین پیش کرتے تھے مگر باوجود اس کے کہ آپؐ اہل مدینہ کے مہمان تھے اور وہ لڑکے مہمان نوازی کے ثبوت میں آپکو وہ زمین مفت دینا چاہتے تھے آپؐ نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی وجہ وہ احتیاط تھی جو آپؐ کے تمام کاموں میں پائی جاتی تھی۔

اول تو آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ وہ نابالغ بچوں سے بغیر معاوضہ کے زمین لیں کیونکہ ممکن تھا کہ وہ بچپن کے جوش و خروش میں آپ کی خدمت میں زمین پیش کر دیتے لیکن بڑے ہو کر ان کے دل میں افسوس ہوتا کہ اگر وہ زمین ہم بیچ دیتے یا اس وقت ہمارے پاس ہوتی تو وہ زمین یا اس کی قیمت ہمارے کام آتی اور ہماری معیشت کا سامان بنتی۔ اس احتیاط کی وجہ سے اس خیال سے کہ ابھی یہ بچے ہیں اور اپنے نفع و نقصان کو نہیں سمجھ سکتے آپؐ نے اس زمین کے مفت لینے سے بالکل انکار کر دیا۔ گو وہ لڑکے اپنے ایمان کے جوش میں زمین ہبہ کر رہے تھے اور اگر آپؐ اسے قبول کر لیتے تو بجائے افسوس کرنے کے وہ اس پر خوش ہوتے کیونکہ صحابہؓ کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بچے بھی جوانوںؓ سے کم نہ تھے اور چودہ پندرہ سال تک کے بچے مال تو کیا جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے چنانچہ بدر کی جنگ میں دو ایسے بچے بھی شامل ہوئے تھے۔ پس باوجود اس کے کہ وہ بچے تھے اور ابھی کم سن تھے مگر بظاہر حالات ان کے ایمانوں کے اندازہ کرنے سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ اس پر کبھی متاسف نہ ہوں گے مگر پھر بھی رسول کریم ﷺ نے مناسب نہ جانا کہ امکانی طور پر بھی ان کو ابتلاء میں ڈالا جائے اور اسی بات پر اصرار کیا کہ وہ قیمت وصول کریں اور اگر چاہیں تو اپنی زمین فروخت کر دیں ورنہ آپ نہیں لیں گے۔ آخر آپؐ کے اصرار کو دیکھ کر ان بچوں اور ان کے والیوں نے قیمت لے لی اور وہ زمین آپؐ کے پاس فروخت کر دی۔ آجکل دیکھا جاتا ہے کہ یتامیٰ سے بھی لوگ چندہ وصول کرتے ہیں اور بالکل اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ شاید ان کو بعد

ازاں تکلیف ہو اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بالکل خدا کا خوف نہیں کرتے مگر رسول کریمؐ نے اپنے طریق عمل سے بتادیا کہ باوجود اس کے کہ آپؐ حقدار تھے اور اہل مدینہ کے مہمان تھے آپؐ نے ان یتامیٰ سے بغیر قیمت زمین لینے سے انکار کر دیا اور باصرار قیمت ان کے حوالہ کی۔ افسوس کہ کامل اور اکمل نمونہ کے ہوتے ہوئے مسلمانوں نے اپنے عمل میں سستی کر دی ہے اور یتامیٰ کے اموال کی قطعاً کوئی حفاظت نہیں کی جاتی۔ ان کے اموال کی حفاظت تو الگ رہی خود محافظ ہی یتامیٰ کے مال کھا جاتے ہیں اور اس احتیاط کے قریب بھی نہیں جاتے جس کا نمونہ رسول کریمؐ نے دکھایا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

بنو ہوازن کے اموال

یتامیٰ کے اموال کے لینے سے رسول کریمؐ نے جس احتیاط سے انکار کر دیا اور باوجود اصرار کے مسجد کے لئے بھی زمین کا لینا پسند نہ کیا وہ تو پچھلے واقعہ سے ظاہر ہے۔ اب ایک اور واقعہ اسی قسم کا لکھتا ہوں۔ ہوازن کے ساتھ جب رسول کریم ﷺ کا مقابلہ ہؤا تو ان کے بہت سے مرد اور عورتیں قید ہوئے اور بہت سا مال بھی صحابہؓ کے قبضہ میں آیا۔ چونکہ آنحضرتؐ نہایت رحیم و کریم انسان تھے اور ہمیشہ اس بات کے منتظر رہتے کہ لوگوں پر رحم فرمائیں اور انہیں کسی مشقت میں نہ ڈالیں۔ آپؐ نے نہایت احتیاط سے کام لیا اور کچھ دن تک انتظار میں رہے کہ شاید قبیلہ ہوازن کے لوگ آکر عفو طلب کریں تو ان کے اموال اور قیدی واپس کر دیئے جائیں مگر انہوں نے خوف سے یا کسی باعث سے آپؐ کے پاس آنے میں دیر لگائی تو آپ نے اموال و قیدی بانٹ دیئے۔ اس واقعہ کو امام بخاریؒ نے مفصل بیان کیا ہے۔ مِسْوَر بن مخرمہؓ کی روایت ہے۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَامَ حِیْنَ جَآءَہٗ وَفْدُ ہَوَازِنَ مُسْلِمِیْنَ فَسَأَلُوْہُ اَنْ یَّرُدَّ اِلَیْہِمْ اَمْوَالَھُمْ وَسَبْیَھُمْ فَقَالَ لَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الْحَدِیْثِ اِلَیَّ اَصْدَقُہٗ فَاخْتَارُوْا اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اِمَّا السَّبْیَ وَاِمَّا الْمَالَ وَقَدْ کُنْتُ اِسْتَاْنَیْتُ بِکُمْ وَقَدْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنْتَظَرَھُمْ بِضْعَ عَشَرَۃَ لَیْلَۃً حِیْنَ قَفَلَ مِنَ الطَّآئِفِ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَیْرُ رَآدٍّ اِلَیْہِمْ اِلَّا اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ قَالُوْا فَاِنَّا نَخْتَارُ سَبْیَنَا فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْمُسْلِمِیْنَ فَاَثْنٰی عَلَی اللّٰہِ تَعَالٰی بِمَا ھُوَ اَھْلُہٗ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ اِخْوَانَکُمْ ھٰٓؤُلَآءِ قَدْ جَآءُوْنَا تَآئِبِیْنَ وَاِنِّیْ قَدْ رَاَیْتُ اَنْ اَرُدَّ اِلَیْہِمْ سَبْیَھُمْ فَمَنْ اَحَبَّ مِنْکُمْ اَنْ یُّطَیِّبَ بِذٰلِکَ فَلْیَفْعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ مِنْکُمْ اَنْ یَّکُوْنَ عَلٰی حَظِّہٖ حَتّٰی نُعْطِیَہٗ اِیَّاہُ

مِنْ اَوَّلِ مَا یُفِیْءُ اللّٰہُ عَلَیْنَا فَلْیَفْعَلْ فَقَالَ النَّاسُ قَدْ طَیَّبْنَا ذٰلِکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَھُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّا لَا نَدْرِیْ مَنْ اَذِنَ مِنْکُمْ فِیْ ذٰلِکَ مِمَّنْ لَمْ یَاْذَنْ فَارْجِعُوْا حَتّٰی یَرْفَعَ اِلَیْنَا عُرَفَاؤُکُمْ اَمْرَکُمْ فَرَجَعَ النَّاسُ فَکَلَّمَھُمْ عُرَفَاؤُھُمْ ثُمَّ رَجَعُوْا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرُوْہُ اَنَّھُمْ قَدْ طَیَّبُوْا وَاَذِنُوْا۔ (بخاری کتاب الوکالہ باب اذا وھب شیئا لوکیل)

ترجمہ:- جب وفد ہوازن بحالت قبول اسلام آنحضرت ﷺ کے پاس آیا آپؐ کھڑے ہوئے۔ ہوازن کے ڈیپوٹیشن کے ممبروں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ ان کے مال اور قیدی واپس کئے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے سب سے پیاری وہ بات لگتی ہے جو سب سے زیادہ سچی ہو۔ پس میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ دونوں چیزیں تمہیں نہیں مل سکتیں۔ ہاں دونوں میں سے جس ایک کو پسند کرو وہ تمہیں مل جائے گی۔ خواہ قیدی آزاد کروا لو خواہ اموال واپس لے لو۔ اور میں تو تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم نہ پہنچے۔ اور رسول کریمؐ طائف سے لوٹتے وقت دس سے کچھ اوپر راتیں ان لوگوں کا انتظار کرتے رہے تھے جب انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ رسول کریمؐ انہیں صرف ایک ہی چیز واپس کریں گے تو انہوں نے عرض کیا کہ اگر یہی بات ہے تو ہم اپنے قیدی چھڑوانا پسند کرتے ہیں۔ اس پر آنحضرتؐ مسلمانوں میں کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے کے بعد فرمایا کہ سنو تمہارے ہوازن کے بھائی تائب ہو کر تمہارے پاس آئے ہیں اور میری رائے ہے کہ میں ان کے قیدی انہیں واپس کر دوں۔ پس جو کوئی تم میں سے یہ پسند کرے کہ اپنی خوشی سے غلام آزاد کر دے تو وہ ایسا کر دے۔ اور اگر کوئی یہ چاہے کہ اس کا حصہ قائم رہے اور جب خدا اسب سے پہلی دفعہ ہمیں کچھ مال دے تو اسے اس کا حق ہم ادا کر دیں تو وہ اس شرط سے غلام آزاد کر دے۔ لوگوں نے آپؐ کا ارشاد سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم نے آپؐ کے لئے اپنے غلام خوشی سے آزاد کر دیئے مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم تو نہیں سمجھتے کہ تم میں سے کس نے خوشی سے اجازت دی ہے اور کس نے اجازت نہیں دی۔ پس سب لوگ یہاں سے اٹھ کر اپنے خیموں پر جاؤ یہاں تک کہ تمہارے سردار تم سے فیصلہ کر کے ہمارے سامنے معاملہ پیش کریں۔ پس لوگ لوٹ گئے اور ہر قبیلہ کے سردار نے اپنے طور پر گفتگو کی پھر سب سردار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ سب لوگوں نے دل کی خوشی سے بغیر کسی عوض کی طمع کے اجازت دے دی ہے کہ آپؐ غلام آزاد فرما دیں۔

اس جگہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت ؐ جس قبیلہ میں پلے تھے اور جس میں سے آپ کی دائی تھیں وہ ہوازن کی ہی ایک شاخ تھی۔ پس ایک لحاظ سے ہوازن کے قبیلہ والے آپ ؐ کے رشتہ دار تھے اور ان سے رضاعت کا تعلق تھا چنانچہ جب وفد ہوازن آنحضرت ؐ کی خدمت میں پیش ہؤا تو اس میں سے ابو برقان اسعدی (آنحضرت ؐ کی دائی حلیمہ سعد قبیلہ میں سے ہی تھیں) نے آپ ؐ کی خدمت میں عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنْ فِیْ ھٰذِہِ الْحَظَائِرِ اِلاَّ اُمَّھَاتُکَ وَخَالَاتُکَ وَحَوَاضِنُکَ وَمُرْضِعَاتُکَ فَامْنُنْ عَلَیْنَا مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکَ۔ یا رسول اللہ ان احاطوں کے اندر حضور کی مائیں اور خالہ اور کھلایاں اور دودھ پلائیاں ہی ہیں اور تو کوئی نہیں پس حضور ؐ ہم پر احسان فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ پر احسان کرے گا۔ پس ہوازن کے ساتھ آپ کا رضاعی تعلق تھا اور اس وجہ سے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ آنحضرت ؐ ان کے ساتھ نیک سلوک کرتے۔ چنانچہ آپ ؐ نے اسی ارادہ سے دس دن سے زیادہ تک اموال غنیمت کو مسلمانوں میں تقسیم نہیں کیا اور اس بات کے منتظر رہے کہ جونہی ہوازن پشیمان ہو کر آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوں اور اپنے اموال اور قیدیوں کو طلب کریں تو آپ واپس فرما دیں کیونکہ تقسیم غنائم سے پہلے آپ کا حق تھا کہ آپ جس طرح چاہتے ان اموال اور قیدیوں سے سلوک کرتے خواہ بانٹ دیتے خواہ بیت المال کے سپرد فرماتے۔ خواہ قیدیوں کو آزاد کر دیتے اور مال واپس کر دیتے مگر باوجود انتظار کے ہوازن کا کوئی وفد نہ آیا جو اپنے اموال اور قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا اس لئے مجبوراً دس دن سے زیادہ انتظار کر کے طائف سے واپس ہوتے ہوئے جعرانہ میں آپ نے ان اموال اور غلاموں کو تقسیم کر دیا۔ تقسیم کے بعد ہوازن کا وفد بھی آپہنچا اور رحم کا طلبگار ہؤا اور اپنا حق بھی جتا دیا کہ یہ قیدی غیر نہیں ہیں بلکہ جناب کے ساتھ کچھ رشتہ اور تعلق رکھتے ہیں اور اس خاندان کی عورتیں ان قیدیوں میں شامل ہیں جس میں کسی عورت کا حضور نے دودھ بھی پیا ہے اور اس لحاظ سے وہ آپ کی مائیں اور خالائیں اور کھلائیاں اور دائیاں کہلانے کی مستحق ہیں پس ان پر رحم کر کے قیدیوں کو آزاد کیا جائے اور اموال واپس کئے جائیں۔ تقسیم سے پہلے تو حضور ضرور ہی ان کی درخواست کو قبول کر لیتے اور آپ ؐ کا طریق عمل ثابت کرتا ہے کہ جب کبھی بھی کوئی رحم کا معاملہ پیش ہؤا ہے حضور سرور کائنات ؐ نے بینظیر رحم سے کام لیا۔ مگر اب یہ مشکل پیش آگئی تھی کہ اموال و قیدی تقسیم ہو چکے تھے اور جن کے قبضہ میں وہ چلے گئے تھے اب وہ ان کا مال تھا۔ اور گو وہ لوگ اپنی جان و مال کو اس حبیب خدا کی مرضی پر قربان کرنے کے لئے تیار تھے اور انہوں نے

سینکڑوں موقعوں پر قربان ہو کر دکھا بھی دیا مگر پھر بھی ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں- کچھ کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں کچھ قوی دل اور دلیر اس لئے حضورؐ نے اس موقع پر نہایت احتیاط سے کام لیا اور بجائے اس کے کہ فوراً صحابہؓ کو حکم دیتے کہ ہوازن سے میرا رضاعی رشتہ ہے تم ان کے اموال اور قیدی رہا کر دو اول تو خود ہوازن کو ہی ملامت کی کہ تم نے دیر کیوں کی اگر تم وقت پر آجاتے تو جس طرح اور عرب قبائل سے سلوک کیا کرتے تھے تم پر بھی احسان کیا جاتا اور تمہارا سب مال اور قیدی تم کو مل جاتے مگر خیر اب تم کو اموال اور قیدیوں میں سے ایک چیز دلوا سکتا ہوں اور اس فیصلہ سے آنحضرتؐ نے گویا نصف بوجھ مسلمانوں پر سے اٹھا دیا اور فیصلہ کر دیا کہ دو میں سے ایک چیز تو انہیں کے ہاتھ میں رہنے دی جائے اور جب ہوازن نے قیدیوں کی واپسی کی درخواست کی تو آپؐ نے پھر بھی مسلمانوں کو سب قیدی واپس کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ کہہ دیا کہ جو چاہے اپنی خوشی سے آزاد کر دے اور جو چاہے اپنا حصہ قائم رکھے- آئندہ اللہ تعالیٰ جو سب سے پہلا موقع دے اس پر اس کا قرضہ اتار دیا جائے گا اور اس طرح گویا ان تمام کمزور طبیعت کے آدمیوں پر رحم کیا جو ہر قوم میں پائے جاتے ہیں- مگر ہزار آفرین ہے اس جماعت پر جو آنحضرتؐ کی تعلیم سے بنی تھی کہ آپؐ کا ارشاد سنکر ایک نے بھی نہیں کہا کہ ہم آئندہ حصہ لے لیں گے بلکہ سب نے بالاتفاق کہہ دیا کہ ہم نے حضورؐ کی خاطر سب قیدیوں کو خوشی سے رہا کر دیا مگر آپؐ نے اس پر بھی احتیاط سے کام لیا اور حکم دیا کہ پھر مشورہ کر لیں ایسا نہ ہو بعض کی مرضی نہ ہو اور ان کی حق تلفی ہو اپنے اپنے سرداروں کی معرفت اپنے فیصلہ سے اطلاع دو- چنانچہ جب قبائل کے سرداروں کی معرفت آنحضرتؐ کو جواب ملا تو تب آپ نے غلام آزاد کئے- سُبْحَانَ اللہ کیسی احتیاط ہے اور کیا بے نظیر تقویٰ ہے- آپؐ نے یہ بات بالکل برداشت نہ کی کہ کوئی شخص آپؐ پر یہ اعتراض کرے کہ آپؐ نے زبردستی ہوازن کے غلام آزاد کرا دیئے- اور چونکہ اس قبیلہ سے آپؐ کا رضاعی تعلق تھا اس لئے آپ نے خاص احتیاط سے کام لیا اور بار بار پوچھ کر قیدیانِ ہوازن کو آزادی دی-

سچّے مرید

اگر کسی شخص نے سچے مرید اور کامل متبع دیکھنے ہوں تو وہ آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کو دیکھے جو اپنے جان و مال کو رسول کریمؐ کے نام پر قربان کر دینے میں ذرا دریغ نہ کرتے تھے- ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عضل اور قارۃ دو قبیلوں کے کچھ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہماری قوم اسلام کے قریب ہے آپؐ کچھ آدمی بھیجئے جو انہیں دین اسلام سکھائیں- آپؐ نے ان کی درخواست پر چھ صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہاں جا کر انہیں

اسلام سکھائیں اور قرآن شریف پڑھائیں۔ ان صحابہؓ کا عامر بن عاصم رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا۔

جب یہ لوگ صحابہؓ کو لے کر چلے تو راستہ میں ان سے شرارت کی اور عہد شکنی کر کے ہذیل قبیلہ کے لوگوں کو اکسایا کہ انہیں پکڑ لیں۔ انہوں نے ایک سو آدمی ان چھ آدمیوں کے مقابلہ میں بھیجا۔ صحابہؓ ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ کفار نے ان سے کہا کہ وہ اتر آئیں وہ انہیں کچھ نہ کہیں گے۔ حضرت عامرؓ نے جواب دیا کہ انہیں کافروں کے عہد پر اعتبار نہیں وہ نہیں اتریں گے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ہماری حالت کی رسول اللہ ؐ کو خبر دے۔ مگر چھ میں سے تین آدمی کفار پر اعتبار کر کے اتر آئے۔ مگر جب انہوں نے ان کے ہاتھ باندھنے چاہے تو ایک صحابیؓ نے انکار کر دیا کہ یہ تو خلاف معاہدہ ہے مگر وہاں معاہدہ کون سنتا تھا اس صحابیؓ کو قتل کر دیا گیا باقی دو میں سے ایک کو صفوان بن امیہ نے جو مکہ کا ایک رئیس تھا خرید لیا اور اپنا غلام کر کے نسطاس کے ساتھ بھیجا کہ حرم سے باہر اس کے دو بیٹوں کے بدلہ قتل کر دے۔ نسطاس نے قتل کرنے سے پہلے ابن الدثنہ رضی اللہ عنہ (اس صحابی) سے پوچھا کہ تجھے خدا کی قسم سچ بتا کہ کیا تیرا دل چاہتا ہے کہ تمہارا رسول اس وقت یہاں ہمارے ہاتھ میں ہو اور ہم اسے قتل کریں اور تو آرام سے اپنے گھر میں اپنے بیوی بچوں میں بیٹھا ہو۔ ابن الدثنہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محمد (ﷺ) وہاں ہوں جہاں اب ہیں (یعنی مدینہ میں) اور ان کے پاؤں میں کوئی کانٹا چبھے اور میں گھر میں بیٹھا ہؤا ہوں۔ اس بات کو سنکر ابو سفیان جو اس وقت تک اسلام نہ لایا تھا وہ بھی متاثر ہو گیا اور کہا کہ میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا جتنی محمد (ﷺ) کے صحابی محمد (ﷺ) سے محبت کرتے تھے۔

یہ وہ اخلاص تھا جو صحابہؓ کو آنحضرت ﷺ سے تھا اور یہی وہ اخلاص تھا جس نے انہیں ایمان کے ہر ایک شعبہ میں پاس کرا دیا تھا اور انہوں نے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اے احمدی جماعت کے مخلصو! تم بھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک رسول کریمؐ اور پھر مأمورِ وقت مسیحِ موعود سے ایسی ہی محبت نہ رکھو۔

آنحضرتؐ کی دعا

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں آنحضرت ﷺ ہر معاملہ میں نہایت حزم اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اب میں ایک حدیث نقل کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ آپؐ دعاؤں میں بھی نہایت محتاط تھے اور کبھی ایسی دعا نہ کرتے جو یکطرفہ ہو بلکہ ایسی ہی دعا کرتے جس میں تمام پہلو مدنظر رکھے جائیں جیسا کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ کَانَ اَکْثَرُ دُعَاءِ النَّبِیِّ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بخاری کتاب الدعوات باب قول النبی صلی اللہ علیہ و سلم اٰتنا فی الدنیا حسنۃ) یعنی نبی کریمؐ اکثر اوقات یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ ہمیں اس دنیا میں بھی نیکی اور بھلائی دے اور آخرت میں بھی نیکی اور بھلائی عنایت فرما اور عذاب نار سے ہمیں محفوظ رکھ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بھی آپ کی اس دعا کا ذکر فرمایا ہے۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (البقرہ:۲۰۱-۲۰۲) یعنی لوگوں میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتے ہیں کہ الٰہی اس دنیا کا مال ہمیں مل جائے اور ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے رب اس دنیا کی بھلائی بھی ہمیں پہنچا اور آخرت کی نیکی بھی ہمیں پہنچا اور آگ کے عذاب سے ہمیں محفوظ رکھ۔

اب اس دعا پر غور کرنے سے پتہ لگ سکتا ہے کہ آپؐ کس قدر احتیاط سے کام فرماتے تھے۔ عام طور پر انسان کا قاعدہ ہے کہ جو مصیبت پڑی ہوئی ہو اسی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور دوسرے تمام امور کو اپنے ذہن سے نکال دیتا ہے اور ایک ہی طرف کا ہو رہتا ہے اور اس وجہ سے اکثر دیکھا گیا بہت سے لوگ حق و حکمت کی شاہراہ سے بھٹک کر کہیں کے کہیں نکل جاتے ہیں اور سچائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لیکن آنحضرتؐ ایسے کامل انسان تھے کہ آپؐ مصائب سے گھبرا کر ایک ہی طرف متوجہ نہ ہو جاتے تھے بلکہ ہر وقت کل ضروریات پر آپؐ کی نظر رہتی تھی۔ اور اس دعا سے ہی آپ کے اس کمال پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے کیونکہ آپؐ صرف دنیا کے مصائب اور مشکلات کو مد نظر نہ رکھتے تھے بلکہ جب دنیاوی مشکلات کے حل کرنے کے لئے اپنے مولا سے فریاد کرتے تو ساتھ ہی مابعد الموت کی جو ضروریات ہیں ان کے لئے بھی امداد طلب کرتے۔ اور جب قیامت کے دل ہلا دینے والے نظاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر خدا تعالیٰ کی نصرت کے لئے درخواست کرتے تو ساتھ ہی اس دنیا کی مشکلات کے دور کرنے کے لئے بھی جو مزرعۂ آخرت ہے التجا کرتے اور کسی مشکل یا تکلیف کو حقیر نہ جانتے بلکہ نہایت احتیاط سے دنیاوی اور دینی ترقیوں کے لئے بغیر کسی ایک کی طرف سے غافل ہونے کے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہتے۔

علاوہ ازیں اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اپنی دعاؤں کے الفاظ میں بھی نہایت احتیاط برتتے تھے کیونکہ آپؐ نے یہ دعا نہیں کی کہ یا الٰہی ہمیں دین اور دنیا دے بلکہ یہ دعا کی کہ

الٰہی ہمیں دین اور دنیا کی بہتری عنایت فرما کیونکہ بعض دفعہ دنیا تو ملتی ہے مگر وہ بجائے فائدہ کے نقصان رساں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دین بھی بعض لوگوں کو ملتا ہے مگر وہ اس کے ملنے کے باوجود کچھ سکھ نہیں پاتے اس لئے آپؐ نے دعا میں یہ الفاظ بڑھا دیئے کہ الٰہی دنیا کی بہتری ہمیں دے۔ یعنی دنیا کے جس حصہ میں بہتری ہو ہمیں وہ ملے ایسا کوئی حصہ دنیا ہمیں نہ ملے جس کے ملنے سے بجائے فائدہ کے نقصان ہو اور آخرت میں بھی ہمیں بھلائی ملے نہ کہ کسی قسم کی برائی کے ہم حقدار ہوں۔

کسی کی درخواست پر کام سپرد نہ فرماتے

لوگوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ امراء سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہزاروں قسم کی تدابیر سے کام لیتے ہیں اور جب ان کے مزاج میں دخل پیدا ہو جاتا ہے تو اپنی منہ مانگی مرادیں پاتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہ امراء مان لیتے ہیں۔ مگر آنحضرتؐ ایسے محتاط تھے کہ آپ کے دربار میں بالکل یہ بات نہ چل سکتی تھی۔ آپ کبھی کسی کے کہنے میں نہ آتے تھے اور آپ کے حضور میں باتیں بنا کر اور آپ کو خوش کر کے یا خوشامد سے یا سفارش سے کام نہ چل سکتا تھا۔ آپ کا طریق عمل یہ تھا کہ آپ تمام عہدوں پر ایسے ہی آدمیوں کو مقرر فرماتے تھے جن کو ان کے لائق سمجھتے تھے کیونکہ بصورت دیگر خطرہ ہو سکتا ہے کہ رعایا یا حکومت کو نقصان پہنچے یا خود عُمّال کا ہی دین خراب ہو۔ پس کبھی کسی عہدہ پر سفارش یا درخواست سے کسی کا تقرر نہ فرماتے اور وہ نظارے جو دنیاوی بادشاہوں کے درباروں میں نظر آتے ہیں دربار نبوت میں بالکل معدوم تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں أَقْبَلْتُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعِيَ رَجُلَانِ مِنَ الْأَشْعَرِيِّيْنَ فَقُلْتُ مَا عَلِمْتُ أَنَّهُمَا يَطْلُبَانِ الْعَمَلَ فَقَالَ لَنْ أَوْ لَا نَسْتَعْمِلُ عَلَى عَمَلِنَا مَنْ أَرَادَهُ (بخاری کتاب الاجارۃ باب استئجار الرجل الصالح) یعنی میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہؤا اور میرے ساتھ اشعری قبیلہ کے دو اور آدمی بھی تھے ان دونوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ انہیں کوئی ملازمت دی جائے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے علم نہ تھا کہ یہ کوئی ملازمت چاہتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہم اسے جو خود خواہش کرے اپنے عُمّال میں ہرگز نہیں مقرر کریں گے یا فرمایا کہ نہیں مقرر کریں گے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سرور کائنات کو بنی نوع انسان کی بہتری کا کتنا خیال تھا۔ اللہ اللہ یا تو یہ زمانہ ہے کہ حکومتوں کے بڑے سے بڑے عہدے خود درخواست کرنے پر ملتے ہیں یا

آپ کی احتیاط تھی کہ درخواست کرنے والے کو کوئی عہدہ ہی نہیں دیتے تھے۔

درحقیقت اگر غور کیا جائے تو ایک شخص جب کسی عہدہ کی خود درخواست کرتا ہے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس کی کوئی غرض ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ اس عہدہ پر قائم ہو کر وہ لوگوں کو دکھ دے اور ان کے اموال پر دست اندازی کرے۔ مگر جس شخص کو اس کی درخواست کے بغیر کسی عہدہ پر مأمور کیا جائے تو اس سے بہت کچھ امید ہو سکتی ہے کہ وہ عدل و انصاف سے کام لے گا اور لوگوں کے حقوق کو تلف نہ کرے گا کیونکہ اسے اس عہدہ کی خواہش ہی نہ تھی بلکہ خود بخود اسے سپرد کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ بھی بات ہے کہ جب حاکم یہ فیصلہ کردے کہ جو شخص خود کسی عہدہ کی درخواست کرے یا کسی سے سفارش کروائے اسے کوئی عہدہ دینا ہی نہیں تو اس سے یہ بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ آئندہ کے لئے جائز و ناجائز وسائل سے حکام کے مزاج میں دخل پیدا کرنے کا بالکل سدّباب ہو جاتا ہے اور خوشامد بند ہو جاتی ہے کیونکہ حکام سے رسوخ پیدا کرنے یا ان کی جھوٹی خوشامد کرنے سے یہی غرض ہوتی ہے کہ کچھ نفع حاصل کیا جائے۔ پس جب حاکم یہ فیصلہ کردے کہ جو خود درخواست کرے گا اسے کسی عہدہ پر مأمور نہ کیا جائے گا تو ان تمام باتوں کا سدِّباب ہو جاتا ہے۔ اور گو آنحضرت ﷺ کا نفس پاک ان عیبوں سے بالکل پاک تھا کہ آپ کی نسبت یہ خیال کیا جا سکے کہ آپ کسی کی بات میں آجائیں گے مگر آپ نے اس طریق عمل سے مسلمانوں کے لئے ایک نہایت شاندار سڑک تیار کر رکھی ہے جس پر چل کر وہ حکومت کی بہت سی خرابیوں سے بچ سکتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ دوسری قوموں کی نسبت مسلمان حکومتوں میں ہی حکام کے منہ چڑھ کر لوگ بہت فائدہ اٹھاتے ہیں اور سفارشوں سے جو کام نکلتے ہیں وہ لیاقت سے نہیں نکلتے۔ اگر مسلمان حکام اس طرف غور کرتے تو آج اسلامی حکومتوں کا وہ حال نہ ہوتا جو ہے۔ اور پھر آنحضرتؐ جن لوگوں کی نسبت یہ احتیاط برتتے تھے ویسے لوگ بھی تو آجکل نہیں۔ صحابہؓ تو وہ تھے کہ جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنے مال اور جانیں بھی لٹا دیں وہ دوسروں کے اموال کی طرف کب نظر اٹھا کر دیکھ سکتے تھے۔ مگر آجکل تو دوسروں کے اموال کو شیرِ مادر سمجھا جاتا ہے۔ پھر جب آنحضرت ﷺ ایسے پاکباز لوگوں کی نسبت بھی ایسے احتیاط برتتے تھے تو آجکل کے زمانہ کے لوگوں کی نسبت تو اس سے بہت زیادہ احتیاط کی جانی چاہئے۔

سادگی ایک نعمت ہے

اس زمانہ میں لوگ عام طور پر تکلف کی عادت میں بہت مبتلا ہیں اور اس زمانہ کی خصوصیت نہیں جو قوم ترقی کر لے اس میں تکلف اپنا دخل کر لیتا ہے۔ دولت اور مال اور عزت کے ساتھ ساتھ تکلف بھی ضرور آموجود ہوتا ہے اور بڑے آدمیوں کو کچھ نہ کچھ تکلف سے کام لینا پڑتا ہے لیکن جو مزا سادگی کی زندگی میں ہے وہ تکلف میں نہیں۔ اور گو تکلف ظاہر میں خوشنما معلوم ہو مگر اندر سے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ذوق نے کیا ہی خوب کہا ہے کہ ؎

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر :- آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

تکلف کی وجہ سے لاکھوں گھرانے برباد ہو جاتے ہیں اور تصنع اور بناوٹ ہزاروں کی بربادی کا باعث ہو چکے ہیں مگر چونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تکلف کے سوا ہماری عزت نہیں ہوتی برابر اس مرض میں مبتلا چلے جاتے ہیں اور کچھ علاج نہیں کرتے۔ بادشاہ اور امراء یہ سمجھتے ہیں کہ اگر تکلف اور بناوٹ سے ہم اپنی خاص شان نہ بنائے رکھیں گے تو ماتحتوں میں بھی ہماری عزت نہ ہوگی اور اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہوں گے اسی لئے بہت سے مواقع پر سادگی کو بر طرف رکھ کر بناوٹ سے کام لیتے ہیں اور ہزاروں موقعوں پر اپنے مافی الضمیر کو بھی بیان نہیں کر سکتے۔ میں ایک مجلس میں شامل ہؤا جہاں بہت سے بڑے بڑے لوگ جمع تھے جو اس وقت ہندوستان میں خاص شہرت رکھتے ہیں اور بعض ان میں سے لیڈرانِ قوم کہلاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہندو تھے کچھ مسلمان۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ایک بیرسٹر صاحب نے کہا کہ ایک مدت ہو گئی کہ تکلف کے ہاتھوں مَیں تکلیف اٹھا رہا ہوں۔ ہر وقت بناوٹ سے اپنے آپ کو سنجیدہ بنائے رکھنا پڑتا ہے اور بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے مگر تکلف مانع ہوتا ہے کیونکہ وہ شان قائم نہیں رہتی مگر اب میں بالکل تنگ آگیا ہوں۔ اس زندگی کا فائدہ کیا۔ ایک دوسرے صاحب بولے کہ بے شک میرا بھی یہی حال ہے اور میں تو اب اس زندگی کو جہنم کا نمونہ پاتا ہوں پھر تو سب نے یہی اقرار کیا اور تجویز ہوئی کہ آج کی مجلس میں تکلف چھوڑ دیا جائے اور بے تکلفی سے آپس میں بات چیت کریں اور بناوٹ نزدیک نہ آئے۔ مگر خدا تعالیٰ انسان کو اس سادگی سے بچائے جو اس وقت ظاہر ہوئی۔ اسے دیکھ کر معلوم ہو سکتا تھا کہ آج دنیا کی کیا حالت ہے کیونکہ جس قوم کے لیڈر یہ نمونہ دکھا رہے تھے اس کے عوام نے کیا کمی رکھی ہوگی۔ کلام ایسا فحش کہ شریف آدمی سن نہ سکے۔ مذاق ایسا گندہ کہ سلیم الفطرت انسان برداشت نہ کر سکے۔ باتوں سے گزر کر ہاتھوں پر آگئے اور ایک دوسرے کے سر پر چپتیں بھی رسید ہونی شروع ہو

گئیں- پھر کچھ میوہ کھا رہے تھے اس کی گٹھلیوں کی وہ بوچھاڑ شروع ہوئی کہ الامان- میں نے تو سمجھا کہ اس گولہ باری میں میری خیر نہیں ایک کونہ میں ہو کر بیٹھ گیا- اور جب یہ سادگی ختم ہوئی تو میری جان میں جان آئی کہ آنکھ ناک سلامت رہے-

جو نمونہ سادگی اس مجلس کے ممبران نے دکھایا جو ہندو مسلمان دونوں قوموں میں سے تھے اس سے تو ان کے تکلف کو میں لوگوں کے لئے ہزار درجہ بہتر سمجھتا ہوں مگر اس سے مجھے یہ معلوم ہؤا کہ وہ تکلف خود ان لوگوں کے لئے وبال جان ہو رہا تھا اور ہے- گو وہ خوش نظر آتے ہیں مگر درحقیقت اپنی جھوٹی عظمت اور عزت قائم کرنے کے لئے لوگوں کے سامنے ایسے سنجیدہ بنے رہتے ہیں اور ایسے بنے ٹھنے رہتے ہیں کہ اپنے حقیقی جذبات کو چھپانے اور اپنے جسم کو حد سے زیادہ مشقت میں ڈالنے کی وجہ سے ان کے دل مردہ ہو گئے ہیں اور زندگی ان کے لئے تلخ ہو گئی ہے- امراء کے مقابلہ میں دوسرا گروہ علماء اور صوفیاء کا ہے جو دین کے عماد اور ستون سمجھے جاتے ہیں یہ بھی تکلفات میں مبتلا ہیں اور انہیں بھی اپنی عزت کے قائم رکھنے کے لئے تکلف سے کام لینا پڑتا ہے- اپنی چال میں' اپنی گفتگو میں' اپنے اٹھنے بیٹھنے میں' اپنے پہننے میں' اپنے کھانے میں ہر بات میں تکلفات سے کام لیتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ اسی سے ہمارا تقدس ثابت ہوتا ہے- یہ مذہبی لیڈر خواہ کسی مذہب کے ہوں اس مرض میں مبتلا ہیں- مسلمان صوفیاء کو ہی کوئی جا کر دیکھے کس طرح مراقبہ کی حالت میں اپنے مریدوں کے سامنے بیٹھتے ہیں مگر بہت ہوتے ہیں جن کے دل اندر سے اور ہی خواہشات رکھتے ہیں اور ان کی زندگیاں اپنے بھائیوں یعنی امراء سے زیادہ سکھ والی نہیں ہوتیں بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی تلخ ہوں کیونکہ وہ اپنے جذبات کے پورا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہیں مگر علماء اور صوفیاء اس سے بھی محروم ہیں-

میری اس بیان سے یہ غرض ہے کہ دنیا میں تکلف کا بہت دور دورہ ہے اور دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے عظماء اس مرض میں مبتلا ہیں اور نہ صرف آج مبتلا ہوئے ہیں بلکہ دنیا میں یہ نقشہ ہمیشہ سے قائم ہے اور سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و نصرت ہو اور بہت کم لوگ اس بناوٹ سے بچ سکتے ہیں-

ہمارے ہادی اور رہنما آنحضرت ﷺ تو رحمۃ للعالمین ہو کر آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو کل دنیا کے لئے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے اس لئے آپ نے ہمارے لئے جو نمونہ قائم کیا وہی سب سے درست اور اعلیٰ ہے اور اس قابل ہے کہ ہم اس کی نقل کریں- آپؐ نے اپنے طریق

عمل سے ہمیں بتایا ہے کہ جذباتِ نفس جو پاک اور نیک ہیں ان کو دبانا تو کسی طرح جائز ہی نہیں بلکہ ان کو تو ابھارنا چاہئے۔ اور جو جذبات ایسے ہوں کہ ان سے گناہوں اور بدیوں کی طرف توجہ ہوتی ہو ان کا چھپانا نہیں بلکہ ان کا مارنا ضروری ہے۔ پس اگر تکلف سے بعض ایسی باتیں نہیں کرتے جن کا کرنا ہمارے دین اور دنیا کے لئے مفید تھا تو ہم غلط کار ہیں اور اگر وہ باتیں جن کا کرنا دین اسلام کے رو سے ہمارے لئے جائز ہے صرف تکلف اور بناوٹ سے نہیں کرتے ورنہ دراصل ان کے شائق ہیں تو یہ نفاق ہے۔ اور اگر لوگوں کی نظروں میں عزت و عظمت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو خاموش اور سنجیدہ بناتے ہیں تو یہ شرک ہے۔ آنحضرتؐ کی زندگی میں ایسا ایک بھی نمونہ نہیں پایا جاتا جس سے معلوم ہو کہ آپؐ نے ان تینوں اغراض میں سے کسی کے لئے تکلف یا بناوٹ سے کام لیا بلکہ آپؐ کی زندگی نہایت سادہ اور صاف معلوم ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی عزت کو لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں سمجھتے تھے بلکہ عزت و ذلت کا مالک خدا کو ہی سمجھتے تھے۔

جو لوگ دین کے پیشوا ہوتے ہیں انہیں یہ بہت خیال ہوتا ہے کہ ہماری عبادتیں اور ذکر دوسرے لوگوں سے زیادہ ہو اور خاص طور پر تصنع سے کام لیتے ہیں تا لوگ انہیں نہایت نیک سمجھیں۔ اگر مسلمان ہیں تو وضو میں خاص اہتمام کریں گے اور بہت دیر وضو کے اعضاء کو دھوتے رہیں گے اور وضو کے قطروں سے پرہیز کریں گے۔ سجدہ اور رکوع لمبے لمبے کریں گے۔ اپنی شکل سے خاص حالت خشوع و خضوع ظاہر کریں گے اور خوب وظائف پڑھیں گے مگر آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ سب سے اتقٰی اور اورع تھے اور آپ کے برابر خشیت اللہ کوئی انسان پیدا نہیں کر سکتا مگر باوجود اس کے آپؐ ان سب باتوں میں سادہ تھے اور آپ کی زندگی بالکل ان تکلّفات سے پاک تھی۔

ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا اِنِّیْ لَاَ قُوْمُ فِی الصَّلٰوۃِ اُرِیْدُ اَنْ اُطَوِّلَ فِیْھَا فَاَسْمَعُ بُکَاءَ الصَّبِیِّ فَاَتَجَوَّزُ فِیْ صَلَاتِیْ کَرَاھِیَۃَ اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمِّہٖ (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب من اخف الصلوٰۃ عند بکاء الصبی) یعنی میں بعض دفعہ نماز میں کھڑا ہوتا ہوں اور ارادہ کرتا ہوں کہ نماز کو لمبا کر دوں مگر کسی بچہ کے رونے کی آواز سن لیتا ہوں تو اپنی نماز کو اس خوف سے کہ کہیں میں بچہ کی ماں کو مشقت میں نہ ڈالوں نماز مختصر کر دیتا ہوں۔ کس سادگی سے آنحضرت نے فرمایا کہ ہم بچہ کی آواز سنکر نماز میں جلدی کر دیتے ہیں۔ آجکل کے صوفیاء تو ایسے قول کو شاید اپنی ہتک سمجھیں کیونکہ وہ تو اس بات کے اظہار میں اپنا فخر سمجھتے ہیں کہ ہم نماز میں ایسے مست ہوئے کہ کچھ خبر ہی

نہیں رہی۔ اور گو پاس ڈھول بھی بجتے رہیں تو ہمیں کچھ خیال نہیں آتا۔ مگر آنحضرت ؐ ان تکلفات سے بَری تھے۔ آپ کی عظمت خدا کی دی ہوئی تھی نہ کہ انسانوں نے آپ کو معزز بنایا تھا۔ یہ خیال وہی کر سکتے ہیں جو انسانوں کو اپنا عزت دینے والا سمجھتے ہوں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اَنَّہٗ سُئِلَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ فِیْ نَعْلَیْہِ قَالَ نَعَمْ (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی النعال) یعنی آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا نبی کریم ﷺ جوتیوں سمیت نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ آپ نے جواب دیا کہ ہاں پڑھ لیتے تھے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ کس طرح تکلفات سے بچتے تھے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ وہ مسلمان جو ایمان اور اسلام سے بھی ناواقف ہیں۔ اگر کسی کو اپنی جوتیوں سمیت نماز پڑھتے دیکھ لیں تو شور مچا دیں اور جب تک کوئی ان کے خیال کے مطابق کل شرائط کو پورا نہ کرے وہ دیکھ بھی نہیں سکتے مگر آنحضرت ؐ جو ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہیں آپ کا یہ طریق نہ تھا بلکہ آپ واقعات کو دیکھتے تھے نہ تکلفات کے پابند تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے طہارت اور پاکیزگی شرط ہے اور یہ بات قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہے۔ پس جب جوتی پاک ہو اور عام جگہوں پر جہاں نجاست کے لگنے کا خطرہ ہو پہن کر نہ گئے ہوں تو اس میں ضرورت کے وقت نماز پڑھنے میں کچھ حرج نہیں۔ اور آپ ؐ نے ایسا کر کے امت محمدیہ پر ایک بہت بڑا احسان کیا کہ انہیں آئندہ کے لئے تکلفات اور بناوٹ سے بچالیا۔ اس اسوہ حسنہ سے ان لوگوں کو فائدہ اٹھانا چاہئے جو آجکل ان باتوں پر جھگڑتے ہیں اور تکلفات کے شیدا ہیں۔ جس فعل سے عظمتِ الٰہی اور تقویٰ میں فرق نہ آئے اس کے کرنے پر انسان کی بزرگی میں فرق نہیں آسکتا۔

حضرت ابن مسعود انصاریؓ سے روایت ہے قَالَ کَانَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ یُقَالُ لَہٗ اَبُوْ شُعَیْبٍ وَکَانَ لَہٗ غُلَامٌ لَحَّامٌ فَقَالَ اِصْنَعْ لِیْ طَعَامًا اَدْعُوْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَامِسَ خَمْسَۃٍ فَدَعَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَامِسَ خَمْسَۃٍ فَتَبِعَھُمْ رَجُلٌ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّکَ دَعَوْتَنَا خَامِسَ خَمْسَۃٍ وَھٰذَا رَجُلٌ قَدْ تَبِعَنَا فَاِنْ شِئْتَ اَذِنْتَ لَہٗ وَاِنْ شِئْتَ تَرَکْتَہٗ قَالَ بَلْ اَذِنْتُ لَہٗ (بخاری کتاب الاطعمۃ باب الرجل یتکلف الطعام لاخوانہ) آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص انصار میں تھا۔ اس کا نام ابو شعیب تھا اور اس کا ایک غلام تھا جو قصائی کا پیشہ کرتا تھا۔ اسے اس نے حکم دیا کہ تو میرے لئے کھانا تیار کر کہ میں رسول اللہ ﷺ کو چار اور آدمیوں سمیت کھانے کے لئے بلاؤں گا۔ پھر اس نے رسول کریم ﷺ

سے بھی کہلا بھیجا کہ حضورؐ کی اور چار اور آدمیوں کی دعوت ہے۔ جب آپؐ اس کے ہاں چلے تو ایک اور شخص بھی ساتھ ہو گیا۔ جب آپؐ اس کے گھر پہ پہنچے تو اس سے کہا کہ تم نے ہمیں پانچ آدمیوں کو بلوایا تھا اور یہ شخص بھی ہمارے ساتھ آگیا ہے اب بتاؤ کہ اسے بھی اندر آنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اس نے کہا یا رسول اللہ اجازت ہے تو آپؐ اس کے سمیت اندر چلے گئے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کس طرح بے تکلفی سے معاملات کو پیش کر دیتے۔ شاید آپؐ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو چپ ہی رہتا مگر آپؐ دنیا کے لئے نمونہ تھے اس لئے ہر بات میں جب تک خود عمل کر کے نہ دکھاتے ہمارے لئے مشکل ہوتی۔ آپؐ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ سادگی ہی انسان کے لئے مبارک ہے اور ظاہر کر دیا کہ آپؐ کی عزت تکلف یا بناوٹ سے نہیں تھی اور نہ آپؐ ظاہری خاموشی یا وقار سے بڑا بننا چاہتے تھے بلکہ آپؐ کی عزت خدا کی طرف سے تھی۔

گھر کا کام کاج خود کر لیتے

میں نے پچھلی فصل میں بتایا ہے کہ آپؐ کس طرح سادگی سے کام لیتے اور تکلفات سے پرہیز کرتے تھے اور بناوٹ سے کام نہ لیتے تھے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آنحضرتؐ نہ صرف بے تکلفی سے سب کام کر لیتے اور اس معاملہ میں سادگی کو پسند فرماتے بلکہ آپ کی زندگی بھی نہایت سادہ تھی اور وہ اسراف اور غلو جو امراء اپنے گھر کے اخراجات میں کرتے ہیں آپؐ کے ہاں نام کو نہ تھا بلکہ ایسی سادگی سے اپنی زندگی بسر کرتے کہ دنیا کے بادشاہ اسے دیکھ کر ہی حیران ہو جائیں اور اس پر عمل کرنا تو الگ رہا یورپ کے بادشاہ شاید یہ بھی نہ مان سکیں کہ کوئی ایسا بادشاہ بھی تھا جسے دین کی بادشاہت بھی نصیب تھی اور دنیا کی حکومت بھی حاصل تھی مگر پھر بھی وہ اپنے اخراجات میں ایسا کفایت شعار اور سادہ تھا اور پھر بخیل نہیں بلکہ دنیا نے آج تک جس قدر سخی پیدا کئے ہیں ان سب سے بڑھ کر سخی تھا۔

جن کو اللہ تعالیٰ دولت اور مالی دیتا ہے ان کا حال لوگوں سے پوشیدہ نہیں۔ غریب سے غریب ممالک میں بھی نسبتاً امراء کا گروہ موجود ہے حتیٰ کہ جنگلی قوموں اور وحشی قبیلوں میں بھی کوئی نہ کوئی طبقہ امراء کا ہوتا ہے اور ان کی زندگیوں اور دوسرے لوگوں کی زندگیوں میں جو فرق نمایاں ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں خصوصاً جن قوموں میں تمدن بھی ہو ان میں تو امراء کی زندگیاں ایسی پر عیش و عشرت ہوتی ہیں کہ ان کے اخراجات اپنی حدود سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔

آنحضرتؐ جس قوم میں پیدا ہوئے وہ بھی فخر و خیلاء میں خاص طور پر مشہور تھی اور حشم و خدم کو مایہ ناز جانتی تھی۔ عرب سردار باوجود ایک غیر آباد ملک کے باشندہ ہونے کے بیسیوں غلام رکھتے

اور اپنے گھروں کی رونق کے بڑھانے کے عادی تھے اور عرب کے ارد گرد دو قومیں ایسی بستی تھیں کہ جو اپنی طاقت و جبروت کے لحاظ سے اس وقت کی کل معلومہ دنیا پر حاوی تھیں۔ ایک طرف ایران اپنی مشرقی شان و شوکت کے ساتھ اپنے شاہانہ رعب و داب کو کل ایشیا پر قائم کئے ہوئے تھا تو دوسری طرف روم اپنے مغربی جاہ و جلال کے ساتھ اپنے حاکمانہ دستِ تصرّف کو افریقہ اور یورپ پر پھیلائے ہوئے تھا اور یہ دونوں ملک عیش و طرب میں دوسری حکومتوں کو کہیں پیچھے چھوڑ چکے تھے اور آرائش و آرام کے ایسے سامان پیدا ہو چکے تھے کہ بعض باتوں کو تو اب اس زمانہ میں بھی کہ آرام و آسائش کے سامانوں کی ترقی کمال درجہ کو پہنچ چکی ہے۔ نگاہِ حیرت سے دیکھا جاتا ہے۔ دربار ایران میں شاہانِ ایران جس شان و شوکت کے ساتھ بیٹھنے کے عادی تھے اور ان کے گھروں میں جو کچھ سامان طرب جمع کئے جاتے تھے اسے شاہنامہ کے پڑھنے والے بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور جنہوں نے تاریخوں میں ان سامانوں کی تفصیل کا مطالعہ کیا ہے وہ تو اچھی طرح سے ان کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ دربار شاہی کی قالین میں بھی جواہرات اور موتی ٹنکے ہوئے تھے اور باغات کا نقشہ زمردوں اور موتیوں کے صرف سے تیار کر کے میدان دربار کو شاہی باغوں کا مماثل بنا دیا جاتا تھا۔ ہزاروں خدام اور غلام شاہِ ایران کے ساتھ رہتے اور ہر وقت عیش و عشرت کا بازار گرم رہتا۔

رومی بادشاہ بھی ایرانیوں سے کم نہ تھے اور وہ اگر ایشیائی شان و شوکت کے شیدانہ تھے تو مغربی آرائش اور زیبائش کے دلدادہ ضرور تھے۔ جن لوگوں نے رومیوں کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ رومیوں کی حکومتوں نے اپنی دولت کے ایام میں دولت کو کس طریق سے خرچ کیا ہے۔

پس عرب جیسے ملک میں پیدا ہو کر جہاں دوسروں کو غلام بنا کر حکومت کرنا فخر سمجھا جاتا تھا اور جو روم و ایران جیسی مقتدر حکومتوں کے درمیان واقع تھا کہ ایک طرف ایرانی عیش و عشرت اسے لبھا رہی تھی تو دوسری طرف رومی زیبائش و آرائش کے سامان اس کا دل اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ آنحضرت ؐ کا بادشاہِ عرب بن جانا اور پھر ان باتوں میں سے ایک سے بھی متاثر نہ ہونا اور روم و ایران کے دام تزویر سے صاف بچ جانا اور عرب کے بت کو مار کر گرا دینا کیا یہ کوئی ایسی بات ہے جسے دیکھ کر پھر بھی کوئی دانا انسان آپ کے پاکبازوں کا سردار اور طہارت النفس میں کامل نمونہ ہونے میں شک کر سکے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

علاوہ اس کے کہ آپ کے ارد گرد بادشاہوں کی زندگی کا جو نمونہ تھا وہ ایسا نہ تھا کہ اس سے آپ وہ تاثر حاصل کرتے جن کا اظہار آپ کے اعمال کرتے ہیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا درجہ دے دیا تھا کہ اب آپ تمام مخلوقات کے مرجعِ افکار ہو گئے تھے اور ایک طرف روم آپ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اور دوسری طرف ایران آپ کے ترقی کرنے والے اقبال کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور دونوں متفکر تھے کہ اس سیلاب کو روکنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جائے اس لئے دونوں حکومتوں کے آدمی آپؐ کے پاس آتے جاتے تھے اور ان کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ شروع تھا ایسی صورت میں بظاہر ان لوگوں پر رعب قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ آپ بھی اپنے ساتھ ایک جماعت غلاموں کی رکھتے اور اپنی حالت ایسی بناتے جس سے وہ لوگ متاثر اور مرعوب ہوتے مگر آپؐ نے کبھی ایسا نہ کیا۔ غلاموں کی جماعت تو الگ رہی گھر کے کام کاج کے لئے بھی کوئی نوکر نہ رکھا اور خود ہی سب کام کر لیتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی نسبت لکھا ہے کہ اَنَّھَا سُئِلَتْ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا کَانَ یَصْنَعُ فِیْ بَیْتِہٖ قَالَتْ کَانَ یَکُوْنُ فِیْ مِھْنَۃِ اَھْلِہٖ تَعْنِیْ فِیْ خِدْمَۃِ اَھْلِہٖ فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوۃُ خَرَجَ اِلَی الصَّلٰوۃِ (بخاری کتاب الصلوۃ باب من کان فی حاجۃ اھلہ فاقیمت الصلوٰۃ فخرج) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ گھر میں کیا کرتے تھے آپؓ نے جواب دیا کہ آپ اپنے اہل کی مہنت کرتے تھے۔ یعنی خدمت کرتے تھے۔ پس جب نماز کا وقت آجاتا آپؐ نماز کے لئے باہر چلے جاتے تھے۔

اس حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ آپؐ کس سادگی کی زندگی بسر فرماتے تھے اور بادشاہت کے باوجود آپؐ کے گھر کا کام کاج کرنے والا کوئی نوکر نہ ہوتا بلکہ آپؐ اپنے خالی اوقات میں خود ہی اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ مل کر گھر کا کام کاج کروا دیتے۔ اللہ اللہ کیسی سادہ زندگی ہے۔ کیا بینظیر نمونہ ہے۔ کیا کوئی انسان بھی ایسا پیش کیا جاسکتا ہے جس نے بادشاہ ہو کر یہ نمونہ دکھایا ہو کہ اپنے گھر کے کام کے لئے ایک نوکر بھی نہ ہو۔ اگر کسی نے دکھایا ہے تو وہ بھی آپؐ کے خدام میں سے ہو گا کسی دوسرے بادشاہ نے جو آپؐ کی غلامی کا فخر نہ رکھتا ہو یہ نمونہ کبھی نہیں دکھایا۔ ایسے بھی مل جائیں گے جنہوں نے دنیا سے ڈر کر اسے چھوڑ ہی دیا۔ ایسے بھی ہوں گے جو دنیا میں پڑے اور اسی کے ہو گئے۔ مگر یہ نمونہ کہ دنیا کی اصلاح کے لئے اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر بھی اٹھائے رکھا اور ملکوں کے انتظام کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھی مگر پھر بھی اس سے الگ رہے اور اس سے محبت نہ کی

اور بادشاہ ہو کر فقر اختیار کیا یہ بات آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے خدام کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی- جن لوگوں کے پاس کچھ تھا ہی نہیں- وہ اپنے رہنے کے لئے مکان بھی نہ پاتے تھے اور دشمن جنہیں کہیں چین سے نہیں رہنے دیتے تھے کبھی کہیں اور کبھی کہیں جانا پڑتا تھا ان کے ہاں کی سادگی کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں- جس کے پاس ہو ہی نہیں اس نے شان و شوکت سے کیا رہنا ہے مگر ملک عرب کا بادشاہ ہو کر لاکھوں روپیہ اپنے ہاتھ سے لوگوں میں تقسیم کر دینا اور گھر کا کام کاج بھی خود کرنا یہ وہ بات ہے جو اصحاب بصیرت کی توجہ کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتی-

عرب کے ملک میں اب بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں اور ان کے افسر یا امیر جس طرز رہائش کے عادی ہیں انہیں بھی جاننے والے جانتے ہیں- خود شریف مکہ جنہیں صرف حجاز میں ایک حد تک دخل و تصرف حاصل ہے انہی کے دروازہ پر بیسیوں غلام موجود ہیں جو ہر وقت خدمت کے لئے دست بستہ ہیں مگر آنحضرتؐ سارے عرب پر حکمران تھے- یمن اور حجاز اور نجد اور بحرین تک آپ کے قبضہ میں تھے مگر باوجود تمام عرب اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر حکومت کرنے کے آپ کا گھر کے کاروبار خود کرنا اس پاکیزگی کی طرف متوجہ کر رہا ہے جو آپ کے ہر فعل سے ہویدا تھی-

دنیا طلبی اور اظہار جاہ و جلال کی آگ اس وقت لوگوں کے دلوں کو جلا رہی تھی اور امراء تو اس کے بغیر امراء ہی نہیں سمجھے جاتے تھے مگر اس آگ میں سے سلامت نکلنے والا صرف وہی ابراہیم کا ایک فرزند (ﷺ) تھا جس نے اپنے دادا کا معجزہ اور بھی بڑی شان کے ساتھ دنیا کو دکھایا-

میں نے پچھلے باب میں آنحضرت ﷺ کی سادگی کا ذکر کیا ہے کہ آپؐ کس طرح تکلفات سے محفوظ تھے اور آپ کا ہر ایک فعل اپنے اندر سادگی اور بے تکلفی کا رنگ رکھتا تھا اب میں آپؐ کی سادہ زندگی کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں-

کھجور اور پانی پر گزارہ

جو لوگ اس زمانہ کے امراء اور دولتمندوں کے دیکھنے کے عادی ہیں وہ تو خیال کرتے ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ بھی انہیں کی طرح عمدہ عمدہ کھانے کھایا کرتے ہوں گے اور ایک شاہانہ دسترخوان آپؐ کے آگے بچھتا ہو گا لیکن وہ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ واقعہ بالکل خلاف تھا- اور اگر ایک طرف آنحضرت ﷺ سادگی کے کامل نمونہ تھے تو دوسری طرف سادہ زندگی میں بھی آپؐ دنیا کے لئے ایک نمونہ تھے- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے اپنے بھانجہ حضرت عروہؓ سے فرمایا یَا ابْنَ اُخْتِیْ اِنْ کُنَّا لَنَنْظُرُ اِلَی الْھِلَالِ ثُمَّ الْھِلَالِ ثَلَاثَۃَ اَھِلَّۃٍ فِیْ شَھْرَیْنِ وَمَا اُوْقِدَتْ فِیْ اَبْیَاتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَارٌ فَقُلْتُ یَا خَالَۃُ مَا کَانَ یُعِیْشُکُمْ قَالَتْ اَلْاَسْوَدَانِ اَلتَّمَرُ وَالْمَاءُ اِلاَّ اَنَّہٗ قَدْ کَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جِیْرَانٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ کَانَتْ لَھُمْ مَنَائِحُ وَکَانُوْا یَمْنَحُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ اَلْبَانِھَا فَیَسْقِیْنَا (بخاری کتاب الھبۃ و فضلھا) اے میرے بھانجے ہم لوگ تو دیکھا کرتے تھے ہلال کے بعد ہلال حتی کہ تین تین ہلال دیکھ لیتے یعنی دو ماہ گزر جاتے مگر آنحضرت ﷺ کے گھر میں آگ نہ جلتی تھی۔ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا اے خالہ پھر آپ لوگ کیا کھاتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ اَسْوَدَانِ یعنی کھجور اور پانی کھا کر گزارہ کیا کرتے تھے۔ ہاں اتنی بات تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد انصارؓ ہمسایہ تھے اور ان کے پاس دودھ والی بکریاں تھیں وہ آپؐ کو ان کا دودھ ہدیہ کے طور پر دیا کرتے تھے اور آپؐ دودھ ہمیں پلا دیا کرتے تھے۔

اللہ اللہ کیسی سادہ زندگی ہے کہ دو دو ماہ تک آگ ہی نہیں جلتی اور صرف کھجور اور پانی یا دودھ پر گزارہ ہوتا ہے اس طریق عمل کو دیکھ کر مسلمانوں کو شرمانا چاہیئے کیونکہ آجکل اسی اکل و شرب کی مرض میں گرفتار ہیں۔ اگر پوری طرح تحقیقات کی جائے تو مسلمانوں کا روپیہ کھانے پینے میں ہی خرچ ہو جاتا ہے اور وہ مقروض رہتے ہیں۔ وہ اس نبی کی امت ہیں جو مقتدر ہو کر پھر سادہ زندگی بسر کرتا تھا پھر کیسے افسوس کی بات ہے کہ ان کے پاس نہیں ہوتا اور وہ زبان کے چسکے کو پورا کرنے کے لئے قرض لے کر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتے ہیں۔ اگر وہ اپنے آپ کو آنحضرتؐ کے اسوہ حسنہ پر چلاتے اور اسراف سے مجتنب رہتے تو آج اس بدتر حال کو نہ پہنچتے۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرتؐ اگر ایک طرف سادگی کا نمونہ تھے تو دوسری طرف رہبانیت کو بھی ناپسند فرماتے تھے۔ اور اگر اعلیٰ سے اعلیٰ غذا آپ کے سامنے پیش کی جاتی تھی تو اسے بھی استعمال فرماتے تھے اور یہ نہیں کہ نفس کشی کے خیال سے اعلیٰ غذاؤں سے انکار کر دیں اور یہی کمال ہے جو آپؐ کو دوسرے لوگوں پر فضیلت دیتا ہے کیونکہ آپ کل دنیا کے لئے آئے تھے نہ کہ صرف کسی خاص قوم یا خاص گروہ کے لئے اس لئے آپ کا ہر قسم کی خوبی میں کامل ہونا ضروری تھا اور اگر آپؐ ایک طرف سادہ زندگی میں کمال رکھتے تھے تو دوسری طرف طیّب اشیاء کے استعمال سے بھی قطعاً اجتناب نہ فرماتے تھے۔

وفات تک آپؐ کا یہی حال رہا

اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ایسی بات بھی ہو جاتی تھی کہ دو ماہ تک آگ نہ جلے مگر اب میں ایک اور

حدیث درج کرتا ہوں جس سے معلوم ہو گا کہ یہ واقعہ چند مہینوں یا سالوں کا نہیں بلکہ آپؐ کی وفات تک یہی ہوتا رہا اور صرف چند ماہ تک آپ نے اس مشقت کو برداشت نہیں کیا بلکہ آپ ہمیشہ اس سادگی کی زندگی کے عادی رہے اور عسرو یسر ایک سا حال رہا۔ اگر ابتداء عہد میں کہ آپ دشمنوں کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے اور آپ کو اپنا وطن تک چھوڑنا پڑا تھا آپ اس سادگی سے بسر کرتے تھے تو اس وقت بھی جبکہ روپیہ آپؐ کے پاس آتا اور آپ ایک ملک کے بادشاہ ہو گئے تھے آپ اسی سادگی سے بسر اوقات کرتے اور کھانے پینے کی طرف زیادہ توجہ نہ فرماتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اَنَّہٗ مَرَّ بِقَوْمٍ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ شَاۃٌ مَصْلِیَّۃٌ فَدَعَوْہُ فَاَبٰی اَنْ یَّاْکُلَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الدُّنْیَا وَلَمْ یَشْبَعْ مِنْ خُبْزِ الشَّعِیْرِ (بخاری کتاب الاطعمۃ باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ یاکلون) یعنی حضرت ابو ہریرہؓ ایک جماعت پر گزرے اور اس کے سامنے ایک بھنی ہوئی بکری پڑی تھی پس انہوں نے آپ کو بھی بلایا مگر آپ نے کھانے سے انکار کیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے گزر گئے اور آپؐ نے پیٹ بھر کر جَو کی روٹی نہیں کھائی (اس لئے میں بھی ایسی چیزیں نہیں کھاتا) اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو دن نہیں بلکہ وفات تک آنحضرتؐ نے ایسی ہی سادہ زندگی بسر کی۔

اس بات کی تصدیق حضرت عائشہؓ بھی فرماتی ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ مَا شَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُنْذُ قَدِمَ الْمَدِیْنَۃَ مِنْ طَعَامِ الْبُرِّ ثَلَاثَ لِیَالٍ تِبَاعًا حَتّٰی قُبِضَ (بخاری کتاب الاطعمۃ باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ یاکلون) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل نے اس وقت سے کہ آپ مدینہ تشریف لائے اس وقت تک کہ آپ فوت ہو گئے تین دن متواتر گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

ان تینوں حدیثوں کو ملا کر روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نہایت سادگی سے زندگی بسر کی اور باوجود اس محنت اور مشقت کے جو آپ کو کرنی پڑتی تھی آپ اپنے کھانے پینے میں اسراف نہ فرماتے تھے اور اسی قدر کھاتے جو زندگی کے بحال رکھنے کے لئے ضروری ہو اور آپ کا کھانا عبادت اور قوت کے قائم رکھنے کے لئے تھا نہ کہ آپ کی زندگی دنیا کے بادشاہوں کی طرح کھانوں کی خواہش میں گزرتی تھی۔ آپ ہی اس مصرع کے پورا کرنیوالے تھے کہ

خوردن برائے زیستن وذکر کردن است

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ آپ کا کھانا بھی نہایت سادہ ہوتا تھا اور جو کچھ کھاتے تھے اس میں بھی بہت تکلفات سے کام نہ لیتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ مَا عَلِمْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَکَلَ عَلٰی سُکُرُّجَةٍ قَطُّ وَلَا خُبِزَ لَهٗ مُرَقَّقٌ قَطُّ وَلَا اَکَلَ عَلٰی خِوَانٍ قَطُّ قِیْلَ لِقَتَادَةَ فَعَلٰی مَا کَانُوْا یَاْکُلُوْنَ قَالَ عَلَی السُّفَرِ (بخاری کتاب الاطعمة باب الخبز المرقق والاکل علی الخوان) مجھے نہیں معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے کبھی تشتریوں میں کھایا ہو اور نہ آپ کے لئے کبھی چپاتیاں پکائی گئیں اور نہ کبھی آپ نے تخت پر کھایا۔ قتادہ رضی اللہ عنہ سے (جنہوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے) سوال کیا گیا کہ پھر وہ کس پر کھایا کرتے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ دستر خوان پر۔

حضرت انسؓ کی روایت اس لحاظ سے قریباً اہل بیت کے برابر سمجھی جانے کے قابل ہے کہ آپ ابھی بچہ تھے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے کیونکہ ان کے رشتہ داروں نے انہیں آنحضرتؐ کی خدمت کے لئے پیش کیا تھا اور یہ آنحضرتؐ کے مدینہ میں تشریف لانے کے وقت سے جو آپ کے ساتھ رہے تو وفات تک الگ نہ ہوئے اور آپ کی زندگی بھر خدمت میں مشغول رہے۔ پس آپ کی روایت ایک واقف کار کی روایت ہے جو ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ایسے امور میں بہت سے دوسروں کی نسبت زیادہ پختہ اور مضبوط رائے دے سکتا تھا اس لئے نہایت وزن دار اور واقعات کے مطابق ہے۔ اب اس زندگی کو مجموعی حیثیت سے دیکھو کہ ایک انسان بادشاہ ہے اسے سب کچھ نصیب ہے۔ اگر چاہے تو اچھے سے اچھے کھانے کھا سکتا ہے اور پُر تکلف دستر خوانوں پر بیٹھ سکتا ہے لیکن باوجود مقدرت کے وہ اسی بات پر کفایت کرتا ہے کہ کبھی تو کھجور اور پانی سے اپنی بھوک کو توڑ لیتا ہے اور کبھی جو کی روٹی کھا کر گزارہ کر لیتا ہے اور کبھی گیہوں کی روٹی تو کھاتا ہے مگر وہ بے چھنے آٹے کی ہوتی ہے۔ پھر نہ اس کے سامنے کوئی بڑا دستر خوان بچھایا جاتا ہے نہ سینیوں میں کھانا چنا جاتا ہے بلکہ ایک معمولی دستر خوان پر سادہ کھانا رکھ کر کھا لیتا ہے اور باوجود ایسی سادہ زندگی بسر کرنے کے دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا کھانے والوں اور اپنے جسم کی پرورش کرنیوالوں سے ہزار گنا بڑھ کر کام کرتا ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں یہ بھی نمونہ دکھا دیا ہے کہ ہر قسم کی اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں بھی استعمال فرما لیتے تھے مگر دوسری طرف اس سادہ زندگی سے ہمارے ان امراء کے لئے ایک نمونہ بھی قائم کر دیا ہے جن کی زندگی کا انتہائی مقصد اعلیٰ خوراک اور پوشاک ہوتی ہے۔

سب کاموں میں صحابہؓ کے مددگار رہتے

آپؐ مسجد کی اینٹیں ڈھوتے رہتے

آنحضرت ﷺ کی کونسی خوبی ہے جسے انسان خاص طور پر بیان کر سکے۔ کوئی شعبۂ زندگی بھی تو نہیں جس میں آپؐ دوسروں کے لئے نظیر نہ ہوں۔ مختلف خوبیوں میں مختلف لوگ باکمال ہوتے ہیں مگر یہ دین و دنیا کا بادشاہ تو ہر بات میں دوسروں پر فائق تھا۔ جو بات بھی لو اس میں آپؐ کو صاحبِ کمال پاؤ گے۔ میں نے پچھلے باب میں بتایا تھا کہ آپؐ اپنے گھر میں بیویوں کو ان کے کاموں میں مدد دیتے تھے مگر اب اس سے زیادہ میں ایک واقعہ بتاتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں آپ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں حرج نہ دیکھتے تھے بلکہ اس میں فخر محسوس کرتے تھے اور صحابہؓ کے دوش بدوش ہو کر ہر ایک چھوٹے سے چھوٹا کام کرتے اور کبھی یہ نہ ہوتا کہ انہیں حکم دے دیں اور آپ خاموش ہو کر بیٹھ رہیں۔ صحابہؓ کی خوشی تو اسی میں تھی کہ آپ آرام فرمائیں اور وہ آپؐ کے سامنے اپنی فدائیت اور اخلاص کے جوہر دکھائیں مگر آپ کبھی اس کو پسند نہ فرماتے اور ہر کام میں خود شریک ہوتے اور صحابہؓ کا ہاتھ بٹاتے۔

حضرت عائشہؓ ہجرت کے متعلق ایک لمبی حدیث بیان کر کے فرماتی ہیں کہ ثُمَّ رَكِبَ رَاحِلَتَهٗ فَسَارَ يَمْشِيْ مَعَهُ النَّاسُ حَتّٰى بَرَكَتْ عِنْدَ مَسْجِدِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ وَهُوَ يُصَلِّيْ فِيْهِ يَوْمَئِذٍ رِجَالٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَكَانَ مِرْبَدًا لِلتَّمْرِ لِسُهَيْلٍ وَسَهْلٍ غُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِيْ حَجْرِ اَسْعَدَ بْنِ زُرَارَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ بَرَكَتْ بِهٖ رَاحِلَتُهٗ هٰذَا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْمَنْزِلُ ثُمَّ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغُلَامَيْنِ فَسَاوَمَهُمَا بِالْمِرْبَدِ لِيَتَّخِذَهٗ مَسْجِدًا فَقَالَا لَا بَلْ نَهَبُهٗ لَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَبٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ اَنْ يَقْبَلَهٗ مِنْهُمَا هِبَةً حَتّٰى ابْتَاعَهٗ مِنْهُمَا ثُمَّ بَنَاهُ مَسْجِدًا وَطَفِقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْقُلُ مَعَهُمُ اللَّبِنَ فِيْ بُنْيَانِهٖ وَيَقُوْلُ وَهُوَ يَنْقُلُ اللَّبِنَ هٰذَا الْحِمَالُ لَا حِمَالَ خَيْبَرَ هٰذَا اَبَرُّ رَبَّنَا وَاَطْهَرُ وَيَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنَّ الْاَجْرَ اَجْرُ الْاٰخِرَةِ فَارْحَمِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةَ (بخاری باب هجرة النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینہ) یعنی پھر آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور بنی عمرو بن عوف کے پاس سے جہاں آپؐ سب سے پہلے آکر

ٹھہرے تھے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اور لوگ بھی آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے یہاں تک کہ آپ کی اونٹنی اس جگہ پر جاکر بیٹھ گئی جہاں بعد میں آنحضرتؐ کی مسجد بنائی گئی اور اس جگہ ان دنوں میں کچھ مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے اور یہ سہیل اور سہل نامی دو لڑکوں کی کھجوریں سکھانے کا مقام تھا جو یتیم تھے اور اسعد بن زرارہ کی ولایت میں تربیت پا رہے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے جب آپؐ کی اونٹنی وہاں بیٹھ گئی فرمایا کہ انشاء اللہ یہاں ہمارے رہنے کی جگہ ہوگی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں لڑکوں کو جن کی وہ جگہ تھی بلوایا اور ان سے اس جگہ کی قیمت دریافت کی تاکہ وہاں آپؐ مسجد تیار کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپؐ کے ہاتھ فروخت نہیں کرتے بلکہ آپ کو ہبہ کرتے ہیں۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے ان سے بطور ہبہ کے وہ زمین لینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ ان دونوں لڑکوں نے وہ زمین فروخت کر دی۔ پھر آپؐ نے وہاں مسجد بنانی شروع کی اور مسجد بنتے وقت آپؐ خود بھی صحابہؓ کے ساتھ اینٹیں ڈھوتے تھے اور ڈھوتے وقت یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔ یہ بوجھ خیبر کا بوجھ نہیں بلکہ اے ہمارے رب یہ اس سے زیادہ پاکیزہ اور عمدہ ہے۔ اسی طرح آپ یہ شعر بھی پڑھتے اے خدا بدلہ تو وہی بہتر ہے جو آخرت کا ہو پس جب یہ بات ہے تو تو مہاجرین اور انصار پر رحم فرما۔

اس حدیث میں آپ کا یہ قول کہ یہ بوجھ خیبر کا بوجھ نہیں اس سے یہ مراد ہے کہ لوگ خیبر سے کھجوریں یا اور پھل پھول ٹوکروں میں بھر کر لایا کرتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ اینٹیں جو ہم اٹھا رہے ہیں یہ اس بوجھ کی طرح نہیں ہیں بلکہ اس میں تو دنیا کا فائدہ ہوتا ہے اور اس بوجھ کے اٹھانے سے آخرت کا فائدہ ہے اس لئے یہ بوجھ اس بوجھ سے بہت بہتر اور عمدہ ہے۔

اس حدیث کو پڑھ کر کون انسان ہے جو حیرت میں نہ پڑ جائے۔ آنحضرتؐ کے ارشاد پر قربان ہونیوالوں کا ایک گروہ موجود تھا جو آپؐ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار تھے مگر آپؐ کا یہ حال ہے کہ خود اپنے جسم مبارک پر اینٹیں لاد کر ڈھو رہے ہیں۔ یہ وہ کمال ہے جو ہر ایک بے تعصب انسان کو خود بخود آپؐ کی طرف کھینچ لیتا ہے اور چشم بصیرت رکھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ یہ پاک انسان کن کمالات کا تھا کہ ہر ایک بات میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے ایک گھر بن رہا ہے اور آپ اس کی اینٹیں ڈھونے کے ثواب میں بھی شامل ہیں۔ خود اپنے کندھوں پر اینٹیں رکھتے ہیں اور مسجد کی تعمیر کرنے والوں کو لا کر دیتے ہیں۔ یہ وہ عمل تھا جس نے آپ کو ابراہیمؑ کا سچا وارث اور جانشین ثابت کر دیا تھا کیونکہ اگر حضرت ابراہیمؑ نے خود اینٹیں ڈھو

کر کعبہ کی تعمیر کی تھی تو اس وارث علوم سماویہ نے مدینہ منورہ کی مسجد کی تعمیر میں اینٹیں ڈھونے میں اپنے اصحابؓ کی مدد کی۔

کہنے کو تو سب بزرگی اور تقویٰ کا دعویٰ کرنے کو تیار ہیں مگر یہ عمل ہی ہے جو پاکبازی اور زبانی جمع خرچ کرنے والوں میں تمیز کر دیتا ہے اور عمل ہی میں آکر سب مدعیان تقویٰ کو آپؐ کے سامنے باادب سر جھکا کر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔

اس حدیث سے اگر ایک طرف ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی قسم کے کام کرنے سے خواہ وہ بظاہر کیسا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو کسی قسم کا عار نہ تھا۔ آپؐ اس معبود حقیقی کی رضا کی تمام راہوں میں دوسروں سے آگے قدم مارتے تھے تو دوسری طرف یہ امر بھی روشن ہو جاتا ہے کہ آپؐ ماتحتوں سے کام لینے کے ہر فن میں بھی اپنی نظیر آپؐ ہی تھے۔ تاریخ نے ہزاروں لاکھوں برسوں کے تجربات کے بعد ثابت کیا ہے کہ ماتحتوں میں جوش پیدا کرنے اور انہیں اپنے فرائض کے ادا کرنے میں ہوشیار بنانے کا سب سے اعلیٰ اور عمدہ نسخہ یہی ہے کہ خود آفیسر بھی انہیں کام کر کے دکھائیں۔ اور جو شخص خود کام کرے گا اس کے ماتحت ضرور کام میں چست و چالاک ہوں گے مگر جو آفیسر کام سے جی چرائے گا اس کے ماتحت بھی اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی کریں گے اور بہانہ ہی ڈھونڈتے رہیں گے کہ کسی طرح اپنی جان چھڑائیں۔ آنحضرتؐ نے اس گُر کو ایسا سمجھا تھا کہ آپؐ کی ساری زندگی اس قسم کی مثالوں سے پُر ہے۔ آپؐ اپنے ماتحتوں کو جو حکم بھی دیتے اس میں خود بھی شریک ہوتے اور آپ کی نسبت کوئی انسان یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپ صحابہؓ کو مشکلات میں ڈال کر خود آرام سے بیٹھ رہتے ہیں بلکہ آپ ہر ایک کام میں شریک ہو کر ان کے لئے ایک ایسی اعلیٰ اور ارفع نظیر قائم کر دیتے کہ پھر کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع نہ رہتا اگر کوئی افسر اپنے ماتحتوں کو کوئی حکم دے کر خود آرام سے پیچھے بیٹھ رہے تو ضرور ان کے دل میں خیال گزرے گا کہ یہ شخص خود تو آرام طلب ہے مگر دوسروں کو ان کی طاقت سے بڑھ کر کام دیتا ہے اور گو مفوضہ کام زیادہ بھی نہ ہو تو بھی وہ بالطبع خیال کریں گے کہ انہیں ان کی طاقت سے زیادہ کام دیا گیا ہے اور اس بے دلی کی وجہ سے وہ جس قدر کام کر سکتے ہیں اس سے نصف بھی نہ کر سکیں گے اور جو کچھ کریں گے بھی وہ بھی ادھورا ہو گا مگر جب خود افسر اس کام میں شریک ہو گا اور سب سے آگے اس کا قدم پڑتا ہو گا تو ماتحت شکایت تو الگ رہی اپنی طاقت اور قوت کا سوال ہی بھول جائیں گے اور ان میں کوئی اور ہی روح کام کرنے لگے گی۔

اور اسی حکمت سے کام لے کر آنحضرت ؐ نے صحابہؓ کی زندگیوں میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی تھی کہ وہ معمولی انسانوں سے بہت زیادہ کام کرنے والے ہو گئے تھے۔ وہ ہر ایک کام میں اپنے سامنے ایک نمونہ دیکھتے تھے حتیّٰ کہ اگر اینٹیں ڈھونے کا کام بھی ہوتا تھا جو عام مزدوروں کا کام ہے اور ان کا رسول ؐ انہیں اس کام کے کرنے کا حکم دیتا تھا تو سب سے پہلے وہ خود اس کام کی ابتداء کرتا تھا جس کی وجہ سے مردہ دلوں کے دل زندہ اور سستوں کے بدن چست اور کم ہمتوں کی ہمتیں بلند ہو جاتی تھیں۔ ہر ایک عقلمند اس بات کو سوچ کر معلوم کر سکتا ہے کہ جو لوگ آنحضرت ؐ کی نسبت یہ یقین رکھتے تھے کہ آپ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں، اس کے رسول ؐ ہیں اس کے نبی ؐ ہیں سب انبیاءؑ سے افضل ہیں، آپ کی اطاعت سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے، آپ ؐ کی ہی فرمانبرداری میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے، آپ کل انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں، آپ ؐ کی ہی خدمت کرنے سے جنت کے دروازے کھلتے ہیں، وہ جب دیکھتے ہوں گے کہ ایسا عظیم الشان انسان خود اپنے کندھوں پر اینٹیں رکھ کر مسجد بنانے والوں تک پہنچاتا ہے تو ان کے اندر کن خیالات کا دریا موجزن ہوتا ہوگا اور وہ کس جوش اور کس خلوص سے اس کام کو بجالاتے ہوں گے بلکہ کس طرح بجائے تکان کے انکے چہروں سے بشاشت ٹپکتی ہوگی۔ ان میں اچھے اچھے رؤساء بھی تھے، سردار بھی تھے، مالدار بھی تھے، معزز بھی تھے، مگر وہ سب کے سب اپنے عقیدہ کی بناء پر اپنے آپ کو آنحضرت ؐ سے کم درجہ پر یقین کرتے تھے اور اپنے آپکو خادم سمجھتے تھے۔ پس جب وہ آپ ؐ کو اس جوش سے کام کرتے ہوئے دیکھتے ہوں گے تو کیا ان کے بدن کے ہر ایک حصہ میں سنسناہٹ نہ پھیل جاتی ہوگی اور کیا امیر سے امیر انسان بھی اس بلند رتبہ انسان کی معیت میں اینٹیں ڈھونا اپنے لئے ایک نعمت عظمیٰ نہ خیال کرتا ہوگا اور بجائے ذلت کے عزت نہ جانتا ہوگا۔ ہاں ان میں سے ہر ایک ایسا ہی سمجھتا ہوگا اور بالکل ایسا ہی سمجھتا ہوگا۔ اور چونکہ آنحضرت ؐ اپنی ساری عمر میں اسی نمونہ پر قائم رہے اور آپ نے کبھی اس سنت کو ترک نہیں کیا اس لئے آپ ؐ کے صحابہؓ میں یہ بات طبیعت ثانی ہو گئی تھی اور وہ روزانہ ان کی معیت کے جوش سے متاثر ہو کر جس طرح کام کرتے تھے اس کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ آپ ؐ کی غیر حاضری میں بلکہ آپ ؐ کی وفات کے بعد بھی ان کا طریق عمل وہی تھا اور یہ ایک عام بات ہے کہ انسان جس کام کو کچھ مدت تک لگاتار کرتا رہے اس کا عادی ہو جاتا ہے اور جو لوگ ابتداء میں سستی کی عادت ڈال لیتے ہیں وہ ست ہی رہتے ہیں اور جو چستی سے کام کرنے کے عادی ہوں وہ اسی طریق پر کام کئے جاتے ہیں پس جبکہ آنحضرت ؐ ہر ایک کام

میں صحابہؓ کے شریک حال بن کر ان کو خطرناک سے خطرناک اور خوفناک سے خوفناک کام کے کرنے پر آمادہ کر دیتے تھے۔ اور اسی طرح دنیاداروں کی نظروں میں ادنیٰ سے ادنیٰ نظر آنے والے کاموں میں بھی ساتھ شریک ہو کر ان کے دلوں سے جھوٹی عزت اور تکبر کے خیالات کو بالکل نکال دیتے تھے اور اس طریق کا آپ ان کو دس سال متواتر عادی کرتے رہے تھے۔ یہ عادت انہیں کیونکر بھول سکتی تھی۔ چنانچہ جب صحابہؓ کو اپنے سے کئی کئی گنا سپاہ سے مقابلہ پیش آیا اور اس وقت کی کل متمدن قوموں سے ایک ہی وقت میں جنگ چھڑ گئی تو ان کے قدموں میں وہ ثبات دیکھا گیا اور ان کے ہاتھوں نے ایسی طاقت کے کارنامے دکھائے اور ان کے دلوں نے ایسی بے ہراسی اور بے خوفی کا اظہار کیا کہ دنیا دنگ ہو گئی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ آنکھوں کے سامنے آنحضرتؐ کا پاک نمونہ ہر وقت رہتا تھا اور وہ ایک لحہ کے لئے بھی اس دین و دنیا کے بادشاہ کو نہ بھولتے تھے اور اپنے سے دس دس گنا فوج کو الٹ کر پھینک دیتے تھے بلکہ صحابہؓ دوسرے عربوں کی جنگ پر بھی ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ اب دنیا کو کیا ہو گیا۔ آنحضرتؐ کے ماتحت تو ہم اس طرح لڑتے تھے کہ پروں کے پرے اڑا دیتے تھے اور کوئی ہمارے سامنے ٹھہر نہ سکتا تھا پس آپؐ کے ساتھ مل کر کام کرنے میں تدبیر ملکی کا وہ نمونہ نمایاں ہے کہ جس کی مثال کوئی اور انسان نہیں پیش کر سکتا۔ اس حدیث سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ کو ہر وقت اپنے صحابہؓ کو نیکی اور تقویٰ کی تعلیم دینے کا خیال رہتا تھا کیونکہ آپ نے اس موقع پر جو اشعار چنے ہیں وہ ایسے بے نظیر اور مناسب موقع ہیں کہ ان سے بڑھ کر نا ممکن ہے۔ آپؐ کی عادت تھی کہ آپ پورا شعر نہیں پڑھا کرتے تھے مگر صرف اس موقع پر یا ایک دو اور موقعوں پر آپ نے پورے شعر پڑھے ہیں۔ ہاں آپؐ شعر بالکل نہ کہتے تھے اور یہ شعر بھی کسی اور مسلمان کے کہے ہوئے تھے۔

ہاں تو ان اشعار میں آپؐ نے صحابہؓ کو بتایا ہے کہ تم خیبر کی کھجوریں اور سبزیاں وغیرہ اکثر اُٹھاتے ہو گے اور اس کے اٹھانے میں تمہیں یہ خیال ہوتا ہو گا کہ ہم دنیا کا فائدہ اٹھائیں گے اور مال کمائیں گے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے لئے جو کام انسان کرتا ہے وہ گو بظاہر کیسا ہی ادنیٰ معلوم ہو۔ در حقیقت نہایت پاک اور عمدہ نتائج پیدا کرنے والا ہوتا ہے پس یہ خیال اپنے دلوں میں مت لانا کہ ہم اس وقت کیسا ادنیٰ کام کرتے ہیں کہ مٹی اور اینٹیں ڈھو رہے ہیں بلکہ خوب سمجھ لو کو یہ اینٹیں جو تم ڈھو رہے ہو ان کھجوروں اور میووں کے بوجھ سے جو خیبر سے آتا ہے کہیں بہتر ہیں اور اس میں تمہارے نفوس کی پاکیزگی کا سامان ہے ان میووں کے بوجھ کی ہستی ہی کیا ہے کہ اس

کے مقابلہ میں اسے رکھا جائے۔

دوسرے شعر میں آنحضرتؐ نے انہیں بتایا ہے کہ اس کام میں کسی مزدوری یا نفع کا خیال مت رکھنا بلکہ یہ تو خدا کا کام ہے جس میں اگر کسی نفع کی امید ہے تو وہ اللہ ہی کی طرف سے ہوگا اور بجائے فوری نفع کے انجام کی بہتری ہوگی اور جس کا انجام اچھا ہو اس سے زیادہ کامیاب کون ہو سکتا ہے پس اسی پر نظر رکھو۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کر دی کہ خدایا یہ لوگ اپنے کام چھوڑ کر تیرے لئے مشقت اٹھا رہے ہیں تو ان پر رحم فرما۔ پس شاعر نے تو جن خیالات کے ماتحت اشعار کہے ہوں گے ان سے وہی واقف ہو گا مگر آپؐ نے ان اشعار کو پڑھ کر اس کے معانی کو وہ وسعت دے دی ہے کہ باید و شاید۔

ہر کام میں صحابہؓ کے شریک ہوتے

میں نے اس سے پہلے آنحضرت ﷺ کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ بیان کیا ہے جس سے آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور انسانی قلب اس سے اعلیٰ سے اعلیٰ اصول طہارت نفس کے اور قومی ترقی کے نکال سکتا ہے۔ اب میں ایک اور واقعہ اسی پہلے واقعہ کی تائید میں درج کرتا ہوں لیکن چونکہ وہ نئے حالات اور نئے واقعات کو لئے ہوئے ہے اس لئے اس کا ذکر بھی کسی قدر تفصیل سے ہی مناسب ہے۔

یہ بات تو تاریخ دان لوگ جانتے ہیں کہ آنحضرتؐ سے جو مخالفت مکہ والوں کو تھی اس کی نظیر دنیا کی کسی اور تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ کی مخالفت اور ایذاء رسانی کے لئے جو تدابیر انہوں نے کیں یا جو منصوبے انہوں نے باندھے وہ اپنی نظیر آپ ہی تھے اور کبھی کسی قوم نے دنیاوی مخالفت میں یا دینی عداوت میں کسی انسان کی بلاوجہ ایسی بدخواہی نہیں کی جیسی اہل مکہ نے آنحضرتؐ سے کی مگر خدا تعالیٰ نے ہر میدان میں آنحضرت ﷺ کو فتح دی اور آپؐ ہر دشمن پر فاتح رہے۔

گو چھوٹے چھوٹے حملے تو مدینہ میں آتے ہی شروع ہو گئے تھے مگر دراصل جنگوں کی ابتداء اب جنگ بدر سے ہی سمجھنا چاہیئے کہ جس نے ایک طرف کفار کے بڑے بڑے سرداروں کو خاک میں ملا دیا اور دوسری طرف مسلمانوں پر ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کی تائید انسان کو ہر مشکل سے سلامت نکال سکتی ہے اور دشمن خواہ کتنا ہی بہادر اور تعداد میں زیادہ ہو آسمانی تدابیر کا مقابلہ نہیں

کر سکتا اور اس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ قریش کو اپنے سرداروں کے مارے جانے کا طیش ایک دم چین نہ لینے دیتا تھا اور وہ آئے دن مسلمانوں پر حملہ کرتے رہتے تھے جن میں سے مشہور حملہ احد کا بھی ہے یہ حملے متواتر چھ سال تک ہوتے رہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جنگ بدر چھ سال تک متواتر جاری رہی اور اس کا خاتمہ احزاب پر ہؤا جبکہ دشمن نے آخری مرتبہ ہزیمت اٹھا کر پھر مسلمانوں کو دکھ دینے کا ارادہ نہ کیا بلکہ ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہو گئے اور سمجھ گئے کہ ہم مسلمانوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

جنگ احزاب جس کا ذکر قرآن شریف میں بار بار آیا ہے ایک نہایت خطرناک جنگ تھی جس میں مسلمان ایسے مجبور ہوئے تھے کہ انہیں قضائے حاجت کے لئے باہر جانے کو بھی رستہ نہ ملتا تھا اور کفار نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور دس ہزار کا لشکر مرنے مارنے کے ارادہ سے مُٹھی بھر مسلمانوں کے سامنے پڑا ہؤا تھا۔ جو مشکلات کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے۔

جب مسلمانوں کو اس لشکر کی آمد کی خبر ہوئی تھی تو آنحضرتؐ نے سب صحابہؓ کو بلا کر مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے حضرت سلمانؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ ایسے موقع پر ہمارے ملک میں تو خندق کھود لیتے ہیں اور اس کے پیچھے بیٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپؐ نے یہ بات سُنکر خندق کھودنے کا حکم دیا اور اسی وجہ سے جنگ احزاب کو غزوہ خندق بھی کہتے ہیں۔

چالیس چالیس ہاتھ زمین دس دس آدمیوں کو کھودنے کے لئے بانٹ دی گئی اور کام زور و شور سے جاری ہو گیا مگر آنحضرتؐ کہاں تھے؟ آپ بھی ان لوگوں میں کام کر رہے تھے جو ادھر سے ادھر مٹی ڈھو رہے تھے کیونکہ کچھ لوگ زمین کھودتے تھے اور کچھ وہاں سے مٹی اٹھا کر ایک طرف کر دیتے تھے حتّٰی کہ آپ کا بدن مٹی سے بھر گیا تھا۔

حضرت براءؓ سے روایت ہے۔ قال: رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ الْاَحْزَابِ یَنْقُلُ التُّرَابَ، وَقَدْ وَارَی التُّرَابُ بیَاضَ بَطْنِہٖ، وَھُوَ یَقُوْلُ: (لَوْ لَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا، وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا، فَاَنْزِلِ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْنَا، وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَیْنَا، اِنَّ الْاُلٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا، اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا۔ (بخاری کتاب الجہاد باب حفر الخندق)

ترجمہ: فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو جنگ احزاب میں اس حالت میں دیکھا ہے کہ آپؐ بھی مٹی ڈھو رہے تھے اور آپ کے گورے گورے پیٹ پر مٹی پڑی ہوئی تھی اور آپ یہ فرماتے جاتے تھے۔ الٰہی اگر تیرا فضل نہ ہوتا تو ہمیں ہدایت نصیب نہ ہوتی اور نہ ہم صدقہ دیتے نہ

نمازیں پڑھتے۔ پس ہم پر اپنی طرف سے تسلی نازل فرما اور اگر جنگ پیش آئے تو ہمارے پاؤں کو ثبات دیجئے وہ دشمن کے مقابلہ میں بالکل نہ ڈگمگائیں۔ الٰہی یہ کافر ہم پر ظلم اور زیادتی سے حملہ آور ہو گئے ہیں اور ہمارے خلاف انہوں نے بغاوت کی ہے کیونکہ جب انہوں نے ہمیں شرک و کفر میں مبتلا ہونے کی دعوت دی ہے ہم نے ان کی بات کے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اللہ اللہ وہ کیا ہی پیاری مٹی ہو گی جسے آپ اٹھاتے تھے اور وہ مٹی کروڑوں من سونے سے زیادہ قیمتی تھی جسے اٹھانے کے لئے خاتم النبیّن ﷺ کے ہاتھ اٹھتے تھے اور جسے آپ کے پیٹ پر گرنے کا شرف حاصل ہوتا تھا قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عذاب شدید کو دیکھ کر یَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا (النبا:۴۱) کافر کہہ اٹھیں گے کہ کاش ہم مٹی ہوتے اور شریر و بدمعاش لوگ جب سزا پاتے ہیں تو ایسے ہی جملے کہا کرتے ہیں اور اپنی حالت پر افسوس ہی کیا کرتے ہیں مگر خدا گواہ ہے وہ مٹی جو آنحضرتؐ کے پیٹ پر گرتی تھی اس کی نسبت تو ایک مؤمن کا دل بھی للچا جاتا ہے کہ وہ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کہہ اٹھے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ براءؓ اس واقعہ کا بیان کرتے ہوئے اس مٹی کا بھی ذکر کرتے ہیں جو آپؐ کے پیٹ پر گرتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مٹی کو بھی عشق کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور لالچ کی نگاہیں ادھر پڑ رہی تھیں اسی لئے تو مدتوں کے بعد جب وہ جنگ احزاب کا ذکر فرماتے ہیں تو وہ مٹی جو آنحضرت ﷺ کے جسم اطہر پر پڑتی تھی انکو یاد آجاتی ہے۔

میں حیران ہوں کہ صحابہؓ کس محبت اور کس شوق سے اس وقت آنحضرتؐ کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ خدایا وہ مزدور کیسا ہو گا اور کس شان کا ہو گا جس کے سر پر نبوت کا تاج تھا اور دوش پر مٹی کا ڈھیر۔ صحابہؓ کے قدموں میں کیسی تیزی اور کیسی پھرتی پیدا ہو گئی ہو گی ہر ایک ان میں سے اپنے دل میں کہتا ہو گا کہ خدا کے لئے جلد جلد اس مٹی کو صاف کر کے جس قدر ہو سکے آنحضرتؐ کا کام کم ہو اور وہ ایک دوسرے سے بڑھ کر بوجھ اٹھاتے ہوں گے تاکہ جلد اس بوجھ کو ختم کریں اور آنحضرت ﷺ کو آرام دیں۔

میری عقل چکراتی ہے جب میں صحابہؓ کے ان جذبات کا نقشہ اپنے دل میں کھینچتا ہوں جو اس وقت ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہوں گے میری قوت متخیلہ پریشان ہو جاتی ہے جب میں ان خیالات پریشاں کو اپنے سامنے حاضر کرتا ہوں جو اس وقت صحابہؓ کے دل و دماغ میں گشت لگا رہے ہوں گے۔ اف ایک بجلی ایک سٹیم ہو گی جو اس وقت ان کے اندر کام کر رہی ہو گی۔ نہیں بجلی اور

سٹیم کی کیا حقیقت ہے عشق کی گرمی ان سے کام لے رہی تھی اور وہ مٹی جو وہ اپنی گردنوں اور کندھوں پر رکھتے تھے انہیں ہر ایک قسم کی نعمت سے زیادہ معلوم ہوتی تھی وہ بوجھ انہیں سب غموں سے چھڑا رہا تھا اور وہ مٹی انہیں ہیروں اور جواہرات سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی تھی جسے نبیوں کے سرتاج کے کندھوں پر رکھے جانے کا فخر حاصل تھا۔

کیا کوئی مسلمان بادشاہ ایسا ہے جسے اس مٹی کے اٹھانے میں عذر ہو! نہیں اس وقت کے اسلام سے غافل بادشاہ بھی اسے اٹھانے میں فخر سمجھیں گے پھر وہ نیکو کار گروہ اسے اپنی کیسی کچھ عزت نہ خیال کرتا ہوگا۔

اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ آنحضرت ﷺ ان کو ایک گھوڑے پر کھڑے ہوئے حکم نہیں دے رہے تھے بلکہ دوسروں کو حکم دینے سے پہلے آپ خود اپنے کندھوں پر مٹی کا ڈھیر رکھتے تھے پھر جو لوگ اپنے محبوب و آقا کو مٹی ڈھوتے دیکھتے ہوں گے وہ جس شوق سے بھی اس کام کو کرتے بالکل مناسب اور بجا ہوتا یہ ایک ایسی اعلیٰ تدبیر تھی جس سے اگر ایک طرف آنحضرتؐ کی محبت الٰہی ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ فطرت انسانی کو خوب سمجھتے تھے اور آپؐ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر ماتحتوں میں روح پھونکنی ہو تو اس کا ایک ہی گر ہے کہ خود ان کے ساتھ مل کر کام کرو پھر ان میں خود بخود جوش پیدا ہو جائے گا اور اس طرح آپؐ نے ایک ناقابلِ فتح لشکر تیار کر دیا جو ہر زمانے کے لئے مایہ ناز ہے۔

اس حدیث سے ہمیں کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول تو یہ کہ آنحضرتؐ نے صرف ایک دفعہ ہی صحابہؓ کے ساتھ مل کر کام نہیں کیا بلکہ ہمیشہ کرتے تھے کیونکہ پہلا واقعہ جو میں نے بیان کیا ہے وہ آپؐ کی مدنی زندگی کا ابتدائی واقعہ ہے اور یہ چھ سال بعد کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپؐ کی عادت تھی کہ کوئی کام کسی کو نہ دیتے مگر خود اس میں شامل ہوتے تاکہ خود بھی ثواب سے حصہ لیں اور دوسروں کو اور بھی رغبت اور شوق پیدا ہو کہ جب ہمارا آقا خود شامل ہے تو ہمیں اس کام سے کیا عار ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انہیں چستی سے کام کرنے کی عادت ہو اور وہ آپ کے شمول کی وجہ سے جس تیزی سے کام کرتے ہوں گے اسے ان کی عادت میں داخل کر دیا جائے۔

دوسرے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس وقت آپؐ مدینہ تشریف لائے تھے اس وقت آپ بالکل نو وارد تھے اور ابھی آپؐ کی حکومت قائم نہ ہوئی تھی اور گو سینکڑوں جاں نثار موجود تھے جو اپنی جان قربان کرنے کیلئے حاضر تھے مگر پھر بھی دنیا کے لحاظ سے آپ کے ماتحت کوئی علاقہ نہ تھا مگر

غزوہ احزاب کے وقت گو آپ کے لشکر کی تعداد کم تھی مگر بارہا کھلے میدانوں میں کفار کو شکست دے چکے تھے- یہودیوں کے دو قبیلے جلاوطن ہو کر ان کی املاک مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھیں- مدینہ اور اسکے گرد و نواح میں آپ کی حکومت قائم ہو گئی تھی- بقیہ یہودی معاہدہ کی رو سے مسلمانوں سے دب کر صلح کر چکے تھے اس لئے اب آپ کی پہلی حالت اور اس حالت میں بہت فرق تھا اور اب آپ ایک ملک کے حاکم یا بادشاہ تھے پس اس وقت آپؐ کا صحابہؓ کے ساتھ مل کر کام کرنا جبکہ آپ کی عمر بھی چھپن سال کی ہو چکی تھی ایک اور ہی شان رکھتا ہے اور یہ واقعہ پہلے واقعہ سے بھی زیادہ شاندار ہے-

اس واقعہ سے اس بات کی بھی مزید تائید ہو جاتی ہے کہ آپؐ کسی وقت نصیحت سے غافل نہ ہوتے تھے کیونکہ اب بھی آپ نے جو شعر پڑھنے کے لئے چنے ہیں وہ ایسے بامحل ہیں کہ ان میں مسلمانوں کو اپنے کام میں دل لگانے کے لئے ہزاروں ترغیبیں دی ہیں کس طرح انہیں اللہ تعالیٰ کا احسان بتایا ہے کہ یہ خدا کا ہی فضل ہے کہ تم مسلمان ہوئے اور خدا تعالیٰ پر احسان نہ جتانا کہ اس کے دین میں کوشش کر رہے ہو بلکہ اس کا احسان ہے کہ تمہیں اسلام کی توفیق دی اور تمہیں ہدایت کی راہوں پر چلایا- پھر کس طرح اشارہ فرمایا کہ یہ جنگ کوئی دنیاوی جنگ نہیں بلکہ ایک مذہبی جنگ ہے اور اس کا اصل باعث کیا ہے؟ صرف یہ کہ ہم خدا کو کیوں مانتے ہیں شرک کیوں نہیں کرتے اور کیوں کفار کی بات نہیں مان لیتے- اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ جنگ کی ابتداء کفار کی طرف سے ہوتی ہے اور ہمارا کام تو یہی رہا ہے کہ ہم ان کی شرارتوں کے قبول کرنے سے انکار کرتے رہے ہیں-

میں مانتا ہوں کہ یہ شعر کسی اور کے کہے ہوئے ہیں اور آپؐ شعر نہیں کہتے تھے مگر موقعہ پر ان شعروں کو چُن لینا یہ بتاتا ہے کہ آپؐ کس طرح نصیحت کے پہلو کو ہمیشہ اختیار کرتے تھے عرب ایسے موقعوں پر شعر کہنے اور پڑھنے کے عادی ہیں اور صحابہؓ بھی شعر کہتے تھے مگر سب اشعار میں سے ان کو چن لینا یہ حکمت سے خالی نہ تھا اور واقعات بتا رہے ہیں کہ یہ انتخاب بے معنی نہ تھا بلکہ مسلمانوں کو بہت سے ضروری مسائل کی طرف متوجہ کرنا تھا-

غرض کہ آنحضرتؐ کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ خدا کی راہ میں ہر ایک کام میں صحابہؓ کے شریک رہتے تھے اور یہ بات دنیا کے کسی بادشاہ میں اس حد تک نہیں پائی جاتی-

علم غیب سے انکار

اب میں آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کیسا مطہر پیدا کیا۔

بادشاہوں کے درباروں اور رؤساء کی مجالس میں بیٹھنے والے جانتے ہیں کہ ان مقامات میں بیجا تعریف اور جھوٹی مدح کا بازار کیسا گرم رہتا ہے اور کس طرح درباری اور ہم مجلس رؤساء کی تعریف اور مدح میں آسمان اور زمین کے قلابے ملاتے ہیں اور وہ ان کو سن سنکر خوش اور شاداں ہوتے ہیں۔ ایشیائی شاعری کا تو دارومدار ہی عشقیہ غزلوں اور امراء کی مدح سرائی پر ہے۔ شاعر اپنے قصیدہ میں جس امیر کی مدح کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے دنیا کی ہر ایک خوبی اس کی طرف منسوب کر دیتا ہے اور واقعات اور حقیقت سے اسے کوئی غرض نہیں ہوتی جس قدر ممکن ہو جھوٹ بولتا ہے اور تعریف کا کوئی شعبہ اٹھا نہیں رکھتا۔ ہر ایک رنگ سے اس کی بڑائی بیان کرتا ہے اور اس کا دل خوب جانتا ہے کہ میرے بیان میں سوواں حصہ بھی صداقت نہیں۔ سننے والے بھی جانتے ہیں کہ محض بکواس کر رہا ہے مگر وہ جب اس امیر یا بادشاہ کی مجلس یا دربار میں اپنا قصیدہ پڑھ کر سناتا ہے تو ہر ایک شعر پر اپنی داد کا خواہاں ہوتا ہے اور سننے والے جو اس کی دروغ گوئی سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں قصیدہ کے ایک ایک مصرع پر ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر داد دیتے اور تعریف کرتے ہیں کہ سبحان اللہ کیا خوب کہا اور خود وہ امیر جس کی شان میں وہ قصیدہ کہا جاتا ہے باوجود اس علم کے کہ مجھ میں وہ باتیں ہرگز نہیں پائی جاتیں جو شاعر نے اپنے قصیدہ میں بیان کی ہیں۔ ایک ایک شعر پر اسے انعام دیتا اور اپنی ذات پر ناز و فخر کرتا ہے حالانکہ قصیدہ کہنے والا سننے والا اور جس کے حق میں کہا گیا ہے۔ سب کے سب واقعات سے ناواقف نہیں ہوتے اور ہر ایک جانتا ہے کہ قصیدہ میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک شمہ بھر بھی صداقت و راستی نہیں امراء کی قید کیا ہے عام طور پر ہر ایک انسان کا یہی حال ہے (اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ) کہ وہ اپنی تعریف سنکر خوش ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ میری مدح کی جائے اور جب کوئی اسکی نسبت جھوٹی مدح سے بھی کام لیتا ہے تو اس کے اندر یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اس کا انکار کر سکے بلکہ سکوت کو ہی پسند کر لیتا ہے۔

مگر ہمارے آنحضرت ؐ فداہ ابی و امی ایسے برگزیدہ اور پاک و مطہر انسان تھے کہ آپ ان کمزوریوں سے بالکل پاک تھے۔ اور اگر ایک طرف ہر قسم کی خوبیوں کے جامع اور نیکیوں کے خازن تھے تو دوسری طرف آپ یہ بھی کبھی پسند نہ فرماتے تھے کہ کوئی شخص آپ کی نسبت کوئی ایسی بات بیان کرے جو درحقیقت آپ میں نہیں پائی جاتی۔

ربیع بنت معوذؓ سے روایت ہے کہ دَخَلَ عَلَیَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَدَاۃَ بُنِیَ عَلَیَّ، فَجَلَسَ عَلٰی فِرَاشِیْ کَمَجْلِسِكَ مِنِّیْ، وَجُوَیْرِیَاتٌ یَضْرِبْنَ بِالدَّفِّ، یَنْدُبْنَ مَنْ قُتِلَ مِنْ آبَائِہِنَّ یَوْمَ بَدْرٍ، حَتّٰی قَالَتْ جَارِیَۃٌ: وَفِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا تَقُوْلِیْ ھٰکَذَا، وَقُوْلِیْ مَا کُنْتِ تَقُوْلِیْنَ (بخاری کتاب المغازی باب قصہ غزوہ بدر) یعنی جس دن میری شادی ہوئی ہے اس دن آنحضرتؐ میرے پاس تشریف لائے اور میرے فرش پر بیٹھ گئے اسی طرح جس طرح تو بیٹھا ہے (یہ بات راوی کو کہی) اور کچھ لڑکیاں دف بجا رہی تھی اور بدر کی جنگ میں جو ان کے بزرگ مارے گئے تھے ان کی تعریفیں بیان کر رہی تھیں یہاں تک کہ ایک لڑکی نے یہ مصرع پڑھنا شروع کیا (اس مصرع کا ترجمہ یہ ہے) کہ ہم میں ایک رسول ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔ اس بات کو سنکر آنحضرتؐ نے اسے ٹوکا اور فرمایا کہ یہ مت کہو اور جو کچھ پہلے گا رہی تھی وہی گاتی جا۔

یہ وہ اخلاق ہیں جو انسان کو حیران کر دیتے ہیں اور وہ ششدر رہ جاتا ہے کہ ایک انسان ان تمام کمالات کا جامع ہو سکتا ہے۔ بے شک بہت سے لوگوں نے جن کی زبان تیز تھی یا قلم رواں تھی تقریر و تحریر کے ذریعہ اعلیٰ اخلاق کے بہت سے نقشے کھینچے ہیں لیکن وہ انسان ایک ہی گزرا ہے جس نے صرف قول سے ہی نہیں بلکہ عمل سے اعلیٰ اخلاق کا نقشہ کھینچ دیا اور پھر ایسا نقشہ کہ اس کی یاد چشم بصیرت رکھنے والوں کو کبھی نہیں بھول سکتی۔

ایک طرف دنیا کو ہم اپنی تعریف و مدح کا ایسا شیدا دیکھتے ہیں کہ خلاف واقعہ تعریفوں کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں اور جن کی مدح کی جاتی ہے بجائے ناپسند کرنے کے اس پر خوش ہوتے ہیں اور ایک طرف آنحضرتؐ کو دیکھتے ہیں کہ ذرا منہ سے ایسا کلام سنا کہ جو خلاف واقعہ ہے تو باوجود اس کے کہ وہ اپنی ہی تعریف میں ہوتا اس سے روک دیتے اور کبھی اسے سننا پسند نہ فرماتے: ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔ اہل دنیا کدھر کو جا رہے ہیں اور وہ ہمارا پیارا کدھر کو جاتا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے بھی لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو اپنی تعریف کو پسند نہیں کرتے اور بے جا تعریف کرنے والے کو روک دیتے ہیں اور بادشاہوں میں سے بھی ایسے آدمی گزرے ہیں مگر آپؐ کے فعل اور لوگوں کے فعل میں ایک بہت بڑا فرق ہے جو آپؐ کے عمل کو دوسروں کے اعمال پر امتیاز عطا کرتا ہے انگلستان کے مؤرّخ اپنے ایک بادشاہ (کینوٹ) کے اس فعل کو کبھی اپنی یاد سے اترنے نہیں دیتے کہ اس نے اپنے بعض درباریوں کی بے جا خوشامد کو ناپسند کر کے انہیں ایسا سبق

دیا جس سے وہ آئندہ کے لئے اس سے باز آجائیں۔ یعنی جب بعض لوگوں نے اس سے کہا کہ سمندر بھی تیرے ماتحت ہے تو اس نے ان پر ثابت کر دیا کہ سمندر اس کا حکم نہیں مانتا۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ایک دنیاوی بادشاہ تھا اور روحانی بادشاہت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا نہ اسے روحانی حکومت و تصرف کا ادعاء تھا۔ پس اگر ایک ایسی بات کا اس نے انکار کر دیا جو اس کے اپنے راہ سے علیحدہ تھی تو یہ کچھ بڑی بات نہ تھی اسی طرح دیگر لوگ جو جھوٹی مدح سے متنفر ہوتے ہیں ان کے حالات میں بھی بہت کچھ فرق ہے آنحضرت ایک ایسی قوم میں تھے جو سر تسلیم جھکانے کے لئے صرف ایک ایسے شخص کے آگے تیار ہو سکتی تھی جو اپنی طاقت سے بڑھ کر طاقت رکھتا ہو کیونکہ اس کی رگ رگ میں حریت اور آزادی کا خون دوڑ رہا تھا پس اس کے سامنے اپنے آپ کو معمولی انسانوں کی طرح پیش کرنا بلکہ اگر ان میں سے کوئی آپ کی ایسی تعریف بھی کرے جو وہ اپنے بڑوں کی نسبت کرنے کے عادی تھے تو اسے روک دینا یہ ایک ایسا فعل تھا جس سے ایک اوسط درجہ کا انسان گھبرا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے بغیر میرا گزارہ کیونکر ہو گا۔ دوم آپ کو دعویٰ تھا نبوت کا اور نبوت میں آئندہ خبریں دینا ایک ضروری امر ہے پس یہ تعریف خود آپ کے کام کی نسبت تھی گو مبالغہ سے اسے اور کا اور رنگ دے دیا گیا تھا۔ پس آپ کا اس تعریف سے انکار کرنا دوسرے لوگوں سے بالکل ممتاز ہے اور آپ کے نیک نمونہ سے کسی اور انسان کا نمونہ خواہ وہ انبیاءؑ میں سے ہی کیوں نہ ہو قطعاً نہیں مل سکتا۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کس طرح حریت پیدا کرنی چاہتے تھے۔ اس قسم کے خیالات اگر پھیلائے جاتے اور آپؐ ان کے پھیلائے جانے کی اجازت دے دیتے تو مسلمانوں میں شرک ضرور پھیل جاتا مگر ہمارا رسولؐ تو شرک کا نہایت خطرناک دشمن تھا وہ کب اس بات کو پسند فرما سکتا تھا کہ ایسی باتیں مشہور کی جائیں جو واقعات کے خلاف ہیں اور جن سے دنیا میں شرک پھیلتا ہے پس اس نے جونہی ایسے کلمات سنے کہ جن سے شرک کی بو آتی تھی فوراً ان سے روک دیا اور اس طرح بنی نوع انسان کو ذہنی غلامی سے بچا لیا اور حریت کے ایک ایسے ارفع اسٹیج پر کھڑا کر دیا جہاں غلامی کی زہریلی ہواؤں کا پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اے سوچنے والو سوچو تو سہی کہ اگر آنحضرتؐ کو دنیا کی عزت اور رتبہ منظور تھا اور آپ کا سب کام دنیاوی جاہ و جلال حاصل کرنے کے لئے تھا تو آپ کے لئے کیا مناسب تھا۔ کیا یہ کہ لوگوں میں اپنی عزت و شان کے بڑھانے کے لئے باتیں مشہور کراتے یا کہ معتقدین کو ایسا کرنے سے روکتے کیا وہ لوگ جو اپنی خواہش اور آرزو کے ماتحت دنیا میں

بڑا بننا چاہتے ہیں اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ کیا وہ بغیر امتیاز جھوٹ اور سچ کے اپنی شان دوبالا نہیں کرنی چاہتے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک انسان کو بغیر اس کے اشارہ کے کچھ لوگ وہ شان دینا چاہتے ہیں جو اگر کسی انسان میں پائی جائے تو وہ مرجع خلائق بن جائے تو وہ انہیں روکتا ہے اور فوراً کہہ دیتا ہے کہ اور اور باتیں کرو مگر ایسا کلام منہ پر نہ لاؤ جس سے اس وحدہٗ لا شریک ذات کی ہتک ہوتی ہو جو سب دنیا کا خالق و مالک ہے اور میری طرف وہ باتیں منسوب نہ کرو جو در حقیقت مجھ میں نہیں پائی جاتیں۔ ہاں بتلاؤ تو سہی کہ اس کا کیا سبب ہے؟ کیا یہ نہیں کہ وہ دنیا کی عزتوں کا محتاج نہ تھا بلکہ خدا کی رضا کا بھوکا تھا۔ دنیا اس کی نظر میں ایک مُردار سے بھی کم حیثیت رکھتی تھی۔

آرام و آسائش کے اوقات میں اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھنا کوئی بات نہیں۔ انسان کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اس پر کوئی مشکل پیش آئے اور پھر اس میں وہ اپنے حواس کو قائم رکھے اور بدحواس نہ ہو جائے۔ آنحضرتؐ کو اپنی عمر میں ہر قسم کے واقعات پیش آئے اور بہادری اور جرأت میں آپؐ نے اپنے آپ کو بے نظیر ثابت کر دکھایا ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے مختلف واقعات سے ثابت کر چکے ہیں ان مصائب و آسائش کے مختلف دوروں نے آپ کی عظمت اور جلال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ہر حالت میں اپنی کوئی نہ کوئی خوبی ظاہر کی ہے۔ خواہ عسر کا زمانہ ہو یا یسر کا۔ آپؐ بے عیب ثابت ہوئے ہیں اور آپ کی شان ارفع سے ارفع تر ثابت ہوئی ہے۔ نہ تو مصائب کے ایام میں آپ سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی جس سے آپ پر عیب گیری کا موقع ملے نہ خوشی کے دنوں میں آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہؤا جس سے آپ پر اعتراض کرنے کی گنجائش پیدا ہو ہر رنگ اور شکل میں آپؐ دنیا کے لئے ایک قابل قدر نمونہ ثابت ہوئے ہیں۔ جرأت و بہادری کی نسبت تو میں لکھ چکا ہوں اس جگہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آنحضرتؐ کو اپنے حواس پر کیسا قابو تھا اور کس طرح خطرناک سے خطرناک مصائب میں آپؐ استقلال اور ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کرنے کے عادی تھے اور آپ سے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ ہوتی تھی جس سے کسی قسم کی گھبراہٹ ظاہر ہو اور یہ بھی کہ کیوں کر ہر ایک مصیبت میں آپ کے پیش نظر اللہ تعالیٰ ہی دکھائی دیتا تھا۔

یہ تو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ آنحضرت ﷺ دوسرے بادشاہوں کی طرح اپنے ساتھ کوئی پہرہ یا گارڈ نہیں رکھتے تھے بلکہ دوسرے صحابہؓ کی طرح آپؐ بھی اکیلے اپنے کام میں مشغول رہتے تھے ایسے اوقات میں دشمن کو جس قدر دکھ پہنچانے کے مواقع مل سکتے ہیں وہ ایک واقف کار انسان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہو سکتے۔ جو انسان ایک ہی وقت میں اپنے ملک کے ہر طبقہ کے انسانوں

اور ہر فرقہ کے پیروؤں سے خصوصاً اور باقی دنیا سے عموماً جنگ شروع کر چکا ہو اور ان کے عقائد اور خیالات کو مٹا کر ان کی جگہ اپنی لائی ہوئی تعلیم کو پھیلانے میں کوشاں ہو۔ اس سے دیگر مذاہب اور مخالف امراء کے پیروؤں اور متبعین کو جو کچھ بھی عداوت ہو کم ہے اور وہ ہر ممکن سے ممکن ذرائع سے اسے تکالیف پہنچانے کی کوشش کریں گے اور خصوصاً جبکہ انہیں معلوم ہو کہ جس شخص کو ایذاء پہنچانا انہیں مقصود ہے وہ بغیر کسی نگرانی یا پہرہ کے گلیوں اور میدانوں میں تن تنہا چلتا پھرتا انہیں مل سکتا ہے۔

آپؐ کے مخالفین نے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کے لئے جو تدابیر کیں ان سے بحیثیت مجموعی مجھے غرض نہیں۔ میں صرف بخاری کی روایات سے کچھ واقعات اس سیرت میں بیان کر رہا ہوں جن سے آپؐ کے اخلاق پر روشنی پڑتی ہے اس لئے صرف ایک ایسا واقعہ جس سے معلوم ہو سکے گا کہ کس طرح آپؐ کی جان پر اچانک حملہ کیا گیا اور آپؐ نے اس وقت اپنے ہوش و حواس کو کس طرح بجا رکھا۔ اس جگہ بیان کرتا ہوں۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَخْبَرَہٗ اَنَّہٗ غَزَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قِبَلَ نَجْدٍ، فَلَمَّا قَفَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَفَلَ مَعَہٗ، فَاَدْرَکَتْھُمُ الْقَائِلَۃُ فِیْ وَادٍ کَثِیْرِ الْعِضَاہِ، فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَتَفَرَّقَ النَّاسُ فِی الْعِضَاہِ یَسْتَظِلُّوْنَ بِالشَّجَرِ، وَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَحْتَ سَمُرَۃٍ فَعَلَّقَ بِھَا سَیْفَہٗ، قَالَ جَابِرٌ فَنِمْنَا نَوْمَۃً، ثُمَّ اِذَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَدْعُوْنَا فَجِئْنَاہُ، فَاِذَا عِنْدَہٗ اَعْرَابِیٌّ جَالِسٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ ھٰذَا اِخْتَرَطَ سَیْفِیْ وَاَنَا نَائِمٌ فَاسْتَیْقَظْتُ وَھُوَ فِیْ یَدِہٖ صَلْتًا فَقَالَ لِیْ مَنْ یَّمْنَعُکَ مِنِّیْ، قُلْتُ اَللّٰہُ، فَھَا ھُوَ ذَا جَالِسٌ، ثُمَّ لَمْ یُعَاقِبْہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ ذات الرقاع)

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نجد کی جانب ایک غزوہ میں شریک ہوئے اور جب آپؐ سفر سے لوٹے۔ تو آپ بھی حضور کے ساتھ لوٹے راستہ میں لشکر ایک ایسی وادی میں جو کانٹے دار درختوں سے پُر تھی دوپہر کے وقت گزرا۔ پس رسول اللہ ﷺ وہاں اتر پڑے اور آپ کے ساتھی ادھر ادھر درختوں میں پھیل گئے اور درختوں کے سائے میں آرام کرنے لگے۔ آنحضرت ﷺ بھی ایک کیکر کے درخت کے نیچے

ٹھہر گئے اور اپنی تلوار اس درخت سے لٹکا دی- جابرؓ فرماتے ہیں کہ ہم تھوڑی دیر سو گئے پھر اچانک آنحضرت کی آواز آئی کہ آپؐ ہمیں بلاتے ہیں پس ہم آپ کے پاس آئے اور کیا دیکھتے ہیں کہ آپؐ کے پاس ایک اعرابی بیٹھا ہے- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے میری تلوار میان سے کھینچی اور میں سو رہا تھا پس میں جاگ پڑا اور اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی پس اس نے مجھے کہا کہ مجھ سے تجھے کون بچائے گا میں نے اسے جواب دیا کہ اللہ بچائے گا پس دیکھو یہ سامنے بیٹھا ہے پھر جابرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اسے کوئی سزا نہ دی- دوسری جگہوں سے اس واقعہ میں اس قدر اور زیادتی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کا نام سنکر اس شخص پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور آنحضرتؐ نے اٹھالی اور اس سے فرمایا کہ اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا تو اس نے جواب دیا کہ کوئی نہیں- پھر آپ نے اسے چھوڑ دیا اور صحابہؓ کو بلا کر دکھایا-

اس حدیث سے کیسے واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کو اپنے حواس پر ایسا قابو تھا کہ نہایت خطرناک اوقات میں بھی آپ نہ گھبراتے- کہنے کو تو شاید یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ اس اعرابی نے آپ سے پوچھا کہ اب آپ کو کون بچائے گا اور آپ نے فرمایا کہ اللہ لیکن عمل میں یہ بات مشکل ترین امور میں سے ہے-

اول تو سویا ہؤا انسان پہلے ہی بہت سی غفلتوں کے نیچے ہوتا ہے اور بغیر کسی خوف و خطر کے بھی ایک سوئے ہوئے آدمی کو جگا دیا جائے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور کسی خطرناک آواز یا نظارہ کو اگر ایک سویا ہؤا انسان سنکر یا دیکھ کر اٹھے تو اس کے حواس قائم رہنے نہایت مشکل ہوتے ہیں- پس اگر جاگتے ہوئے کوئی دشمن حملہ کرتا تو وہ واقعہ ایسا صاف اور روشن نہ ہوتا جیسا کہ یہ ہے کیونکہ اس سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو کسی خطرہ کا گمان تک بھی نہ تھا جب اس شخص نے آپؐ پر حملہ کیا اور آپ کسی ایسے فعل سے انتہائی درجہ کی لاعلمی میں تھے اور دوسری طرف دشمن کو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہر قسم کی تیاری اور ہوشیاری کا موقع حاصل تھا- علاوہ ازیں ایک آدمی جب بیٹھا یا کھڑا ہو تو وہ حملہ آور کا مقابلہ نہایت آسانی سے کر سکتا ہے اور کم سے کم اسے اپنی جگہ بدلنے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کے حملہ کو اگر طاقت اور قوت سے میں نہیں روک سکتا تو کم سے کم چستی اور چالاکی سے اس کے حملہ کو ضرور بچا سکتا ہوں اور اس کی ضرب سے ایک طرف ہو کر اپنی جان بچانے کا موقع حاصل ہو سکتا ہے لیکن آنحضرتؐ اس وقت لیٹے ہوئے

تھے اور پھر سوئے ہوئے جاگے تھے جس کی وجہ سے کوئی ظاہری تدبیر دشمن کے حملہ کو روکنے کی نہ تھی اور پھر آپؐ غیر علاقہ میں تھے اور دشمن اپنی جگہ پر تھا جہاں اپنی حفاظت کا اسے ہر طرح یقین تھا مگر باوجود ان حالات کے آپؐ نے ایک ذرہ بھر بھی تو گھبراہٹ ظاہر نہ کی۔

اس اعرابی کا یہ کہنا بھی کہ اب تجھے کون بچا سکتا ہے صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسے بھی کامل یقین تھا کہ اب کوئی دنیاوی سامان ان کے بچاؤ کا نہیں مگر اسے کیا معلوم تھا کہ جس شخص پر میں حملہ کرنا چاہتا ہوں وہ معمولی انسانوں میں سے نہیں بلکہ ان میں سے ہے جو خالق ارض و سما کے دربار کے مقرب اور اس کے ظلِّ عافیت کے نیچے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اسے جس آرام اور اطمینان قلب کے ساتھ جواب دیا ہے کہ مجھے اللہ بچائے گا وہ روز روشن کی طرح اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ آپ کے دل میں غیر اللہ کا خوف ایک لحہ کے لئے بھی نہیں آتا تھا اور آپ کا دل ایسا مضبوط اور قوی تھا کہ خطرناک سے خطرناک اوقات میں بھی اس میں گھبراہٹ کا وجود نہ پایا جاتا تھا اور اپنے حواس پر آپ کو اس قدر قدرت تھی کہ اور تو اور خود دشمن بھی جو آپ کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا بدحواس ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر گئی کیونکہ اس نے دیکھ لیا کہ میں ایک ایسی طاقت کا مقابلہ کر رہا ہوں جسے نقصان پہنچانے کی بجائے میں خود تباہ ہو جاؤں گا۔

ہمیشہ خیر اختیار کرتے

آنحضرت ﷺ کبھی ضد سے کام نہ لیتے تھے بلکہ جس بات میں خیر دیکھتے اس کو اختیار کرتے تھے اور قطعاً اس بات کی پرواہ نہ کرتے کہ اس سے میرے کسی حکم کی خلاف ورزی تو نہیں ہوتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ رجالِ سیاستِ دنیویہ نے اپنے اصولوں میں سے ایک یہ اصل بھی بنا رکھی ہے کہ بادشاہ یا حاکم جو حکم دے دے اور جو فیصلہ کر دے اس میں تغیر نہ کرے اور جس طرح کیا ہے اس پر قائم رہے تاکہ لوگوں کے دل میں یہ نہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے ڈرا کر منوالیا ہے یا کم سے کم دوسروں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے کہ ایک بات کہہ کر پھر اس سے رجوع کر لیا ہے اور اس اصل پر رجالِ سیاست ایسے پکے اور قائم رہتے ہیں کہ بعض اوقات جنگوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے مگر وہ اپنی بات کی پیچ کے لئے اور دبدبہ حکومت قائم رکھنے کے لئے ملک کو جنگ میں ڈال دیتے ہیں لیکن اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اپنے فیصلہ کو واپس لے لیں۔

جو لوگ تاریخ انگلستان سے واقف ہیں ان سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ریاستہائے متحدہ سے

جنگ کی وجہ یہی ہوئی کہ انگلستان کے رجالِ سیاست ایک فیصلہ دے کر اس کو واپس نہیں لینا چاہتے تھے گو وہ اس بات کو خوب سمجھ گئے تھے کہ ہم غلطی کر رہے ہیں جس کا نتیجہ ایک خونریز جنگ ہوئی اور ایک سرسبز و شاداب ملک ہاتھ سے جاتا رہا۔

خود ہندوستان میں تقسیم بنگالہ کا فیصلہ ایک کھلی نظیر موجود ہے کہ خود وزراء انگلستان قبول کرتے کہ یہ فیصلہ درست نہیں ہوا لیکن ڈرتے تھے کہ اسے تبدیل کر دیں گے تو ملک میں حکومت کی بے رُعبی ہو گی چنانچہ جب تک شہنشاہ ہند کی تاجپوشی کا ایک نہایت غیر معمولی موقع پیش نہیں آیا اس حکم کو منسوخ نہیں کیا گیا۔

اور درحقیقت بظاہر دنیاوی نقطۂ خیال سے یہ بات ہے بھی درست کیونکہ جب رعایا کے دل میں یہ بیٹھ جائے کہ ہم جس طرح چاہیں کرا سکتے ہیں یا ان کو یہ خیال ہو جائے کہ ہمارا حاکم تو بالکل غیر مستقل مزاج آدمی ہے اسے جس طرح چاہیں پھیر دیں تو وہ بہت دلیر اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں سست ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے رجالِ سیاست نے اس بات کو بہت پسند کیا ہے کہ حاکم اپنے فیصلہ کو بہت جلدی واپس نہ لے بلکہ حتّی الامکان اس پر قائم رہے۔

ہمارے آنحضرت ﷺ جس پاک فطرت کو لے کر پیدا ہوئے اور جن کمالات کو آپؐ نے حاصل کیا تھا وہ چاہتے تھے کہ آپ ہمیشہ خیر اختیار کریں ایک دنیاوی بادشاہ یا حاکم اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ میں اپنے ایام حکومت میں حکومت کے رعب کو قائم رکھتا رہا ہوں اور ایک مضبوط ارادہ کے ساتھ نظام حکومت چلاتا رہا ہوں مگر میرے اس پیارے کا یہ فخر نہ تھا کہ میں نے جو کچھ کہہ دیا اس پر پابند رہا ہوں بلکہ اس کا فخر یہ تھا کہ میں نے جب عمل کیا خیر پر کیا اور جب مجھے معلوم ہوا کہ میں فلاں رنگ میں کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں میں نے اس کے پہنچانے میں کوتاہی نہیں کی پس اگر روحانیت کی دنیا میں کوئی شخص قابل اتباع ہو سکتا ہے تو وہ آنحضرت ﷺ ہی ہو سکتے ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

اِنَّا اَتَیْنَا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَفَرٌ مِنَ الْاَشْعَرِیِّیْنَ فَاسْتَحْمَلْنَاہُ، فَاَبٰی اَنْ یَّحْمِلَنَا، فَاسْتَحْمَلْنَاہُ فَحَلَفَ اَنْ لَّا یَحْمِلَنَا، ثُمَّ لَمْ یَلْبَثِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اُتِیَ بِنَھْبِ اِبِلٍ، فَاَمَرَ لَنَا بِخَمْسِ ذَوْدٍ، فَلَمَّا قَبَضْنَاھَا قُلْنَا: تَغَفَّلْنَا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمِیْنَہٗ، لَا نُفْلِحُ بَعْدَھَا اَبَدًا، فَاَتَیْتُہٗ فَقُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اِنَّکَ حَلَفْتَ اَنْ لَّا تَحْمِلَنَا وَقَدْ حَمَلْتَنَا؟ قَالَ: اَجَلْ، وَلٰکِنْ لَّا اَحْلِفُ عَلٰی یَمِیْنٍ، فَاَرٰی غَیْرَھَا خَیْرًا مِنْھَا

اِلَّا اَتَیْتُ الَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ مِّنْهَا (بخاری کتاب المغازی باب قدوم الاشعریین و اھل الیمن)

آپ نے فرمایا کہ ہم چند آدمی جو اشعری قبیلہ کے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور ہم نے آپ سے سواری مانگی۔ آپ نے فرمایا کہ سواری نہیں ہے میں نہیں دے سکتا۔ ہم نے پھر عرض کیا کہ ہمیں سواری دی جاوے تو آپ نے قسم کھالی کہ ہمیں سواری نہ دیں گے پھر کچھ زیادہ دیر نہ لگی تھی کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ اونٹ لائے گئے پس آپؐ نے حکم دیا کہ ہمیں پانچ اونٹ دیئے جاویں۔ پس جب ہم نے وہ اونٹ لے لئے ہم نے آپس میں کہا کہ ہم نے تو آنحضرت ﷺ کو دھوکا دیا ہے اور آپؐ کو آپ کی قسم یاد نہیں دلائی ہم اس کے بعد کبھی مظفر و منصور نہ ہوں گے اس خوف سے میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہؤا اور کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ آپ ہمیں سواری نہ دیں گے اور اب تو آپ نے ہمیں سواری دے دی ہے۔ فرمایا ہاں اسی طرح ہؤا ہے میں کوئی قسم نہیں کھاتا لیکن جب اس کے سوا کوئی اور بات بہتر دیکھتا ہوں تو وہ بات اختیار کرلیتا ہوں جو بہتر ہو۔

اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مقصود کیا تھا آپ کے کام کسی دنیاوی مصلحت یا ارادہ کے ماتحت نہ ہوتے تھے بلکہ آپ اپنے ہر کام میں یہ بات مدنظر رکھتے تھے کہ جو کچھ آپ کرتے ہیں وہ واقعہ میں نفع رساں بھی ہے یا نہیں اور اگر کبھی معلوم ہو جائے کہ آپ نے کوئی ایسا کام کیا ہے یا اس کے کرنے کا ارادہ کیا ہے جو کسی انسان کے لئے مضر ہو گا یا اسے اس سے تکلیف ہو گی تو آپ فوراً اپنے پہلے حکم کو واپس لے لیتے اور وہی بات کرتے جو بہتر اور نفع رساں ہوتی۔

ایک ظاہر بین انسان کہہ سکتا ہے کہ اس سے رعب و داب میں فرق آتا ہے اور حکومت کو نقصان پہنچتا ہے مگر اس بات سے تو آپ کی خوبی اور نیکی کا پتہ چلتا ہے کہ خواہ کوئی امر کیسا ہی خطرناک اور مُضر معلوم ہوتا ہو آپ بے دھڑک اسے اختیار کر لیتے تھے جبکہ آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس سے لوگوں کے حقوق کی نگہداشت ہوتی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص نشان تھا کہ باوجود اس بات کے آپ کو ایسا رعب و داب میسر تھا جو دنیا کے کسی بادشاہ کو میسر نہیں۔ واقعہ میں ایک بادشاہ کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سکھ پہنچائے اور آپ نے اپنے عمل سے ثابت کردیا کہ آپ دین و دنیا کے لئے ایک کامل نمونہ تھے اور آپؐ کی زندگی دنیاوی بادشاہوں کے لئے بھی نمونہ ہے کہ بادشاہوں کو اپنے ماتحتوں اور رعایا کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے اور کس طرح ضد اور تعصب سے الگ ہو کر ہر ایک قربانی اختیار کر کے لوگوں کو آرام پہنچانے کے لئے تیار رہنا

چاہیئے۔

ہمیں اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماتحتوں پر اسی وقت بادشاہ کے حکم بدل دینے کا برا اثر پڑتا ہے جب کہ ان کو یہ یقین ہو کہ بادشاہ ہمارا یقینی خیر خواہ نہیں بلکہ اس نے ڈر کر اپنے حکم میں تبدیلی کی ہے اور جب انہیں یقین ہو کہ اس کے احکام ایک غیر مستقل طبیعت کا نتیجہ ہیں لیکن اگر انہیں اس بات کا کامل یقین ہو جائے کہ کوئی بادشاہ یا حاکم ان سے ڈر کر یا بے استقلالی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے حکم بدلتا ہے کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے اور کسی وقت بھی ان کی بھلائی سے غافل نہیں ہوتا تو بجائے اس کے کہ ان کے دلوں میں بے رُعبی پیدا ہو وہ اس سے اور بھی مرعوب ہو جاتے ہیں اور ان کے دل محبت سے بھر جاتے ہیں اور جو بادشاہ اپنی رعایا اور ماتحتوں کے دلوں میں اپنی خیر خواہی کا ایسا یقین بٹھادے وہی سب سے زبردست بادشاہ ہے اور یہی خیال تھا جس نے کہ ابو موسیٰؓ اور ان کے ساتھیوں کو مجبور کیا کہ بجائے اس خیال کے کہ یہ سمجھیں کہ آنحضرت ﷺ سے کسی قسم کی بے استقلالی ظاہر ہوئی ہے انہوں نے جنگ کے لئے پیدل جانا منظور کیا مگر یہ نہ پسند کیا کہ آپ کو دوبارہ قسم یاد دلائے بغیر ان سواریوں کو استعمال کریں۔ اور یہ اس عظیم الشان فتح کا نشان تھا جو آپ کو اپنے اصحابؓ کے دلوں پر حاصل تھی۔

تحمّل انسان کے نیک خصال میں سے تحمل کی خصلت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے کیونکہ تحمل سے بہت سے جھگڑوں فسادوں اور لڑائیوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ بہت دفعہ انسان ایک بات سنکر بحث مباحثہ میں پڑ جاتا ہے اور بجائے فائدہ کرنے کے نقصان پہنچاتا ہے۔ بعض لوگ تو اپنے خیال کے خلاف بات سنتے ہی کچھ ایسے دیوانہ ہو جاتے ہیں کہ حدِّ اعتدال سے بڑھ کر گالیوں پر اتر آتے ہیں اور عظیم الشان فسادوں کے بانی ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے منشا کے خلاف بات سنکر ایسی طول طویل بحثیں شروع کر دیتے ہیں کہ جن کا ختم ہونا محالات سے ہو جاتا ہے لیکن حقیقی مصلح وہی ہے جو اکثر اوقات تحمل سے کام لیتا ہے اور احتیاط کے ساتھ سمجھاتا ہے۔

آجکل کے بادشاہ یا علماء یا گدی نشین اپنی حیثیت کا قیام ہی اسی میں دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص ان کے خلاف بات نہ کرے اور مرضی کے خلاف بات دیکھ کر فوراً ناراض ہو جاتے ہیں اور تحمل سے کام نہیں لیتے ممکن نہیں کہ ان لوگوں کے مزاج کے خلاف کوئی شخص بات کہہ دے اور پھر بغیر کچھ سخت و سست کلام سننے کے اس مجلس سے اٹھے مگر ہمارے آنحضرت ﷺ اس طرز کے نہ تھے۔ اس موقع پر تحمل سے کام لیتے اور بجائے گالیاں دینے اور سختی کرنے کے ایسا نرمی کا طریق اختیار

کرتے کہ دوسرا خود بخود شرمندہ ہو جائے۔

حضرت علیؓ اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک موقع پر جبکہ حضرت علیؓ نے آپ کو ایسا جواب دیا جس میں بحث اور مقابلہ کا طرز پایا جاتا تھا تو بجائے اس کے کہ آپ ناراض ہوتے یا خفگی کا اظہار کرتے آپ نے ایک ایسی لطیف طرز اختیار کی کہ حضرت علیؓ غالباً اپنی زندگی کے آخری ایام تک اس کی حلاوت سے مزا اٹھاتے رہے ہوں گے اور انہوں نے جو لطف اٹھایا ہوگا وہ تو انہیں کا حق تھا۔ اب بھی آنحضرت ﷺ کے اس اظہار ناپسندیدگی کو معلوم کر کے ہر ایک باریک بین نظر محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَرَقَهٗ وَ فَاطِمَةَ بِنْتَ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَيْلَةً فَقَالَ: اَلَا تُصَلِّيَانِ فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْفُسُنَا بِيَدِ اللّٰهِ، فَاِذَا شَاءَ اَنْ يَّبْعَثَنَا بَعَثَنَا فَانْصَرَفَ حِيْنَ قُلْنَا ذَالِكَ وَلَمْ يَرْجِعْ اِلَيَّ شَيْئًا ثُمَّ سَمِعْتُهٗ وَهُوَ مُوَلٍّ يَضْرِبُ فَخِذَهٗ وَهُوَ يَقُوْلُ: وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (بخاری کتاب التہجد باب تحریض النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی قیام اللیل) یعنی نبی کریم ﷺ ایک رات میرے اور فاطمہ الزہراؓ کے پاس تشریف لائے جو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں اور فرمایا کہ کیا تم تہجد کی نماز نہیں پڑھا کرتے۔ میں نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ہماری جانیں تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں جب وہ اٹھانا چاہے اٹھا دیتا ہے۔ آپ اس بات کو سنکر لوٹ گئے اور مجھے کچھ نہیں کہا پھر میں نے آپؐ سے سنا اور آپ پیٹھ پھیر کر کھڑے ہوئے تھے اور آپ اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہہ رہے ہیں کہ انسان تو اکثر باتوں میں بحث کرنے لگ پڑتا ہے۔

اللہ اللہ کس لطیف طرز سے حضرت علیؓ کو آپ نے سمجھایا کہ آپ کو یہ جواب نہیں دینا چاہیئے تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اول تو بحث شروع کر دیتا کہ میری پوزیشن اور رُتبہ کو دیکھو۔ پھر اپنے جواب کو دیکھو کہ کیا تمہیں یہ حق پہنچتا تھا کہ اس طرح میری بات کو رڈ کر دو۔ یہ نہیں تو کم سے کم بحث شروع کر دیتا کہ یہ تمہارا دعویٰ غلط ہے کہ انسان مجبور ہے اور اس کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں وہ جس طرح چاہے کرواتا ہے چاہے نماز کی توفیق دے چاہے نہ دے اور کہتا کہ جبر کا مسئلہ قرآن شریف کے خلاف ہے لیکن آپ نے ان دونوں طریق میں سے کوئی بھی اختیار نہ کیا اور نہ تو ان پر ناراض ہوئے نہ بحث کر کے حضرت علیؓ کو ان کے قول کی غلطی پر آگاہ کیا بلکہ ایک طرف ہو کر ان کے اس جواب پر اس طرح اظہار حیرت کر دیا کہ انسان بھی عجیب ہے کہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی پہلو اپنے موافق نکال ہی لیتا ہے اور بحث شروع کر دیتا ہے حقیقت میں آپ کا اتنا کہہ

دینا ایسے ایسے منافع اندر رکھتا تھا کہ جس کا عُشرِ عَشیر بھی کسی اور کی سو بحثوں سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس حدیث سے ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے آنحضرتؐ کے اخلاق کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور اسی جگہ ان کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اول تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دینداری کا کس قدر خیال تھا کہ رات کے وقت پھر کر اپنے قریبیوں کا خیال رکھتے تھے۔ بہت لوگ ہوتے ہیں جو خود تو نیک ہوتے ہیں 'لوگوں کو بھی نیکی کی تعلیم دیتے ہیں لیکن ان کے گھر کا حال خراب ہوتا ہے اور ان میں یہ مادہ نہیں ہوتا کہ اپنے گھر کے لوگوں کی بھی اصلاح کریں اور انہی لوگوں کی نسبت مثل مشہور ہے کہ چراغ تلے اندھیرا۔ یعنی جس طرح چراغ اپنے آس پاس تمام اشیاء کو روشن کر دیتا ہے لیکن خود اس کے نیچے اندھیرا ہوتا ہے اسی طرح یہ لوگ دوسروں کو تو نصیحت کرتے پھرتے ہیں مگر اپنے گھر کی فکر نہیں کرتے کہ ہماری روشنی سے ہمارے اپنے گھر کے لوگ کیا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر آنحضرتؐ کو اس بات کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عزیز بھی اس نور سے منور ہوں جس سے وہ دنیا کو روشن کرنا چاہتے تھے اور اس کا آپ تعہّد بھی کرتے تھے اور ان کے امتحان و تجربہ میں لگے رہتے تھے۔ اور تربیت اعزّاء ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا جوہر ہے جو اگر آپ میں نہ ہوتا تو آپ کے اخلاق میں ایک قیمتی چیز کی کمی رہ جاتی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ کو اس تعلیم پر کامل یقین تھا جو آپؐ دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے اور ایک منٹ کے لئے بھی آپ اس پر شک نہیں کرتے تھے اور جیسا کہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ نَعُوْذُ بِاللہ دنیا کو اُلّو بنانے کے لئے اور اپنی حکومت جمانے کے لئے آپ نے یہ سب کارخانہ بنایا تھا ورنہ آپ کو کوئی وحی نہ آتی تھی۔ یہ بات نہ تھی۔ بلکہ آپؐ کو اپنے رسول اور خدا کے مأمور ہونے پر ایسا ثلجِ قلب عطا تھا کہ اس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ کیونکہ ممکن ہے کہ لوگوں میں آپ بناوٹ سے کام لے کر اپنی سچائی کو ثابت کرتے ہوں لیکن یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ رات کے وقت ایک شخص خاص طور پر اپنی بیٹی اور داماد کے پاس جائے اور ان سے دریافت کرے کہ کیا وہ اس عبادت کو بھی بجالاتے ہیں جو اس نے فرض نہیں کی بلکہ اس کا ادا کرنا مؤمنوں کے اپنے حالات پر چھوڑ دیا ہے اور جو آدھی رات کے وقت اٹھ کر ادا کی جاتی ہے۔ اس وقت آپؐ کا جانا اور اپنی بیٹی اور داماد کو ترغیب دینا کہ وہ تہجد بھی ادا کیا کریں اس کامل یقین پر دلالت کرتا ہے جو آپ کو اس تعلیم پر تھا جس پر آپ لوگوں کو چلانا چاہتے تھے ورنہ ایک مفتری انسان جو جانتا ہو کہ ایک تعلیم پر چلنا نہ چلنا ایک سا ہے اپنی اولاد کو ایسے پوشیدہ وقت میں اس تعلیم پر عمل کرنے کی نصیحت

نہیں کر سکتا یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ایک آدمی کے دل میں یقین ہو کہ اس تعلیم پر چلے بغیر کمالات حاصل نہیں ہو سکتے۔

تیسری بات وہی ہے جس کے ثابت کرنے کے لئے میں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ ہر ایک بات کے سمجھانے کے لئے تحمل سے کام لیا کرتے تھے اور بجائے لڑنے کے محبت اور پیار سے کسی کو اس کی غلطی پر آگاہ فرماتے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر جب حضرت علیؓ نے آپ کے سوال کو اس طرح رد کرنا چاہا کہ جب ہم سو جائیں تو ہمارا کیا اختیار ہے کہ ہم جاگیں کیونکہ سویا ہؤا انسان اپنے آپ پر قابو نہیں رکھتا۔ جب وہ سو گیا تو اب اسے کیا خبر ہے کہ فلاں وقت آگیا ہے اب میں فلاں کام کر لوں اللہ تعالیٰ آنکھ کھول دے تو نماز ادا کر لیتے ہیں ورنہ مجبوری ہوتی ہے (کیونکہ اس وقت الارم کی گھڑیاں نہ تھیں) اس بات کو سنکر آنحضرتؐ کو تو حیرت ہونی ہی تھی کیونکہ آپؐ کے دل میں جو ایمان تھا وہ کبھی آپؐ کو ایسا غافل نہ ہونے دیتا تھا کہ تہجد کا وقت گزر جائے اور آپ کو خبر نہ ہو اس لئے آپؐ نے دوسری طرف منہ کر کے صرف یہ کہہ دیا کہ انسان بات مانتا نہیں جھگڑتا ہے۔ یعنی تم کو آئندہ کے لئے کوشش کرنی چاہئے تھی کہ وقت ضائع نہ ہو نہ کہ اس طرح ٹالنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں میں نے پھر کبھی تہجد میں ناغہ نہیں کیا۔

طہارۃ النفس۔ تحمّل

ہم پہلے حضرت علیؓ کے ایک واقعہ سے ثابت کر چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نہایت بردبار تھے اور برخلاف بہت سے بادشاہوں کے جو اپنے خلاف بات سن کر یا اپنی مرضی کے ناموافق حرکت دیکھ کر نہایت غصہ اور جوش سے بھر جاتے ہیں اکثر چشم پوشی اور اعراض سے کام لیتے تھے اور ایسا طریق اختیار کرتے جس میں تحمل کا پہلو غالب ہو۔ اب ہم ایک اور ایسا ہی واقعہ بیان کرتے ہیں جو ایک دوسرے پہلو سے آپ کے تحمل پر روشنی ڈالتا ہے اور آپ کی صفات حسنہ کو اور بھی روشن کر کے ظاہر کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ ہوازن پر فتح پا کے واپس آرہے تھے اور اس جنگ میں جو اموال مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان کی تقسیم کا سوال درپیش تھا۔ آپ کا منشا تھا کہ اگر ہوازن تائب ہو کر آجائیں اور معافی کے خواستگار ہوں تو ان کے اموال اور قیدی انہیں واپس کر دیئے جائیں لیکن دن پر دن گذرتے چلے گئے اور ہوازن کی طرف سے کوئی وفد طلب گار معافی ہو کر نہ آیا۔ بہت دن تک آپ نے تقسیم اموال کے کام کو تعویق میں رکھا۔ لیکن آخر اس بات کو مناسب سمجھا کہ اموال تقسیم کر دیئے جائیں۔ چنانچہ جعرانہ پہنچ کر آپ نے ان اموال کو تقسیم کرنا شروع کیا۔ منافق تو ہمیشہ اس

تاک میں لگے رہتے تھے کہ کوئی موقعہ ملے تو ہم آپ پر اعتراض کریں۔ کوئی نہ کوئی راہ نکال کر ذوالخویصرہ التیمی نے عین تقسیم کے وقت بڑھ کر کہا کہ آپ اس تقسیم میں عدل کو مد نظر رکھیں۔ جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ آپ اس وقت عدل سے کام نہیں لے رہے امام بخاری صاحب نے اس واقعہ کو حضرت جابرؓ سے یوں روایت کیا ہے کہ حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ: حَدَّثَنَا قُرَّةُ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ دِيْنَارٍ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْسِمُ غَنِيْمَةً بِالْجِعْرَانَةِ، إِذْ قَالَ لَهُ رَجُلٌ: اِعْدِلْ، فَقَالَ لَهُ: (لَقَدْ شَقِيْتَ اِنْ لَمْ اَعْدِلْ)۔ (کتاب الجہاد باب و من الدلیل علی ان الخمس لنوائب المسلمین) یعنی آنحضرت ﷺ اموال غنیمت کو جعرانہ کے مقام پر تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کو کہا کہ آپ عدل سے کام لیں۔ آپؐ نے جواب دیا کہ اگر میں نے عدل نہیں کیا تو تُو بڑی بے برکتی اور بدبختی میں مبتلا ہو گیا۔ اللہ اللہ کیسے خطرناک حملہ کا جواب وہ پاک رسولؐ کس نرمی سے دیتا ہے کس حلم سے اسے سمجھاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ سے جو عشق صحابہ کو تھا وہ ایسا نہ تھا کہ وہ ایسی باتیں برداشت کر سکتے۔ بلکہ حضرت عمرؓ اور خالد بن ولیدؓ تو ہمیشہ ایسے مواقع پر تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ مگر آنحضرت ﷺ ان کو ہمیشہ روکتے رہتے تھے کہ ان لوگوں سے اعراض کرو۔ پس ایسے وقت میں جبکہ مکہ کے حدیث العہد مسلمان جو ابھی ان آداب سے بالکل ناواقف تھے جو ایک رسول کے حضور بجالانے ایک مؤمن کا فرض ہوتا ہے اور جو ایک ذرہ سے اشارہ سے صراط مستقیم سے ہٹ کر کہیں کے کہیں پہنچ سکتے تھے آپ کے اردگرد کھڑے تھے اور وہی وقت تھا جب انہوں نے یہ سبق سیکھنا تھا کہ رسول کریم ﷺ کے ساتھ ہمیں کس طرح عمل کرنا چاہئے ایک شخص کا آگے بڑھ کر نہایت بے حیائی سے آپ سے کہنا کہ حضور ذرا عدل مد نظر رکھیں اور بے انصافی اور حق تلفی نہ کریں ایک خطرناک فعل تھا۔ جس سے ایک طرف تو ان قوانین کی خلاف ورزی ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ساتھ کلام کرنے کے متعلق بیان فرمائے ہیں۔ دوسرے ان تمام مواعید پر پانی پھر جاتا تھا جو اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے حضور کئے تھے اور جو ہر ایک مسلمان کو مسلمان ہونے کے لئے کرنے پڑتے ہیں۔ تیسرے سیاسی لحاظ سے آپ کے رعب کو ایک خطرناک نقصان پہنچانے والے تھے۔ اور چوتھے نو مسلموں کے لئے ایک نہایت بد نظیر قائم کرنے والے تھے جن کے دل ابھی اس عزت کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے جو صحابہؓ کے دلوں میں بھری ہوئی تھی۔ پس وہ الفاظ جو ذوالخویصرہ کے منہ سے اس وقت نکلے ایک دنیاوی دربار میں

خطرناک سے خطرناک سزا کا فتویٰ دلانے کے لئے کافی تھے۔ اور اگر زمانہ قدیم کے درباروں میں ایسا انسان قتل کا مستوجب خیال کیا جاتا تو موجودہ دورِ دستوریت میں بھی ایسا آدمی سزا سے محفوظ نہ رہ سکتا لیکن وہ بادشاہ ہر دو جہاں اس کے گستاخانہ کلام کے جواب میں کیا کہتا ہے؟ کیا اسے سزا کا حکم دیتا ہے؟ کہ تا ان نو مسلموں پر آپ کا رعب بیٹھ جائے جو نہایت نگران نگاہوں سے صحابہ اور آنحضرت ﷺ کے تعلقات کو اس لئے دیکھ رہے تھے کہ ان سے اندازہ لگا سکیں کہ یہ تعلقات مصنوعی یا حقیقی، عارضی ہیں یا مستقل، سطحی ہیں یا ان کی جڑیں دل کے تمام کونوں میں مضبوطی سے گڑی ہوئی ہیں کیا وہ میرا پیارا اگر اسے کسی بدنی سزا کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ تو کم سے کم زبانی طور پر ہی اسے سخت تہدید کرتا ہے کہ اگر ایسے الفاظ پھر تمہارے منہ سے نکلے تو تم کو سخت سزا دی جائے گی؟ نہیں وہ بھی نہیں کرتا۔ کیا وہ اسے اپنے سامنے سے دور ہو جانے کا حکم دیتا ہے؟ نہیں! وہ اس سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ پھر اس مجرم کے لئے وہ کیا سزا تجویز کرتا ہے! وہ باوجود صحابہ کی چڑھی ہوئی تیوری کے اور باوجود ان کے ہاتھوں کے بار بار دستہ تلوار کی طرف جانے کے اسے نہایت پر حکمت اور پر معنی جواب دیتا ہے جس سے بہتر جواب کوئی انسانی دماغ تجویز کر ہی نہیں سکتا وہ اسے خود اسی کے فعل سے ملزم کرتا ہے خود اسی کے اقوال سے قائل کرتا ہے خود اسی کے اعمال سے شرمندہ کرتا ہے وہ کہتا ہے تو یہ کہ لَقَدْ شَقِيْتَ اِنْ لَّمْ اَعْدِلْ اگر میں نے عدل نہ کیا تو تُو بدبختی کے گڑھے میں گر گیا۔ کیونکہ تو نے تو مجھے خدا کا رسول سمجھ کر بیعت کی ہے۔ اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں آپ کو خدا کی طرف سے یقین کرتا ہوں اور مجھے اپنا رہنما اور پیشوا قرار دیتا ہے تو ان خیالات کے باوجود اے نادان جب تُو مجھے انصاف سے دور اور عدل سے خالی خیال کرتا ہے تو تجھ سے زیادہ بدبخت اور کون ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے پیچھے لگاتا ہے جو اتباع کے قابل نہیں اور اس آدمی سے ہدایت چاہتا ہے جو خود گمراہ ہے اور اس سے صداقت طلب کرتا ہے جو جھوٹ بولنے میں کوئی عیب نہیں دیکھتا اور اگر تو مجھے نبی نہیں خیال کرتا بلکہ جھوٹا خیال کرتا ہے تو پھر بھی تُو نہایت شقی ہے کیونکہ باوجود مجھے جھوٹا سمجھنے کے پھر میرے ساتھ رہتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ میں آپ کو سچا خیال کرتا ہوں۔

اللہ اللہ کیسا پاک جواب ہے کیسا مسکت اور مبکت جواب ہے جسے سن کر ایک حیادار سوائے اس کے کہ زندہ ہی مر جائے اور کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ یہ تھا آپ کا تحمل یہ تھی آپ کی بردباری جو آپ کو دنیا کے تمام انسانوں سے افضل ثابت کرتی ہے۔ بہت ہیں جو اشتعال انگیز الفاظ کو

سن کر خاموشی سے اپنے حلم کا ثبوت دیتے ہیں لیکن میرے آقا کا تحمل بھی لغو نہ تھا اگر آپ خاموش رہتے تو اس کے اعتراض کا جواب کیا ہوتا آپ نے تحمل کا ایک اعلیٰ نمونہ دکھایا اور ایسا نمونہ جو کہ اپنے اندر ایک عظیم الشان سبق بھی رکھتا تھا اور معترضین کے لئے ہدایت تھا۔ کاش! اس حدیث سے وہ لوگ کچھ نصیحت حاصل کریں جو ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کر کے پھر اعتراضات سے نہیں رکتے کیونکہ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا یہ فعل خود ان کی شقاوت پر دال ہے۔

اب ایک اور مثال درج کرتا ہوں۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّهُ بَيْنَا هُوَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهُ النَّاسُ مُقْبِلاً مِنْ حُنَيْنٍ عَلِقَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاَعْرَابُ يَسْئَالُوْنَهُ حَتّٰى اِضْطَرُّوْهُ اِلٰى سَمُرَةٍ فَخَطِفَتْ رِدَاءَهُ فَوَقَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اَعْطُوْنِىْ رِدَائِىْ فَلَوْ كَانَ عَدَدُ هٰذِهِ الْعِضَاهِ نَعَمًا لَقَسَّمْتُهُ بَيْنَكُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْنِىْ بَخِيْلاً وَلَا كَذُوْبًا وَلَا جَبَانًا۔ (بخاری کتاب الجہاد باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعطی المؤلفۃ قلوبھم) ایک دفعہ وہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ کے ساتھ اور بھی لوگ تھے۔ آپ حنین سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ راستہ میں کچھ بادیہ نشین عرب آ گئے۔ اور آپ کے پیچھے پڑ گئے اور آپ سے سوال کرنے لگے۔ اور آپ پر اس قدر زور ڈالا کہ ہٹاتے ہٹاتے کیکر کے درخت تک لے گئے۔ جس سے آپ کی چادر پھنس گئی۔ پس آپ ٹھہر گئے اور فرمایا کہ میری چادر مجھے پکڑا دو۔ اگر ان کانٹے دار درختوں کے برابر بھی میرے پاس اونٹ ہوتے (یعنی بہت کثرت سے ہوتے) تو بھی میں سب تم میں تقسیم کر دیتا اور تم مجھ کو بخیل اور جھوٹا اور بزدل نہ پاتے اللہ اللہ یہ وہ شخص ہے جسے ناپاک طبع انسان دنیا طلب کہتے ہیں۔ اور طرح طرح کے ناپاک الزام لگاتے ہیں یہ وہ انسان ہے جسے اندھی دنیا مغلوب الغضب کہتی ہے یہ وہ وجود ہے جسے ظالم انسان ظالم قرار دیتے ہیں کیا اس تحمل والا انسان ظالم یا مغلوب الغضب ہو سکتا ہے۔ کیا اس سیر طبیعت کا انسان دنیا طلب ہو سکتا ہے۔ عرب کا فاتح اور حنین کا بہادر اپنے خطرناک دشمن کو شکست دے کر واپس آ رہا ہے۔ ابھی اس کے سپاہیوں کی تلواروں سے خون کا رنگ بھی نہیں چھوٹا زبردست سے زبردست انسان اس کو پیٹھ دکھا چکے ہیں اور اس کی تیز تلوار کے آگے اپنی گردنیں جھکا چکے ہیں۔ اور وہ اپنی فتح مند افواج کے ساتھ میدان جنگ سے واپس آ رہا ہے مگر کس شان سے اس کا حال ابھی پڑھ چکے ہو۔ کچھ عرب آ کر آپ سے سوال کرتے ہیں اور پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں کہ کچھ لئے بغیر نہیں لوٹیں گے آپ بار بار انکار کرتے ہیں

کہ میرے پاس کچھ نہیں مگر وہ باز نہیں آتے۔ پھر اور پھر سوال کرتے ہیں اور باوجود آپ کے انکار کے مصر ہیں کہ ہمیں ضرور کچھ دلوایا جائے مگر آپ باوجود اس شان کے کہ سارے عرب کو آپ کے سامنے گردن جھکا دینی پڑی ان سے کیا سلوک کرتے ہیں ان کے بار بار کے سوال سے ناراض نہیں ہوتے۔ ان پر خفگی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان کو بتاتے ہیں کہ آپ کے پاس اس وقت کچھ نہیں ورنہ ضرور ان کو بھی دیتے۔ لیکن وہ لوگ پھر بھی مصر ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا اس لئے نہیں کہ کل دنیا اس بات سے واقف تھی کہ وہ بہادر انسان جو خطرناک جنگوں میں جس وقت اس کے ساتھی بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں اکیلا دشمن کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایسا متحمل مزاج ہے کہ اپنی حاجتوں کو اس کے پاس جس زور سے بھی پیش کریں گے وہ کبھی ناراض نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا جواب محبت سے بھرا ہوا اور شفقت سے مملوء ہوگا پھر کیا اس لئے نہیں کہ آپ کے اخلاق حسنہ اور آپ کے حسن سلوک کا دنیا میں ایسا شہرہ تھا کہ بادیہ نشین عرب بھی اس بات سے ناواقف نہ تھے کہ ہم جس قدر بھی اصرار کریں گے ہمیں کسی سرزنش کا خطرہ نہ ہوگا۔ ضرور یہی بات تھی جس کی وجہ سے وہ عرب آپ پر اس قدر زور ڈال رہے تھے۔ اور باتوں سے ہی آپ سے کچھ وصول نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ جب ناامیدی ہوگئی تو آپ کو پکڑ کر اصرار کرنا شروع کیا کہ ہمیں ضرور کچھ دیں۔ اور آپ ان سے ہٹتے ہٹتے راستہ سے اس قدر دور ہوگئے کہ آخر آپ کی چادر کانٹے دار درختوں میں جا پھنسی۔ اور اس وقت آپ نے ان کو ان محبت آمیز الفاظ میں ملامت کی کہ میں انکار بخل کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس مجبوری سے کہ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں۔ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو میں ضرور تم کو دے دیتا حتیٰ کہ سامنے کھڑے ہوئے درختوں کے برابر بھی اگر اونٹ میرے پاس ہوتے تو سب تم کو دے دیتا۔ اور ہرگز بخل نہ کرتا نہ جھوٹ بولتا نہ بزدلی دکھاتا۔ دنیا کا کوئی بادشاہ ایسا جواب نہیں دے سکتا وہ جو اپنی عزت اور اپنی بڑائی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ وہ اس قدر تحمل نہیں کر سکتے۔ آنحضرت ﷺ کی حیثیت کے انسان کا ایسے موقعہ پر جب آپ سے ان اعراب نے اس درشتی سے سلوک کیا تھا مذکورہ بالا جواب دینا اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اور دنیا کا کوئی بادشاہ کوئی حاکم کوئی سردار اس تحمل کی نظیر نہیں دکھا سکتا۔ پھر آپ جو جواب دیتے ہیں وہ کیسا لطیف ہے۔ فرماتے ہیں...... کہ اگر ان درختوں کے برابر بھی اونٹ ہوتے تو میں تمہیں دے دیتا۔ اور تم مجھے بخیل جھوٹا اور بزدل نہ پاتے۔ ایک موٹی نظر والے انسان کو تو شاید یہ تین الفاظ بے ربط معلوم ہوں لیکن دانا انسان سمجھتا ہے کہ یہ تینوں الفاظ جو آپ نے فرمائے بالکل موقعہ کے مطابق تھے۔ اور ان سے بہتر لفظ اور ہو ہی نہیں

سکتے تھے۔ کیونکہ مال کا نہ دینا بخل سے متعلق ہے۔ پس آپ نے فرمایا کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو تم مجھے بخیل نہ پاتے یعنی تمہیں معلوم ہو جاتا کہ میں بخیل نہیں کیونکہ میں تمہیں مال دے دیتا اور جھوٹا بھی نہ پاتے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ بعض لوگ جھوٹ بول کر سائل سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ ہے نہیں۔ پس فرمایا کہ تمہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ میں بخیل نہیں ہوں اور یہ بھی کہ جھوٹا نہیں ہوں کہ جھوٹ بول کر سب مال یا اس کا بعض حصہ اپنے لئے بچالوں اور نہ مجھے بزدل پاتے۔ یعنی میرا تمہیں مال دینا اس وجہ سے نہ ہوتا کہ میں تم لوگوں سے ڈر جاتا کہ کہیں مجھے نقصان نہ پہنچاؤ۔ لیکن میں جو مال دیتا دل کی خوشی سے دیتا۔

شاید کوئی شخص کہے کہ آپ کے اتنا کہہ دینے سے کیا بنتا ہے کہ اگر میرے پاس ہوتا تو میں دے دیتا کیا معلوم ہے کہ آپ اس وقت دیتے یا نہ دیتے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد۔ میں اس جگہ یہ بتا رہا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کا تحمل کیسا تھا اور کس طرح آپ ناپسند اور مکروہ باتیں سن کر نرمی اور ملائمت سے جواب دیتے تھے۔ اور خفگی اور ناراضگی کا اظہار قطعاً نہ فرماتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا معترض کو کوئی نیک بات بتا کر خاموش فرما دیتے۔ آپ کی سخاوت کا ذکر تو دوسری جگہ ہو گا۔ اور اگر کوئی بہت مصر ہو تو میں آپ کے تحمل کی ایسی مثال بھی جس میں ایک طرف آپ نے تحمل فرمایا ہے اور دوسری طرف سخاوت کا اظہار فرمایا ہے دے سکتا ہوں اور وہ بھی صحیح بخاری سے ہے۔ اور وہ یہ کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ کُنْتُ اَمْشِیْ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ بُرْدٌ نَجْرَانِیٌّ غَلِیْظُ الْحَاشِیَۃِ فَاَدْرَکَہٗ اَعْرَابِیٌّ فَجَذَبَہٗ جَذْبَۃً شَدِیْدَۃً حَتّٰی نَظَرْتُ اِلٰی صَفْحَۃِ عَاتِقِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ اَثَّرَتْ بِہٖ حَاشِیَۃُ الرِّدَاءِ مِنْ شِدَّۃِ جَذْبَتِہٖ ثُمَّ قَالَ: مُرْلِیْ مِنْ مَالِ اللّٰہِ الَّذِیْ عِنْدَکَ " فَالْتَفَتَ اِلَیْہِ فَضَحِکَ ثُمَّ اَمَرَلَہٗ بِعَطَاءٍ۔ (بخاری کتاب الجہاد باب ما کان النبیؐ یعطی المؤلفۃ قلوبھم)

یعنی میں ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا اور آپ نے ایک نجران کی بنی ہوئی چادر اوڑھی ہوئی تھی جس کے کنارے بہت موٹے تھے کہ اتنے میں ایک اعرابی آپ کے قریب آیا اور آپ کو بڑی سختی سے کھینچنے لگا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ اس کے سختی سے کھینچنے کی وجہ سے چادر کی رگڑ کے ساتھ آپ کی گردن پر خراش ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ آپ کے پاس جو مال ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی دلوائیں پس آپ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے اور فرمایا کہ اسے کچھ دے دو۔

اس مثال سے آپ کا تحمل پہلی مثال سے بھی زیادہ ظاہر ہوتا ہے پہلی مثال سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ آپ کے پاس کچھ تھا نہیں اور کچھ سائل آپ سے بار بار انعام طلب کرتے تھے اور جبکہ آپ انکار فرما رہے تھے کہ میرے پاس کچھ نہیں اور وہ لینے پر مصر تھے۔ان لوگوں کا آپ پر زور کرنا سمجھ میں آسکتا ہے اور خیال ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہ لوگ سخت محتاج تھے اور ان کی حالت زار تھی۔اور نا امیدی میں انسان کے حواس ٹھکانے نہیں رہتے اس لئے ان کی زیادتی پر آپ جیسے رحیم انسان کا تحمل کرنا کچھ تعجبات سے نہ تھا لیکن دوسرا واقعہ اس واقعہ سے بہت زیادہ آپ کے تحمل پر روشنی ڈالتا ہے کیونکہ اس شخص نے بغیر سوال کے آپ پر حملہ کر دیا اور اس حملہ کی کوئی وجہ نہ تھی نہ اس نے سوال کیا تھا نہ آپ نے انکار فرمایا تھا نہ اسے کوئی ناامیدی پیش آئی تھی۔مال سامنے موجود تھا آپ دینے کو تیار تھے پھر بلاوجہ اس طرح گستاخی سے پیش آنا ایک نہایت ہی ناشائستہ حرکت تھی اور اس کے سوال پر اسے ڈانٹنا چاہئے تھا۔اور پھر اس نے جو طریق اختیار کیا تھا وہ صرف گستاخانہ ہی نہ تھا کہ یہ خیال کر لیا جاتا کہ چلو اس سے کوئی حقیقی نقصان تو ہؤا نہیں جاہل آدمی ہے اور جنگلی ہے اور آداب رسول سے ناواقف ہے۔اسے معاف ہی کر دینا بہتر ہو گا بلکہ وہ ایذاء رسانی کا طریق تھا اور اس کی اس حرکت سے آنحضرت ﷺ کو سخت تکلیف بھی پہنچی اور گردن مبارک پر خراش بھی ہو گئی بلکہ اس حدیث کو حمام نے اس طرح روایت کیا ہے کہ چادر پھٹ گئی اور اس کا حاشیہ چمڑہ کو پھاڑتا ہؤا گوشت تک گھس گیا پس وہ شخص اس بات کا پورے طور پر مستحق تھا کہ اسے آپ سختی سے علیحدہ کر دیتے۔لیکن باوجود ان تمام باتوں کے آپ اس سے یہ سلوک فرماتے ہیں کہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ اسے بھی ضرور کچھ دے دو۔گویا مسکرا کر اسے بتاتے ہیں کہ میں تمہارے جیسے نادانوں کو جو آداب رسول سے ناواقف ہیں بجائے ڈانٹنے کے قابل رحم خیال کرتا ہوں اور بجائے ناراضگی کے تمہاری حالت پر مسکراتا ہوں کہ تم میرے تحمل سے ہی فائدہ اٹھاؤ۔

کہنے کو سب لوگ تحمل والے بن جاتے ہیں لیکن عمل ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان کی حقیقت کھلتی ہے اور اس کے دعاوی کے صدق اور کذب کا حال معلوم ہوتا ہے دنیا میں بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں جو عدل و انصاف کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں جو تحمل مزاج مشہور ہیں اور جن کے تحمل اور بردباری کے افسانوں سے تاریخوں کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایسے بھی ہیں جو مذہبی عزت کے لحاظ سے بھی اپنے زمانہ کے لوگوں میں ممتاز تھے۔اور جو بعد میں

بھی اپنے ہم مذہبوں کے لئے اسوہ حسنہ قرار دیئے گئے ہیں ایسے بادشاہ بھی گذرے ہیں جو بادشاہت کے علاوہ مذاہب کے بانی اور پیشوا بھی ہوئے ہیں اور خاص سلسلوں کے جاری کرنے والے ہیں جن کے مرنے کے ساتھ ان کی بادشاہت کا تو خاتمہ ہو گیا لیکن ان کی روحانی بادشاہت مدت ہائے دراز تک قائم رہی بلکہ اب تک بھی مختلف حکومتوں کے ماتحت رہنے والے لوگ در حقیقت اپنے دل اور اپنی روح کے لحاظ سے انہیں کے ماتحت ہیں جو نیکی اور تقویٰ میں بے نظیر خیال کئے جاتے ہیں جو اخلاق میں آنے والی نسلوں کے لئے ایک نمونہ خیال کئے جاتے ہیں مگر کوئی ہے جو تمام دنیا کی تاریخوں کی ورق گردانی کرنے کے بعد تمام اقوام کے بادشاہوں اور پیشواؤں کے حالات کی چھان بین کرنے کے بعد ان اخلاق کا انسان دکھا سکے اور اس تحمل کی نظیر کسی اور انسان میں بتا سکے جو آنحضرت ﷺ نے دکھایا میں یہ نہیں کہتا کہ آنحضرت ؐ کے سوا کوئی شخص تحمل کی صفت سے متصف ہؤا ہی نہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اس درجہ تک تحمل کا اظہار کرنے والا جس درجہ تک آپ نے ظاہر فرمایا کوئی انسان نہیں ہؤا اور نہ آئندہ ہو گا کیونکہ آپ کمال کی اس سرحد تک پہنچ گئے ہیں کہ اس کے بعد کوئی ترقی نہیں۔

ممکن ہے کہ کوئی صاحب کہیں کہ آپ بادشاہوں اور حاکموں کی کیوں شرط لگاتے ہیں اس مقابلہ کے میدان کو اور بھی کیوں وسیع نہیں کر دیتے کہ دنیا کے کل افراد کے تحمل کو سامنے رکھ کر مقابلہ کر لیا جائے کہ آیا کوئی انسان اس صفت میں آپ کی برابری کر سکتا ہے یا نہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ تحمل اسی انسان کا قابل قدر ہے جسے طاقت اور قدرت ہو جو شخص خود دوسروں کا محتاج ہو دوسروں سے خائف ہو اپنے دشمنوں کے خوف سے چھپتا پھرتا ہو اسے دنیا میں سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی ہو اس کا تحمل بھی کوئی تحمل ہے اس کی زبان تو اس پر ظلم کرنے والوں نے بند کر دی ہے اور اس میں یہ طاقت ہی نہیں کہ ان کے حملوں کا جواب دے سکے پس جو حاکم نہیں یا بادشاہ نہیں یا دنیاوی لحاظ سے کوئی خاص عزت نہیں رکھتا اس کا تحمل کوئی تحمل نہیں بلکہ بہت دفعہ ایک مغلوب الغضب انسان بھی اپنے ایذاء دہندوں کے خوف سے اپنے غضب کو دبا لیتا ہے۔ اور گو دل ہی دل میں جلتا اور کڑھتا ہے اور جی ہی جی میں گالیاں دیتا اور کوستا ہے لیکن اظہار غضب کی طاقت نہیں رکھتا کیونکہ جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ میرے حق میں اور بھی مضر ہو گا پس آنحضرت ؐ کے مقابلہ میں اس شخص کے تحمل کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو آپ ہی کی طرح بااختیار اور طاقت رکھتا ہو اور پھر آپ ہی کی طرح تحمل دکھانے والا ہو ورنہ مثل مشہور ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے ایسا

زبردست جو کسی زبردست کے پنجہ ستم میں گرفتار ہو اس نے قابل عتاب گفتگو سن کر یا زبردست سلوک دیکھ کر اظہار ناراضگی کرنا ہی کیا ہے؟ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ طریق تو انصاف پر مبنی تھا۔ اور عقلاً' اخلاقاً ہمارا حق تھا کہ ہم مذکورہ بالا شرط سے مشروط مقابلہ کا مطالبہ کریں لیکن اگر کوئی شخص دنیا کے تمام انسانوں میں بھی آپ جیسے باکمال انسان کو پیش کر سکے تو ہم اس کے معاملہ پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ بے حیائی کا نام تحمل نہ رکھ لیا جاوے۔

اب ایک سوال اور باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض لوگ پیدائشی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو غصہ آتا ہی نہیں بلکہ جو معاملہ بھی ان سے کیا جائے وہ تحمل ہی تحمل کرتے ہیں اور غضب کا اظہار کبھی نہیں کرتے۔ اور اس کی یہ وجہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جوش کو دبا لیتے ہیں یا تحمل سے کام لیتے ہیں بلکہ درحقیقت ان کے دل میں جوش پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اور انہیں کسی بات کی حقیقت کے سمجھنے کا احساس ہی نہیں ہوتا اور یہ لوگ ہرگز کسی تعریف کے مستحق نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کا تحمل صرف ظاہری ہے۔ اس میں حقیقت کچھ نہیں ایک شکل ہے جس کی اصلیت کوئی نہیں۔ ایک جسم ہے جس میں روح کوئی نہیں۔ ایک قشر ہے جس میں مغز کوئی نہیں۔ اور ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی ٹنڈے شخص کو کوئی دوسرا شخص مارے۔ اور چونکہ اس کے ہاتھ نہیں ہیں وہ مار کھا کر صبر کر چھوڑے۔ اور جس طرح یہ ٹنڈا قطعاً اس تعریف کا مستحق نہیں ہے کہ اسے تو زید یا بکر نے مار امگر اس نے آگے سے ایک طمانچہ بھی نہ لگایا کیونکہ اس میں طمانچہ لگانے کی طاقت ہی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے ہاتھ نہ تھے۔ اس لئے مجبور تھا کہ مار کھاتا اور اپنی حالت پر افسوس کرتا۔ اسی طرح وہ شخص بھی ہرگز کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ جس کے دل میں جوش اور حس ہی نہیں۔ اور وہ بری بھلی بات میں تمیز ہی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کا تحمل خوبی نہیں بلکہ اس کا باعث فقدان شعور ہے۔ پس ایک معترض کا حق ہے کہ وہ یہ سوال کرے کہ کیوں آنحضرت ﷺ کو بھی ایسا ہی نہ خیال کر لیا جائے۔ خصوصاً جبکہ اس قدر طاقت اور قدرت اور ایسے ایسے جوش دلانے والے مواقع پیدا ہو جانے کے باوجود آپ اس طرح ہنس کر بات ٹال دیتے تھے اور کیوں نہ خیال کر لیا جائے کہ آپ بھی پیدائشاً ایسے ہی نرم مزاج پیدا ہوئے تھے۔ اور فطرتاً آپ مجبور تھے کہ ایسے ایذاء دہندوں کے اعمال پر ہنس کر ہی خاموش ہو رہتے کیونکہ آپ کے اندر انتقام کا مادہ اور بری اور بھلی بات میں تمیز کی صفت موجود ہی نہ تھی۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

یہ سوال بالکل درست اور بجا ہے۔ اور ایک محقق کا حق ہے کہ وہ ہم سے اس کی وجہ دریافت

کرے کہ کیوں ہم آپ کو ایک خاص گروہ میں شامل کرتے ہیں اور دوسرے سے نکالتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کا بھی جواب دیں کیونکہ اس سوال کا جواب دیئے بغیر آنحضرت ﷺ کی سیرت کا ایک پہلو نامکمل رہ جاتا ہے۔ اور آپ جیسے مکمل انسان کی زندگی کا کوئی پہلو نہیں جو نامکمل ہو پس اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گواہی پیش کرتے ہیں جو آپ کی ازدواج مطہرات سے تھیں۔ اور آپ کے اخلاق کی کماحقہ واقف تھیں۔ صحیح بخاری میں آپ سے روایت ہے کہ مَا خُیِّرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَ اَمْرَیْنِ اِلَّا اَخَذَ اَیْسَرَھُمَا مَا لَمْ یَکُنْ اِثْمًا، فَاِنْ کَانَ اِثْمًا کَانَ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنْہُ، وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِہٖ اِلَّا اَنْ تُنْتَھَکَ حُرْمَۃُ اللّٰہِ، فَیَنْتَقِمُ لِلّٰہِ بِھَا۔ (بخاری کتاب المناقب باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی آنحضرت ﷺ کو جب کبھی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تھا تو آپ دونوں میں سے آسان کو اختیار کر لیتے تھے جب تک کہ گناہ نہ ہو۔ اور جب کوئی گناہ کا کام ہوتا تو آپ اس سے سب لوگوں سے زیادہ دور بھاگتے۔ اور آپ کبھی اپنے نفس کے لئے انتقام نہ لیتے تھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حرمتوں میں سے کسی کی بے حرمتی کی جاتی تھی تو آپ خدا کے لئے اس بے حرمتی کا بدلہ لیتے تھے۔

اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو کاموں کا اختیار دیا جاتا کہ آپ جو چاہیں کریں تو آپ ان دونوں میں سے آسان کو اختیار کرتے (کیونکہ بندہ کا یہی حق ہے کہ اپنے آپ کو ہمیشہ زائد بوجھوں سے بچائے تا ایسا نہ ہو کہ اپنے آپ کو کسی مصیبت میں گرفتار کر دے) لیکن اگر کبھی آپ دیکھتے کہ ایک آسان بات کو اختیار کر کے کسی وجہ سے کسی گناہ کا قرب ہو جائے گا۔ تو پھر آپ کبھی اس آسان کو اختیار نہ کرتے بلکہ مشکل سے مشکل امر کو اختیار کر لیتے مگر اس آسان کے قریب نہ جاتے (اور یہی اللہ تعالیٰ کے پیاروں کا کام ہے کہ وہ گناہ سے بہت دور بھاگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے میں کسی سختی یا کسی مشکل کے برداشت کرنے سے نہیں گھبراتے) پھر فرماتی ہیں کہ آپ کی یہ بھی عادت تھی کہ آپ اپنے نفس کے لئے کبھی انتقام نہ لیتے یعنی خلاف منشا امور کو دیکھ کر جب تک وہ خاص آپ کی ذات کے متعلق ہوتے تحمل سے ہی کام لیتے۔ خفگی، ناراضگی یا غضب کا اظہار نہ فرماتے نہ سزا دینے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ ہاں جب آپ کی ذات کے متعلق کوئی امر نہ ہو بلکہ اس کا اثر دین پر پڑتا ہو اور کسی دینی مسئلہ کی ہتک ہوتی ہو اور اللہ تعالیٰ کی شان پر کوئی دھبہ لگتا ہو۔ تو آپ اس وقت تک صبر نہ

کرتے۔ جب تک اس کا انتقام لے کر اللہ تعالیٰ کے جلال کو ظاہر نہ فرما لیتے اور شریر انسان کو جو ہتکِ حرمۃ اللہ کا مرتکب ہؤا ہو سزا نہ دے لیتے۔

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کا تحمل اس درجہ تک پہنچا ہؤا تھا کہ آپ کبھی بھی اپنے نفس کے لئے جوش کا اظہار نہ فرماتے بلکہ تحمل اور بردباری سے ہی ہمیشہ کام لیتے۔ لیکن یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات قطعاً درست نہیں کہ آپ میں جوش و انتقام کی صفت پائی ہی نہ جاتی تھی اور آپ پیدائش سے ہی ایسے نرم مزاج واقعہ ہوئے تھے کہ غضب آپ میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا بلکہ جب اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حرمتوں کی ہتک اور بے حرمتی کا سوال پیدا ہوتا تو آپ ضرور انتقام لیتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا تحمل کسی پیدائشی کمزوری یا نقص کا نتیجہ نہ تھا بلکہ آپ اپنے اخلاق کی وجہ سے اپنے نفس کے قصورداروں سے چشم پوشی کر جاتے تھے۔ اور اظہار ناراضگی سے اجتناب کرتے تھے۔ اور جو کچھ کہنا بھی ہوتا تھا تو نہایت آہستگی اور نرمی سے کہتے تھے اور ایسا جواب دیتے تھے جس میں بجائے ناراضگی اور غضب کے اظہار کے اس شخص کے لئے کوئی مفید سبق ہو جس سے وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے چال چلن کی اصلاح کر سکے۔ اور یہی تحمّل کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت عائشہؓ کی یہ شہادت بلا دلیل نہیں ہے بلکہ واقعات بھی اس کی شہادت دیتے ہیں چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے ظاہر ہے جسے مفصّل ہم پہلے کسی اور جگہ لکھ آئے ہیں کہ جنگ احد میں جب عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ آنحضرت ﷺ شہید ہو گئے ہیں اور کفار مکہ علی الاعلان اپنی اس کامیابی پر فخر کرنے لگے اور ان کے سردار نے بڑے زور سے پکار کر کہا کہ کیا تم میں محمد (ﷺ) ہے جس سے اس کی مراد یہ بتاتا تھا کہ ہم آپ کو مار چکے ہیں اور آپ دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں مگر آنحضرت ﷺ نے اپنے اصحاب کو فرمایا کوئی جواب نہ دیں۔ اور اس طرح اس کا جھوٹا فخر پورا ہونے دیا۔ اور یہ نہیں کہا کہ غضب میں آ کر اسے کہتے کہ میں تو زندہ موجود ہوں یہ بات کہ تم نے مجھے قتل کر دیا ہے بالکل جھوٹ اور باطل ہے اور اس میں کوئی صداقت نہیں۔ ہاں جب ابو سفیان نے یہ کہا کہ اُعْلُ ھُبَلْ اُعْلُ ھُبَلْ۔ ھُبل بت کی شان بلند ہو۔ ھُبل بت کی شان بلند ہو تو اس وقت آپ خاموش نہ رہ سکے اور صحابہ کو فرمایا کہ کیوں جواب نہیں دیتے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا جواب دیں۔ فرمایا اسے کہو کہ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلُّ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلُّ یعنی تمہارے ھُبل میں کیا طاقت ہے وہ تو ایک بناوٹی چیز ہے اللہ ہی ہے جو سب چیزوں سے بلند

رتبہ اور عظیم القدر ہے۔ اور پھر جب اس نے کہا کہ لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ تو آپ نے پھر صحابہؓ سے فرمایا کہ جواب دو۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا جواب دیں تو آپ نے فرمایا کہ کہو لَنَا مَوْلٰی وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ خدا تعالیٰ ہمارا دوست و مددگار ہے۔ اور تمہارا مددگار کوئی نہیں یعنی عزیٰ میں کچھ طاقت نہیں طاقت تو اللہ تعالیٰ میں ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اس واقعہ سے صاف کھل جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق جو گواہی دی ہے وہ صرف ان کا خیال ہی نہیں بلکہ واقعات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں اور تاریخی ثبوت اس کی سچائی کی شہادت دیتے ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ کی زندگی پر غور کرنے سے ایک موٹی سے موٹی عقل کا انسان بھی اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ آپ کا تحمل کسی صفت حسنہ کے فقدان کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کا باعث آپ کے وہ اعلیٰ اخلاق تھے جن کی نظیر دنیا میں کسی زمانہ کے لوگوں میں بھی نہیں ملتی۔ اور یہ کہ گویا تحمل اپنے کمال کے درجہ کو پہنچا ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حرمات کا سوال جب درمیان میں آجاتا تو اس وقت آنحضرت ﷺ ہرگز درگذر سے کام نہ لیتے۔ بلکہ جس قدر جلد ممکن ہوتا مناسب تدارک فرما دیتے اور اللہ تعالیٰ کے جلال کے قائم کرنے میں ہرگز دیر نہ فرماتے۔ پس آپ کا تحمل ایک طرف تو بے نظیر تھا اور دوسری طرف بالا رادہ تھا اور پھر آپ کی اس صفت کا اظہار کبھی بے موقعہ نہیں ہوتا تھا جیسا کہ آج کل کے زمانہ کا حال ہے کہ اپنے نفس کے معاملہ میں تو لوگ ذرا ذرا سی بات میں جوش میں آجاتے ہیں۔ لیکن جب خدا اور اس کے دین کا معاملہ آتا ہے تو صبر و تحمل کی تعلیم و تلقین کرتے ہوئے ان کے ہونٹ خشک ہوئے جاتے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتے کہ تحمل صرف ذاتی تکلیف اور دکھ کے وقت ہوتا ہے ورنہ دین کے معاملہ میں بناوٹی صلح اور جھوٹا ملاپ ایک بے غیرتی ہے اور کمی ایمان اور حرص دنیاوی کا ثبوت ہے۔

طہارۃ النفس۔ صبر

صبر عربی زبان میں روکنے کو کہتے ہیں اور استعمال میں یہ لفظ تین معنوں میں آتا ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو اچھی باتوں پر قائم رکھنا۔ بُری باتوں سے اپنے آپ کو روکنا اور مصیبت اور دکھ کے وقت جزع وفزع سے پرہیز کرنا اور تکلیف کے ایسے اظہار سے جس میں گھبراہٹ اور نا امیدی پائی جائے اجتناب کرنا۔ اُردو زبان میں یا دوسری زبانوں میں یہ لفظ ایسا وسیع نہیں ہے بلکہ اسے ایک خاص محدود معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور صرف تیسرے اور آخری معنوں کیلئے اس لفظ کو مخصوص کر دیا گیا ہے یعنی مصیبت اور رنج میں اپنے نفس کو جزع وفزع اور نا امیدی اور کرب کے اظہار سے روک دینے کے معنوں میں۔ چونکہ اُردو میں اس کا استعمال انہیں معنوں میں ہے اس لئے ہم نے بھی اس لفظ کو اسی

معنی میں استعمال کیا ہے اور اس ہیڈنگ کے نیچے ہماری غرض آنحضرت ﷺ کی ایسی صفت پر روشنی ڈالنا ہے جس معنی میں کہ یہ لفظ اُردو میں استعمال ہوتا ہے اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی صفت ہے اور دنیا کی تمام اقوام فطرتاً اس صفت کی خوبی کی قائل ہیں گو بدقسمتی سے ہندوستان اس کے خلاف نظر آتا ہے کہ مردوں پر سالہا سال تک ماتم کیا جاتا ہے اور ایسی بے صبری کی حرکات کی جاتی ہیں اور کرب کی علامات ظاہر کی جاتی ہیں کہ دیکھنے والوں کو بھی تعجب آتا ہے۔ غرضیکہ فطرتاً کل اقوام عالم نے صبر کو نہایت اعلیٰ صفت تسلیم کیا ہے اور ہر قوم میں صابر نہایت قابل قدر خیال کیا جاتا ہے چونکہ آنحضرت ﷺ کی نسبت ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ تمام صفات حسنہ کا مجموعہ تھے۔ اور آپ سے بڑھ کر دنیا کا کوئی انسان نیک اخلاق کا اعلیٰ اور قابل تقلید نمونہ نہیں تھا اس لئے ذیل میں ہم صبر کے متعلق آپ کی زندگی کا ایک واقعہ بتاتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ اس صفت سے کہاں تک متصف تھے۔ بچپن میں اوّل والدہ اور پھر دادا کے فوت ہو جانے سے (والد پیدائش سے بھی پہلے فوت ہو چکے تھے) جو صدمات آپ کو پہنچے تھے۔ ان میں آپ نے جس صبر کا اظہار کیا اور پھر دعویٰ نبوت کے بعد جو تکالیف کفار سے آپ کو پہنچیں اس کو جس صبر و استقلال سے آپ نے برداشت کیا اور یکے بعد دیگرے انہی مصائب کے زمانہ میں آپ کے نہایت مہربان چچا اور وفاداری میں بے نظیر بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات اور اپنے پیارے متبعین کی مکہ سے ہجرت کر جانے پر جس صبر کا نمونہ آپ نے دکھایا تھا وہ ایک ایسا وسیع مضمون ہے کہ قلت گنجائش ہم کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ان مضامین کو یہاں شروع کریں اس لئے ہم صرف ایک چھوٹے سے واقعہ کے بیان کرنے پر جو بخاری شریف میں مذکور ہے کفایت کرتے ہیں۔

جیسا کہ سیرۃ النبی کے ابتدا سے مطالعہ کرنے والے اصحاب نے دیکھا ہوگا میں نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ اس سیرۃ میں صرف واقعات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی برتری دکھائی ہے۔ اور آپ کی تعلیم کو کبھی بھی پیش نہیں کیا تا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ دے کہ ممکن ہے آپ لوگوں کو تو یہ کہتے ہوں اور خود نہ کرتے ہوں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ پس اس جگہ بھی میں آپ کی اس تعلیم کو پیش نہیں کرتا جو آپ نے صبر کی نسبت اپنے اتباع کو دی ہے اور جس میں کرب و گھبراہٹ اور نا امیدی کے اظہار سے منع کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر رضا کا حکم دیا ہے بلکہ صرف آپ کا عمل پیش کرتا ہوں۔

عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ اَرْسَلَتِ ابْنَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ إِنَّ ابْنًا لَهَا قُبِضَ فَأْتِنَا فَأَرْسَلَ يُقْرِئُ السَّلَامَ وَيَقُوْلُ إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطٰى وَكُلٌّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ فَأَرْسَلَتْ إِلَيْهِ تُقْسِمُ عَلَيْهِ لَيَأْتِيَنَّهَا فَقَامَ وَمَعَهُ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ وَمُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَأُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَرِجَالٌ فَرُفِعَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّبِيُّ وَنَفْسُهُ تَتَقَعْقَعُ كَأَنَّهَا شَنٌّ فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ فَقَالَ سَعْدٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذَا قَالَ هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ وَإِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ۔

(بخاری کتاب الجنائز باب قول النبی یعذّب المیّت ببعض بکاء اھلہٖ علیہ)

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیٹی نے آپ کو کہلا بھیجا کہ میرا ایک بچہ فوت ہو گیا ہے آپ تشریف لائیں۔ (فوت ہو گیا سے یہ مراد تھا کہ نزع کی حالت میں ہے کیونکہ وہ اس وقت دم توڑ رہا تھا) پس آپ نے جواب اس طرح کہلا بھیجا کہ پہلے میری طرف سے السلام علیکم کہنا اور پھر کہنا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ لے لے وہ بھی اسی کا ہے اور جو دیوے وہ بھی اسی کا ہے اور ہر چیز کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک مقررہ مدت ہے پس چاہئے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید وار رہو۔ اس پر آپ نے (حضرت کی صاحبزادی نے) پھر کہلا بھیجا کہ آپ کو خدا کی قسم آپ ضرور میرے پاس تشریف لائیں پس آپ کھڑے ہو گئے اور آپ کے ساتھ سعد بن عبادہ اور معاذ بن جبل اور ابی بن کعب اور زید بن ثابت اور کچھ اور لوگ تھے جب آپ وہاں پہنچے تو آپ کے پاس وہ بچہ پیش کیا گیا اور اس کی جان سخت اضطراب میں تھی اور اس طرح ہلتا تھا جیسے مشک۔ اس کی تکلیف کو دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے جس پر سعد بن عبادہ نے کہا یا رسول اللہ یہ کیا؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا کیا ہے اور سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رحیم بندوں پر ہی رحم کرتا ہے۔

یہ واقعہ اپنے اندر جو ہدایتیں رکھتا ہے وہ تو اس کے پڑھتے ہی ظاہر ہو گئی ہونگی مگر پھر بھی مزید تشریح کے لئے میں بتا دیتا ہوں کہ اس واقعہ نے آپ کی صفت صبر کے دو پہلوؤں پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ جس کے بعد آپ کے اسوہ حسنہ ہونے میں کوئی شک و شبہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اوّل تو آپ کا اخلاص باللہ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جس وقت آپ کو اطلاع دی گئی کہ آپ کا نواسہ نزع کی حالت میں ہے اور اس کی حالت ایسی بگڑ گئی ہے کہ اب اس کی موت یقینی ہو گئی ہے تو آپ نے کیا پُر حکمت جواب دیا ہے کہ جو خدا تعالیٰ لے لے وہ بھی اس کا مال ہے اور جو دے دے وہ بھی

اس کا مال ہے۔ رضا بالقضا کا یہ نمونہ کیسا پاک کیسا اعلیٰ کیسا لطیف ہے کہ جس قدر اس پر غور کیا جائے اس قدر کمال ظاہر ہوتا ہے پھر اپنی صاحبزادی کو نصیحت کرنا کہ صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھو اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور احسانوں پر انتہائی درجہ کے یقین اور امید پر دلالت کرتا ہے مگر صرف یہی بات نہیں بلکہ اس واقعہ سے ایک اور بات بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ آپ کا صبر اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ کا دل نَعُوْذُ بِاللّٰہِ سخت تھا بلکہ صبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احسانوں پر امید اور اس کی مالکیت پر ایمان تھا کیونکہ جیسا بیان ہو چکا ہے جب آپ اپنی صاحبزادی کے گھر پر تشریف لے گئے تو آپ کی گود میں تڑپتا ہوا بچہ رکھ دیا گیا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سعد بن عبادہ نے غلطی سے اعتراض کیا کہ یا رسول اللہ یہ صبر کیسا ہے کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ آپ نے کیا لطیف جواب دیا کہ رحم اور چیز ہے اور صبر اور شے ہے۔ رحم چاہتا ہے کہ اس بچہ کو تکلیف میں دیکھ کر ہمارا دل بھی دُکھے اور دل کے درد کا اظہار آنکھوں کے آنسوؤں سے ہوتا ہے۔ اور صبر یہ ہے کہ ہم اس بات پر راضی ہو جائیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا سے قبول کریں اور اس پر کرب و اضطرار کا اظہار نہ کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کا رحم جذب کرنے کیلئے تو رحم کی سخت ضرورت ہے پہلے انسان اللہ تعالیٰ کے بندوں کے دکھوں میں رحم اور شفقت کی عادت ڈالے تو پھر اس بات کا امیدوار ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس کی تکالیف میں اس پر رحم کرے۔ غرضیکہ ایک طرف اپنے نواسہ کی وفات کا حال سن کر جو آپ کے بڑھاپے کی عمر کا ثمرہ تھا اور خصوصاً جب کہ آپ کے کوئی نرینہ اولاد موجود نہ تھی، صبر کرنا اور اپنی لڑکی کو صبر کی تلقین کرنا اور دوسری طرف اس بچہ کو دکھ میں دیکھ کر آپ کے آنسوؤں کا جاری ہو جانا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی ہر ایک قضاء پر صابر تھے اور یہ کہ آپ کا صبر سخت دلی (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) کا موجب نہ تھا بلکہ آپ کا دل رحم و شفقت سے پُر تھا۔

طہارۃ النفس۔ استقلال

قابل اور نا قابل انسان کی پرکھ میں استقلال بہت مدد دیتا ہے کیونکہ استقلال سے انسان کے بہت سے پوشیدہ در پوشیدہ اخلاق اور قوتوں کا پتہ لگ جاتا ہے اور مستقل اور غیر مستقل انسان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو بیسیوں نیک اخلاق کا جامع ہو۔ لیکن اس کے اندر استقلال نہ ہو اس کے اخلاق حسنہ نہ تو اس کے نفس کی خوبی کو ثابت کر سکتے ہیں اور نہ ہی لوگوں کو ان سے کوئی معتد بہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس میں استقلال نہیں اور وہ اپنے کاموں میں دوام اختیار نہیں کرتا تو اوّل تو یہی خیال ہو سکتا ہے کہ اس کے نیک اخلاق ممکن ہے کہ بناوٹ کا نتیجہ ہوں۔ اور دوسرے

ایک نیک کام کو شروع کر کے جب وہ درمیان میں ہی چھوڑ دے گا تو اس کا کوئی خاص فائدہ بنی نوع انسان کو نہ پہنچے گا- بلکہ خود اس شخص کا وہ وقت جو اسنے اس ادھورے کام پر خرچ کیا تھا ضائع سمجھا جائے گا- پس استقلال ایک طرف تو اپنے صاحب کے کاموں کی سنجیدگی اور حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے اور دوسری طرف اس ایک صفت کی وجہ سے انسان کے دوسرے اخلاقِ حسنہ اور قوائے مفیدہ کے ظہور اور نفع میں بھی خاص ترقی ہوتی ہے اس لئے اس مختصر سیرت میں میں آنحضرت ﷺ کے استقلال پر بھی کچھ لکھنا چاہتا ہوں-

یوں تو اگر غور کیا جائے تو جو کچھ میں اب تک لکھ چکا ہوں اس کا ہر ایک باب بلکہ ہر ایک ہیڈنگ آنحضرت ﷺ کے استقلال کا شاہد ہے اور کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں- مگر سیرت کی تکمیل چاہتی ہے کہ اس کے لئے الگ ہیڈنگ بھی ضرور قائم کیا جاوے-

آنحضرت ﷺ کی زندگی پر اگر ہم اجماعی نظر ڈالیں تو ہمیں رسول کریم ﷺ استقلال کی ایک مجسم تصویر نظر آتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ استقلال کو بھی اس نمونہ استقلال پر فخر ہے- جو رسول کریم ﷺ نے دکھایا تھا-

اس حالت کو دیکھو جس میں آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں- اور پھر اس استقلال کو دیکھو جس سے اس کام کو نباہتے ہیں- آپ کی حالت نہ تو ایسی امیرانہ تھی کہ دنیا کی بالکل احتیاج ہی نہ تھی- اور گویا آپ دنیا کی فکروں سے ایسے آزاد تھے کہ اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ ہی آپ ایسے فقیر اور محتاج تھے کہ آرام و آسائش کی زندگی کبھی بسر ہی نہ کی تھی اس لئے دنیا کا چھوڑنا آپ پر کچھ شاق نہ تھا مگر پھر بھی اس اوسط حالت کے باوجود جس میں آپ تھے اور جو عام طور پر بنی نوع انسان کو دنیا میں مشغول رکھتی ہے اور باوجود بیوی بچوں کی موجودگی اور ان کی فکر کے جب آپ غار حراء میں جا کر عبادت الٰہی میں مشغول ہوئے تو آپ کے پائے ثبات کو مشرکین کی ہنسی اور ٹھٹھے نے ذرا بھی متزلزل نہ کیا- اور آخر اس وقت اس غار کو چھوڑا جب آسمان سے حکم آیا کہ بس اب خلوت کا زمانہ ختم ہؤا اور کام کا زمانہ آ گیا جا اور ہماری مخلوق کو راہ راست پر لا- يَآيُّهَا الْمُدَّثِّرُ- قُمْ فَاَنْذِرْ- وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ- وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (المدثر: ۲-۶) اس حکم کا نازل ہونا تھا کہ وہ شخص جو باوجود ہزاروں احتیاجوں اور سینکڑوں شغلوں کے اپنے بیوی بچوں کو خدا کے سپرد کر کے وحدہٗ لاشریک خدا کی پرستش میں مشغول تھا- اور دنیا و مافیہا سے بے تعلق تھا- شہر سے دور راہ سے علیحدہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر پھر دوسری طرف چند گز

نیچے اتر کر ایک پتھر کے نیچے بیٹھ کر، تا دنیا اس کی عبادت میں مخل نہ ہو۔ عبادت الٰہی کیا کرتا تھا۔ اور انسانوں سے ایسا متنفر تھا گویا وہ سانپ ہیں یا اژدہا۔ دنیا کے سامنے آتا ہے اور یا تو وہ دنیا سے بھاگتا تھا یا اب دنیا اس سے بھاگ رہی ہے۔ اور اس کے نزدیک کوئی نہیں جاتا مگر وہ ہے کہ ہر ایک گھر میں گھستا ہے ہر ایک شخص کو پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کعبہ کے میدان میں کھڑا رہتا ہے تاکہ کوئی شخص طواف کرنے کے لئے گھر سے نکلے تو اس سے ہی کچھ بات کر سکوں۔ قافلے آتے ہیں تو لوگ تو اس لئے دوڑے جاتے ہیں کہ جا کر کچھ غلہ خرید لائیں یا جو اسباب تجارت وہ لائے ہیں اسے اپنی ضرورت کے مطابق خرید لیں۔ لیکن یہ شخص کسی تجارت کی غرض سے نہیں بلکہ ایک حق اور صداقت کی خبر دینے کے لئے ان سے بھی آگے آگے دوڑا جاتا ہے۔ اور اس کا پیغام کیا ہے جو ہر ایک انسان کو پہنچانا چاہتا ہے وہ پیغام لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ہے جس سے عرب ایسی وحشت کھاتے تھے کہ اگر کان میں یہ آواز پڑ جاتی تو کان میں انگلیاں دے لیتے تھے اور جس کے منہ سے یہ الفاظ سنتے اس پر دیوانہ وار لپک پڑتے اور چاہتے کہ اسے ایسی سزا دیں کہ جس سے بڑھ کر اور سزا نا ممکن ہو۔ مگر باوجود عربوں کی اس مخالفت کے وہ تنہائی پسند انسان 'غار حراء میں دن گزارنے والا انسان' جب موقعہ پاتا یہ پیغام ان کو سناتا۔ اور کسی مجلس یا کسی جماعت کا خوف یا رعب اسے اس پیغام کے پہنچانے میں روک نہ ہو سکتا۔ یہ کام اس نے ایک دن نہیں دو دن نہیں مہینہ نہیں دو مہینہ نہیں اپنی وفات کے دن تک کیا اور باوجود سب دنیا کی مخالفت کے اپنے کام سے باز نہ آیا۔ نہ عرب کے مشرک اس کو باز رکھ سکے نہ شام کے مسیحی اس کے جوش کو کم کر سکے نہ ایران کے مجوسی اس کو سست کر سکے۔ اور نہ مدینہ اور خیبر کے یہود اس کی راہ میں روک بن سکے۔ ہر ایک دشمنی، ہر ایک عداوت، ہر ایک مخالفت، ہر ایک تکلیف کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا اور ایک منٹ کے لئے بھی اس نے اپنی آواز نیچی نہ کی۔ حتّٰی کہ وفات کے وقت بھی یہی نصیحت کرتا گیا کہ دیکھنا خدا تعالیٰ کا شریک کسی کو نہ بنانا اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے کوئی چیز اس کے برابر نہیں حتّٰی کہ سب انسانوں سے افضل محمد ﷺ بھی اس کا ایک بندہ اور رسول ہے۔ اس کی قبر کو بھی دوسری قوموں کے دستور کے مطابق مسجد نہ بنا لینا۔

کیا اس استقلال کا نمونہ دنیا میں کسی اور انسان نے بھی دکھایا ہے؟ کیا ایسے مخالفانہ حالات کے مقابلہ پر ایسا فولادی عزم کسی نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ لوگ ذرا ذرا سا کام کر کے تھک جاتے ہیں اور تھوڑی سی تکلیف دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں بلکہ بغیر تکلیف کے بھی کسی

کام پر اس قدر عرصہ تک متواتر توجہ نہیں کر سکتے جس کا نمونہ آنحضرت ﷺ نے دکھایا اور جس نمونہ کو دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جس کام کو اپنے ذمہ لیا تھا اس کی خوبی اور بہتری پر دل سے یقین رکھتے تھے۔ کیونکہ اس قدر لمبے عرصہ تک باوجود اس قدر تکالیف کے کوئی انسان ایک ایسے امر پر جسے وہ جھوٹا خیال کرتا ہو قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ یہ بھی کھل جاتا ہے کہ وہ کونسی طاقت تھی جس سے کام لے کر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر دی تھی۔ جس نے باوجود قلت تعداد کے سب دنیا کو فتح کر لیا تھا وہ آپ کا استقلال اور آپ کا عمل ہی تھا۔ جس نے ان مٹھی بھر آدمیوں کو جو آپ کی صحبت میں رہنے والے تھے کل دنیا کی اصلاح کے کام کے اختیار کرنے کی جرأت دلائی اور صرف جرأت ہی نہیں دلائی بلکہ آخر دم تک ایسا آمادہ کئے رکھا کہ انہوں نے دنیا کی اصلاح کا کام کر کے بھی دکھا دیا۔ مگر افسوس! کہ اب مسلمانوں میں وہ روح کام نہیں کرتی۔

ہم نے مختصراً آنحضرت ﷺ کی زندگی سے ثابت کیا تھا کہ آپ میں استقلال کا مادہ ایسے درجہ تک پایا جاتا تھا۔ کہ اس کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل ہے۔ اب ہم اسی مضمون کو ایک اور پیرایہ میں بیان کر کے آپ کے استقلال کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

جن لوگوں نے انسان کے اخلاق کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور اس کی مختلف شاخوں پر نظر امعان ڈالی ہے، وہ جانتے ہیں کہ عوام میں جو اخلاق مشہور ہیں ان سے بہت زیادہ اخلاق انسان میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن قلت تدبر یا اخلاق کی کثرت کی وجہ سے یا تو سب اخلاق ابتداء میں معلوم نہیں ہو سکے یا یہ کہ ان میں سے ایک قسم کے اخلاق کا نام ایک ہی رکھ دیا گیا ہے۔ اور اخلاق کی چند انواع مقرر کر کے ان کے نام رکھ دیئے گئے ہیں۔ اور آگے ان کی شناخت اسماء کی بجائے تعریف ہی کافی سمجھ لی گئی ہے۔

استقلال جو ایک نہایت مفید اور دوسرے اخلاق کو چمکا دینے والا خلق ہے، اس کی بھی کئی اقسام ہیں جن کا نام لغت میں موجود نہیں۔ بلکہ سب اقسام کو استقلال کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے لیکن انسانی اخلاق کا وسیع مطالعہ کرنے سے ہمیں یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ اس خلق کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

جن میں سے دو بڑی قسمیں یہ ہیں کہ ایک استقلال وہ ہوتا ہے جس کا ظہور بڑے کاموں میں ہوتا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کا ظہور چھوٹے کاموں میں ہوتا ہے چنانچہ انسانوں میں دو قسم کے انسان پائے جاتے ہیں بعض ایسے ہیں کہ اہم اور وسیع الاثر معاملات میں جب وہ لگ جاتے ہیں تو گو ان

کے راستہ میں خطرناک سے خطرناک مصائب پیش آئیں وہ اپنے کام سے دست برداری نہیں کرتے اور کل دنیا کی مخالفت کے باوجود اپنا کام کئے جاتے ہیں- لیکن انہی لوگوں میں بعض ایسے پائے جاتے ہیں کہ روزمرہ کے کاموں میں جو نسبتاً کم اہمیت رکھتے ہوں یا ان کا دائرہ اثر ایسا وسیع نہ ہو جیسا کہ اول الذکر کا وہ استقلال نہیں دکھا سکتے- بلکہ چند دن سے زیادہ ان کے ارادہ اور ان کے عمل کو ثبات حاصل نہیں ہوتا-

اس جماعت کے خلاف ایک ایسی بھی جماعت ہے- جو چھوٹے اور محدود الاثر معاملات میں تو خوب استقلال سے کام کر لیتے ہیں- لیکن جب کسی مہتم بالشان کام پر ان کو لگایا جاوے تو ان کا استقلال جاتا رہتا ہے اور وہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں- اور مفوضہ کام کو پورا کرنے کے اہل ثابت نہیں ہوتے-

پس ان دونوں گروہوں کو ہم گو صاحب استقلال تو کہیں گے لیکن ہمیں یہ بھی ساتھ ہی اقرار کرنا پڑے گا- کہ اگر ایک استقلال کی ایک قسم سے محروم ہے تو دوسرا دوسری سے اور حقیقی طور پر صفت استقلال سے متصف انسان وہی ہو گا جو دونوں صورتوں میں اپنے استقلال کو ہاتھ سے نہ دے- اور خواہ امور مہمہ ہوں- یا امور محدود الاثر- اس کا استقلال اپنا اثر ظاہر کئے بغیر نہ رہے-

جب ہم آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر نظر ڈالتے ہیں- تو آپ استقلال کی ہر قسم میں کامل نظر آتے ہیں- چنانچہ یہ بات کہ ان امور میں جنہیں آپ نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیا تھا- آپ کیسے مستقل مزاج ثابت ہوئے ہیں- پہلے لکھ آیا ہوں- اس جگہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شرک کی بیخ کنی اور حق کے پھیلانے میں ہی آنحضرت ﷺ نے استقلال کا اظہار نہیں کیا' بلکہ آپ کے تمام کاموں سے آپ کی کبھی نہ تھکنے والی طبیعت کا پتہ چلتا ہے- چنانچہ حضرت عائشہؓ آپ کی اس عادت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرماتی ہیں:

وَكَانَ يَقُوْلُ: خُذُوْا مِنَ الْعَمَلِ مَا تُطِيْقُوْنَ، فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا وَاَحَبُّ الصَّلٰوةِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا دُوْوِمَ عَلَيْهِ وَاِنْ قَلَّتْ، وَكَانَ اِذَا صَلّٰى صَلٰوةً دَاوَمَ عَلَيْهَا (کتاب الصوم باب صوم شعبان) ترجمہ آپ فرمایا کرتے تھے- کہ وہ عمل کیا کرو جس کے ادا کرنے کی تم میں طاقت ہو- کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں ملول ہوتا یہاں تک کہ تم ملول نہ ہو جاؤ- (یعنی جس قدر بھی دعا اور عبادت کرو- اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں رکتا- ہاں تم خود ہی تھک کر رہ جاؤ تو رہ جاؤ- اس لئے اس قدر عمل مت کرو- کہ آخر طبیعت میں نفرت پیدا ہو جائے- اور اس طرح

اللہ تعالیٰ کے گنہگار بنو) اور آنحضرت ﷺ کو نمازوں میں سب سے پیاری وہ نماز ہوتی تھی جس پر دوام اختیار کیا جائے۔ خواہ تھوڑی ہی ہو اور آنحضرت ﷺ جب کسی وقت نماز پڑھتے تھے تو پھر اس وقت کو جانے نہ دیتے تھے۔ ہمیشہ اس وقت نماز پڑھتے رہتے۔

حضرت عائشہؓ کی اس گواہی سے نہایت بیّن اور واضح طور سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا استقلال ہر رنگ میں کامل تھا۔ اور خواہ بڑے کام ہوں یا چھوٹے۔ آپ استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ چنانچہ اس شہادت سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ صحابہ کو استقلال کا سبق پڑھانا۔ اور ہمیشہ انہیں استقلال کی تعلیم دیتے رہنا۔ کیونکہ طاقت سے بڑھ کر کام کرنے کا نتیجہ ہمیشہ بے استقلالی ہوتا ہے۔ اور آپ کا اس بات سے صحابہؓ کو روکنا درحقیقت انہیں استقلال کی تعلیم دینا تھا۔ اور یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے جس میں کوئی نبی آپ کا شریک نہیں۔ کہ آپ قرآن کریم کے طریق کے مطابق جب کبھی کسی نیکی کا حکم کرتے یا بدی سے روکتے۔ تو ہمیشہ اس نیکی کے حصول کی آسان راہ ساتھ بتاتے۔ یا اس بدی کا اصل باعث ظاہر کرتے تاکہ اس سے اجتناب کر کے انسان اس بدی سے بچ جائے۔ اور اسی اصل کے ماتحت آنحضرت ﷺ نے استقلال کی تعلیم بھی صحابہؓ کو دی۔ یعنی انہیں منع فرمادیا کہ جس کام کو آخر تک نباہنا مشکل ہو اس پر اپنی خوشی سے ہاتھ مت ڈالو کہ اس طرح رفتہ رفتہ بے استقلالی کی عادت تم میں پیدا نہ ہو جائے۔

۲۔ اس شہادت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ خود بھی اس تعلیم پر عمل پیرا تھے۔ اور اسی عبادت کو پسند فرماتے جس پر دوام ہو سکتا ہو۔ خواہ وہ تھوڑی ہی ہو۔ اور اس طرح اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دیتے۔ کہ آپ کسی کام میں خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا۔ استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

۳۔ تیسرے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ نہ صرف عام کاموں میں بلکہ عبادت میں بھی آپ استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اور یہ ایک خاص بات ہے۔ کیونکہ استقلال یا بے استقلالی کا اظہار عام کاموں میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک دن خاص اثر اور جوش کے ماتحت خاص طور پر عبادت کرے۔ اور دوسرے دن نہ کرے۔ تو اس کا ایسا کرنا بے استقلالی نہیں کہلا سکتا۔ لیکن آنحضرت ﷺ اس صفت میں ایسے کامل تھے کہ آپ عبادت میں بھی یہ پسند نہ فرماتے کہ ایک دن ایک عبادت کر کے دوسرے دن چھوڑ دیں۔ بلکہ جب ایک عبادت ایک دن کرتے تو دوسرے دن پھر کرتے تاکہ اس کے ترک سے طبیعت میں بے استقلالی نہ پیدا ہو۔ اور یہ بات آپ کے

استقلال پر خاص روشنی ڈالتی ہے۔

طہارۃ النفس۔احسان کی قدر

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اس بات کے تو طالب رہتے ہیں کہ دوسرے ان پر احسان کریں لیکن اس بات کا ان کے دل میں خیال بھی نہیں آتا کہ جن لوگوں نے ان پر احسان کیا ہے ان کے احسانات کو یاد رکھ کر ان کا بدلہ بھی دیں۔ایک دو احسانات کا یاد رکھنا تو الگ رہا والدین جن کے احسانات کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ان کے احسانات کو بھی بہت سے لوگ بھلا دیتے ہیں۔اور یہ خیال کر لیتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا اپنی محبت سے مجبور ہو کر یا اپنا فرض خیال کر کے کیا ہمیں اب کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ ان کی خبر گیری کرتے پھریں۔لیکن ہمارے آنحضرت ﷺ کا حال دنیا سے بالکل مختلف تھا۔آپ پر جب کوئی شخص احسان کرتا تو آپ اسے ہمیشہ یاد رکھتے تھے اور کبھی فراموش نہ کرتے تھے۔اور ہمیشہ آپ کی کوشش رہتی تھی کہ جس نے آپ پر کبھی کوئی احسان کیا ہو۔اسے اس کے احسان سے بڑھ کر بدلہ دیں۔یوں تو آپ کا اپنے رشتہ داروں، دوستوں، مریدوں، خادموں اور ہم وطنوں سے سلوک شروع سے آخر تک ہمارے اس دعوے کی تصدیق کر رہا ہے لیکن ہم اسے واضح کرنے کے لئے ایک مثال بھی دے دیتے ہیں۔جس سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو اپنے محسن کے احسان کا کس قدر خیال رہتا تھا اور کس طرح اسے یاد رکھتے تھے۔

بدر کی جنگ کے نام سے کون سا مسلمان ناواقف ہو گا یہی وہ جنگ ہے جس کا نام قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرقان رکھا ہے اور یہی وہ جنگ ہے جس میں عرب کے وہ سردار جو اس دعویٰ کے ساتھ گھر سے چلے تھے کہ اسلام کا نام ہمیشہ کے لئے مٹا دیں گے خود مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ آج ان کا نام لیوا کوئی باقی نہیں۔اور اگر کوئی ہے تو اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرنا بجائے فخر کے عار خیال کرتا ہے۔غرضیکہ اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عظیم الشان کامیابی عطا فرمائی تھی اور بہت سے کفار قید بھی ہوئے تھے۔

وہ لوگ جو گھر سے اس ارادہ سے نکلے تھے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے اتباع کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیں گے۔اور جن کے دل میں رحم کا خیال تک بھی نہ تھا ان سے جس قدر بھی سختی کی جاتی اور جو سزائیں بھی ان کے لئے تجویز کی جاتیں بالکل روا اور مناسب تھیں۔لیکن ان کی شرارت کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ نے ان سے جو نرم سلوک کیا یعنی صرف ایک خفیف سا تاوان لے کر چھوڑ دیا۔وہ اپنی آپ ہی نظیر ہے مگر اس نرم سلوک پر بھی ابھی آپ کے دل میں یہ

تڑپ باقی تھی کہ اگر ہو سکے تو اور بھی نرمی ان سے برتوں اور آپ بہانہ ہی ڈھونڈتے تھے کہ کوئی اور معقول وجہ پیدا ہو جائے۔ تو میں ان کو بِلا تاوان لئے کے چھوڑوں۔ چنانچہ اس موقعہ پر آپ نے حضرت جبیرؓ سے جو گفتگو فرمائی وہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپ کا دل اسی طرف مائل تھا کہ کوئی معقول عذر ہو تو میں ان لوگوں کو یونہی چھوڑ دوں۔ ہاں بلا وجہ چھوڑنے میں کئی قسم کے پولیٹیکل نقص تھے۔ جن کی وجہ سے آپ بِلا کافی وجوہات کے یونہی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اس گفتگو سے جہاں مذکورہ بالا نتیجہ نکلتا ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے محسنوں کے احسانات کیسے یاد رہتے تھے اور آپ ان کا بدلہ دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ حضرت جبیرؓ فرماتے ہیں کہ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ اُسَارٰی بَدْرٍ: لَوْ کَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِیٍّ حَیًّا ثُمَّ کَلَّمَنِیْ فِیْ ھٰٓؤُلَآءِ النَّتْنٰی لَتَرَکْتُھُمْ لَہٗ۔ (بخاری کتاب الجہاد باب ما منّ النبی صلی اللہ علیہ و سلم علی الاساری) یعنی نبی کریم ﷺ نے قیدیان بدر کے متعلق فرمایا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا۔ اور ان ناشدنیوں کے حق میں سفارش کرتا تو میں ضرور ان کو چھوڑ دیتا۔ یہ کیا ہی پیارا کلام ہے۔ اور کن بلند خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جن کے سینوں میں احسانات کی قدر کرنے والا دل ہو۔

شاید اکثر ناظرین مطعم بن عدی کے نام اور اس کے کام سے ناواقف ہوں۔ اور خیال کریں کہ اس حدیث کا اس مضمون سے کیا تعلق ہے اس لئے میں اس جگہ مطعم بن عدی کا وہ واقعہ بیان کر دیتا ہوں جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے اس موقعہ پر مطعم بن عدی کو یاد فرمایا اور خواہش فرمائی۔ کہ اگر آج وہ ہوتا تو میں ان قیدیان جنگ کو اس کی سفارش پر چھوڑ دیتا۔

آنحضرت ﷺ جب مکہ میں تشریف رکھتے تھے تو ایک دفعہ ابو جہل اور اس کے چند ساتھیوں نے مشورہ کر کے قریش کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب سے خرید و فروخت اور نکاح وغیرہ کے معاملات بالکل ترک کر دیں کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کو ان کے دشمنوں کے سپرد نہیں کر دیتے۔ کہ جس طرح چاہیں ان سے سلوک کریں۔ چنانچہ اس مضمون کا ایک معاہدہ لکھا گیا کہ آئندہ کوئی شخص بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ہاتھ نہ کوئی چیز فروخت کرے گا۔ نہ ان سے خریدے گا اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا رشتہ کرے گا۔ اس بائیکاٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے شر سے بچنے کے لئے حضرتؐ کے چچا ابو طالب کو مذکورہ بالا دونوں گھرانوں سمیت مکہ والوں سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اور چونکہ مکہ ایک وادی غیر ذی زرع میں

واقع ہے۔ کھانے پینے کی سخت تکلیف ہونے لگی اور سوائے اس کے کہ کوئی خدا کا بندہ چوری چھپے کوئی چیز دے جائے ان لوگوں کو ضرؤریات زندگی بھی میسر آنی مشکل ہو گئیں۔ اور قریباً دو سال تک یہی معاملہ رہا۔ اور بعض مؤرخ تو لکھتے ہیں کہ تین سال تک یہی حال رہا جب حالت انتہاء کو پہنچ گئی تو قریش میں سے پانچ شخص اس بات پر آمادہ ہوئے کہ اس ظلم کو دور کیا جائے اور ان قیدیوں کو رہائی دلائی جائے۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں مشورہ کرکے ایک دن عین کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ اب ہم اس ظلم کو زیادہ نہیں دیکھ سکتے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ تو پیٹ بھر کر کھانا کھائیں اور آرام سے زندگی بسر کریں۔ مگر چند ہمارے ہی ہم قوم اسی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے کھانے پینے سے تنگ ہوں اور باوجود قیمت دینے کے غلہ ان کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائے۔ ہم اس معاہدہ کی جو ایسے ظلم کو روا رکھتا ہے پابندی نہیں کر سکتے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ بہت سے لوگ جن کے دل انصاف سے کورے نہ تھے۔ ان کی تائید میں کھڑے ہو گئے اور آخر وہ معاہدہ پھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ اور آنحضرت ﷺ اور آپ کے قبیلہ کے لوگ اس قید سے آزاد ہوئے۔ مطعم بن عدی بھی ان پانچ اشخاص میں سے ایک تھا اور یہی تھا کہ جس نے بڑھ کر اس معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دیا۔

علاوہ ازیں جب آنحضرت ﷺ طائف کے لوگوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور آپ سے وہاں کے بدمعاشوں نے سخت ظلم کا سلوک کیا اور آپ کے پیچھے لڑکے اور کتے لگا دیئے تو آپ کو واپس مکہ میں آنا پڑا لیکن یہ وہ وقت تھا کہ مکہ کے لوگ بھی سخت سے سخت شرارت پر آمادہ ہو رہے تھے۔ اور آپ کو وہاں بھی امن ملنا مشکل تھا اس وقت مطعم بن عدی نے آگے آکر آپ کو اپنے جوار میں لیا اور اپنی ذمہ داری پر آپ کو پناہ دی۔

یہ وہ احسانات تھے جو مطعم بن عدی نے آپ پر کئے تھے۔ اور جبیرؓ بن مطعم سے آپ کا مذکورہ بالا کلام ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو ہمیشہ خیال رہتا تھا کہ کاش وہ زندہ ہوتا۔ اور میں اس کے احسانات کا بدلہ اتارتا۔

چونکہ مطعم نے آپ کو اور آپ کے قبیلہ کو اس قید سے آزاد کرانے میں بہت کوشش کی تھی جس میں آپ بوجہ قریش کے غیر منصفانہ معاہدہ کے گرفتار تھے۔ اور پھر اس وقت جبکہ آپ کے دشمن آپ کو قسم قسم کی تکلیف پہنچانے پر آمادہ تھے آپ کو پناہ دی تھی۔ آپ کی توجہ بدر کے قیدیوں کو دیکھ کر اور یہ خیال کرکے کہ وہ لوگ جو چند سال پہلے مجھے اپنے ہاتھ میں خیال کرتے تھے

آج میرے ہاتھ میں گرفتار ہیں فوراً مطعم کے اس احسان کی طرف گئی اور اس احسان کو یاد کر کے فرمایا کہ جس طرح مطعم نے ہمیں قید سے آزاد کروایا تھا اور دشمنوں کی تکلیف سے بچایا تھا آج اگر وہ زندہ ہوتا تو ایسے خطرناک دشمنوں کو میں اس کی سفارش سے قید سے آزاد کر دیتا- اور ہر ایک تکلیف سے امن دے دیتا-

طہارۃ النّفس -لڑائی سے نفرت

بہت سی طبائع اس قسم کی ہوتی ہیں کہ وہ بہادری میں تو بے شک کمال رکھتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں ایک قسم کی سختی پیدا ہو جاتی ہے- اور ان کی بہادری در حقیقت لڑائی اور جھگڑے کا نتیجہ ہوتی ہے اور بجائے ایک خلقی خوبی کے' عادت کا نتیجہ ہوتی ہے جیسے کہ بعض ایسے ممالک کے لوگ' جہاں امن و امان مفقود ہوتا ہے اور لوگ آپس میں لڑتے اور جھگڑتے رہتے ہیں' عادتاً دلیر اور بہادر ہوتے ہیں لیکن ان کی بہادری کوئی نیک خلق نہیں ہوتی بلکہ روزانہ کی عادت کا نتیجہ ہوتی ہے جیسے کہ بعض جانور بھی بہادر ہوتے ہیں' اور یہ بات ان کے اخلاق میں سے نہیں ہوتی بلکہ ان کی پیدائش ہی ایسے رنگ میں کی گئی ہے کہ وہ بہادر ہوں مثلاً شیر چیتا وغیرہ پس جو انسان کہ عادتاً بہادر ہے یعنی ایسے حالات میں اس نے پرورش پائی ہے کہ اس کی طبیعت میں سختی اور لڑائی جھگڑے کی عادت ہو گئی ہے اس کی بہادری چنداں قابل قدر نہیں لیکن جو شخص کہ لڑائی اور جھگڑے سے نفرت رکھتا ہو' موقعہ پر بہادری دکھائے اس کی بہادری قابل قدر ہے- میں یہ تو پہلے بتا آیا ہوں کہ رسول کریم ﷺ بے نظیر بہادر تھے اور کوئی شخص بہادری میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا- اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپؐ لڑائی اور جھگڑے سے سخت متنفر تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو عام طور پر لڑائی اور جھگڑا دیکھتے دیکھتے آپؐ کے اندر بہادری کی صفت پیدا ہو گئی تھی اور نہ ایسا تھا کہ جنگوں اور لڑائیوں کے باعث طبیعت میں ایسی سختی پیدا ہو گئی تھی کہ جھگڑے اور فساد کو طبیعت پسند کرنے لگے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں اکثر ایک دوسرے کے باعث سے پیدا ہو جاتی ہیں- کئی بہادر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی بہادری ان کی جھگڑالو اور فسادی طبیعت کا نتیجہ ہوتی ہے اور کئی بہادر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی بہادری ان کو لڑائی اور جھگڑے کا عادی بنا دیتی ہے لیکن آپؐ کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ آپؐ بہادر تھے لیکن آپؐ کی بہادری ایک نیک خلق کے طور پر تھی اور باوجود بہادر اور میدان کارزار میں ثابت قدم رہنے والا ہونے کے آپؐ کو کسی سے جھگڑتے نہیں دیکھا- ہر ایک معاملہ کو سہولت سے طے کرتے اور اگر کسی کو لڑتا دیکھتے بھی تو اس حرکت سے

اسے روک دیتے چنانچہ آپؐ کی اس نفرت کا یہ اثر تھا کہ صحابہؓ جنہیں رسول کریم ﷺ کے آخری زمانہ میں جنگ و جدل کے ساتھ ہی واسطہ پڑا رہتا تھا کبھی آپس میں لڑتے جھگڑتے نہ تھے اور ان کی طبیعت میں سختی اور درشتی پیدا نہیں ہوئی تھی کیونکہ ہر ایک ایسے واقعہ پر رسول کریم ﷺ ان کو روک دیتے تھے۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر میدان جنگ کے بہادر مختلف لڑائیوں اور جھگڑوں سے بجائے گھبرانے کے ان میں مزا حاصل کرتے ہیں اور کئی لوگ تو خود لڑائی کرا کے تماشہ دیکھتے ہیں مگر رسول کریم ﷺ عمر بھر باوجود بے نظیر بہادری کے لڑائیوں اور جھگڑوں سے سخت نفرت کرتے رہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے اندر ایک اور ہی روح تھی جو کام کر رہی تھی اور آپؐ اس دنیا کے لوگوں سے تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ آپؐ آسمانی انسان تھے جس کا ہر کام آسمانی تھا۔ رسول کریم ﷺ کی تمام زندگی ہی اس بات پر شاہد ہے کہ آپؐ لڑائی جھگڑے کو سخت ناپسند فرماتے تھے لیکن اس جگہ میں ایک دو مثالیں بھی دیتا ہوں جن سے آپؐ کے پاکیزہ نفس کا پتہ چلتا ہے۔ عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُخْبِرَنَا بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ، فَتَلَاحٰى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ: خَرَجْتُ لِاُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ، فَتَلَاحٰى فُلَانٌ وَ فُلَانٌ فَرُفِعَتْ، وَ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ خَيْرًا لَّكُمْ، فَالْتَمِسُوْهَا فِى التَّاسِعَةِ وَالسَّابِعَةِ وَالْخَامِسَةِ (بخاری کتاب الصوم باب رفع معرفۃ لیلۃ القدر لتلاحی الناس)

یعنی رسول کریم ﷺ ایک دفعہ اپنے گھر سے لیلۃ القدر کی خبر دینے کے لئے نکلے۔ اتنے میں دو شخص مسلمانوں میں سے لڑ پڑے (یعنی جب آپؐ نکلے تو دو شخصوں کو لڑتے پایا) اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں لیلۃ القدر کی خبر دینے کے لئے نکلا تھا لیکن فلاں فلاں شخص لڑ رہے تھے جسے دیکھ کر مجھے بھول گیا کہ وہ رات کب ہوگی۔ خیر شاید یہ بھی تمہارے لئے اچھا ہو۔ تم اسے انتیسویں ستائیسویں اور پچیسویں رات میں تلاش کرو۔

طہارۃ النفس۔ تکبّر سے اجتناب

ایک مثال تو آپؐ کے تکبر سے بچنے کی میں پہلے دے چکا ہوں ایک اور دیتا ہوں اور انہی دونوں مثالوں پر کیا حصر ہے آنحضرت ﷺ کا ایک ایک عمل اس بات کی روشن مثال ہے کہ آپؐ تکبر سے کوسوں دور تھے لیکن جیسا کہ میں ابتداء میں لکھ آیا ہوں اس سیرت میں مَیں نے صرف اُس حصہ سیرت پر روشنی ڈالنی ہے جو اَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ بخاری سے ہمیں معلوم ہوتا ہے اور دوسرے

جو واقعات پہلے بیان کئے جا چکے ہیں ان کے دوبارہ دہرانے سے بھی اجتناب کرنا مناسب ہے پس ان مجبوریوں کی وجہ سے صرف دو مثالوں پر ہی کفایت کی جاتی ہے جن میں سے ایک تو پہلے بیان ہو چکی ہے اور دوسری ذیل میں درج ہے حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں۔

حَدَّثَنَا مُجَاهِدٌ: اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَقُوْلُ: آللّٰهِ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اِنْ كُنْتُ لَاَعْتَمِدُ بِكَبِدِيْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْجُوْعِ، وَاِنْ كُنْتُ لَاَشُدُّ الْحَجَرَ عَلٰى بَطْنِيْ مِنَ الْجُوْعِ، وَلَقَدْ قَعَدْتُ يَوْمًا عَلٰى طَرِيْقِهِمُ الَّذِيْ يَخْرُجُوْنَ مِنْهُ، فَمَرَّ اَبُوْ بَكْرٍ، فَسَأَلْتُهُ عَنْ اٰيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ، مَا سَأَلْتُهُ اِلَّا لِيُشْبِعَنِيْ، فَمَرَّ وَلَمْ يَفْعَلْ، ثُمَّ مَرَّ بِيْ عُمَرُ، فَسَأَلْتُهُ عَنْ اٰيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ، مَا سَأَلْتُهُ اِلَّا لِيُشْبِعَنِيْ، فَمَرَّ وَلَمْ يَفْعَلْ، ثُمَّ مَرَّ بِيْ اَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَتَبَسَّمَ حِيْنَ رَاٰنِيْ، وَعَرَفَ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَمَا فِيْ وَجْهِيْ، ثُمَّ قَالَ: يَا اَبَا هِرٍّ قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: اِلْحَقْ وَمَضٰى فَاتَّبَعْتُهُ، فَدَخَلَ، فَاسْتَأْذَنَ، فَاَذِنَ لِيْ، فَدَخَلَ، فَوَجَدَ لَبَنًا فِيْ قَدَحٍ، فَقَالَ: مِنْ اَيْنَ هٰذَا اللَّبَنُ قَالُوْا: اَهْدَاهُ لَكَ فُلَانٌ اَوْ فُلَانَةٌ، قَالَ: اَبَا هِرٍّ قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: اِلْحَقْ اِلٰى اَهْلِ الصُّفَّةِ فَادْعُهُمْ لِيْ قَالَ: وَاَهْلُ الصُّفَّةِ اَضْيَافُ الْاِسْلَامِ، لَا يَأْوُوْنَ عَلٰى اَهْلٍ وَلَا مَالٍ وَلَا عَلٰى اَحَدٍ، اِذَا اَتَتْهُ صَدَقَةٌ بَعَثَ بِهَا اِلَيْهِمْ وَلَمْ يَتَنَاوَلْ مِنْهَا شَيْئًا، وَاِذَا اَتَتْهُ هَدِيَّةٌ اَرْسَلَ اِلَيْهِمْ وَاَصَابَ مِنْهَا وَاَشْرَكَهُمْ فِيْهَا، فَسَاءَنِيْ ذٰلِكَ، فَقُلْتُ: وَمَا هٰذَا اللَّبَنُ فِيْ اَهْلِ الصُّفَّةِ، كُنْتُ اَحَقَّ اَنَا اَنْ اُصِيْبَ مِنْ هٰذَا اللَّبَنِ شَرْبَةً اَتَقَوّٰى بِهَا، فَاِذَا جَاءَ اَمَرَنِيْ، فَكُنْتُ اَنَا اُعْطِيْهِمْ، وَمَا عَسٰى اَنْ يَّبْلُغَنِيْ مِنْ هٰذَا اللَّبَنِ، وَلَمْ يَكُنْ مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَطَاعَةِ رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُدٌّ، فَاَتَيْتُهُمْ فَدَعَوْتُهُمْ فَاَقْبَلُوْا، فَاسْتَأْذَنُوْا فَاَذِنَ لَهُمْ، وَاَخَذُوْا مَجَالِسَهُمْ مِنَ الْبَيْتِ، قَالَ: يَا اَبَا هِرٍّ قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: خُذْ فَاَعْطِهِمْ قَالَ: فَاَخَذْتُ الْقَدَحَ، فَجَعَلْتُ اُعْطِيْهِ الرَّجُلَ فَيَشْرَبُ حَتّٰى يَرْوٰى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ، فَاُعْطِيْهِ الرَّجُلَ فَيَشْرَبُ حَتّٰى يَرْوٰى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ فَيَشْرَبُ حَتّٰى يَرْوٰى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ، حَتّٰى اِنْتَهَيْتُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ رَوِيَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ، فَاَخَذَ الْقَدَحَ فَوَضَعَهٗ عَلٰى يَدِهٖ، فَنَظَرَ اِلَيَّ فَتَبَسَّمَ، فَقَالَ: اَبَا هِرٍّ قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: بَقِيْتُ اَنَا وَاَنْتَ قُلْتُ: صَدَقْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: اُقْعُدْ فَاشْرَبْ فَقَعَدْتُ فَشَرِبْتُ، فَقَالَ: اِشْرَبْ فَشَرِبْتُ، فَمَا زَالَ يَقُوْلُ: اِشْرَبْ حَتّٰى قُلْتُ: لَا وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ، مَا اَجِدُ لَهٗ مَسْلَكًا، قَالَ:

فَاَذِنَ لِیْ فَاَعْطَیْتُہُ الْقَدَحَ، فَحَمِدَ اللّٰہَ وَ سَمّٰی وَ شَرِبَ الْفَضْلَۃَ (بخاری کتاب الرقاق باب کیف کان عیش النبی صلی اللہ علیہ و سلم و اصحابہ و تخلیھم من الدنیا)

ترجمہ۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں کہ میں بھوک کے مارے زمین پر منہ کے بل لیٹ جایا کرتا تھا اور کبھی میں بھوک کے مارے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتا تھا (یعنی رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں اس وقت صحابہؓ زیادہ تر اپنے اوقات دین کے سیکھنے میں ہی خرچ کرتے تھے اور کم وقت اپنی روزی کے کمانے میں لگاتے تھے اس لئے دنیاوی مال آپ کے پاس بہت کم ہوتا تھا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو کوئی کام کیا ہی نہ کرتے تھے، ہر وقت مسجد میں اس انتظار میں بیٹھے رہا کرتے تھے کہ کب رسول کریم ﷺ نکلیں تو میں آپؐ کے ساتھ ہو جاؤں اور جو کچھ آپ کے دہن مبارک سے نکلے اس کو یاد کرلوں اور چونکہ سوال سے بچتے تھے کئی کئی وقت کا فاقہ ہو جاتا لیکن ہر حال میں شاکر تھے اور آستانۂ مبارک کو نہ چھوڑتے تھے)۔ ایک دن ایسے ہؤا کہ میں اس راستہ پر بیٹھ گیا جس پر سے صحابہؓ گزر کر اپنے کاروبار کے لئے جاتے تھے۔ اتنے میں (حضرت) ابو بکرؓ گزرے پس میں نے ان سے قرآن کریم کی ایک آیت پوچھی اور میں نے یہ آیت ان سے اس لئے نہ پوچھی تھی کہ وہ مجھے اس کے معنی بتائیں بلکہ اصل غرض میری یہ تھی کہ شاید ان کی توجہ میری طرف ہو اور میرا پیٹ بھر دیں لیکن انہوں نے معنی بتائے اور آگے چل دیئے، مجھے کچھ کھلایا نہیں۔ ان کے بعد (حضرت) عمرؓ گزرے۔ میں نے ان سے بھی قرآن کریم کی ایک آیت پوچھی اور وہ آیت بھی مجھ کو آتی تھی۔ میری اصل غرض یہی تھی کہ وہ مجھے کچھ کھلائیں مگر وہ بھی اسی طرح گزر گئے اور مجھے کچھ نہ کھلایا۔ پھر وہاں سے ابو القاسم ﷺ (یعنی آنحضرتؐ فداہ نفسی) گزرے آپؐ نے جونہی مجھے دیکھا مسکرا دیئے اور جو کچھ میرے جی میں تھا اور جو میرے چہرہ سے عیاں تھا (یعنی بھوک کے آثار) اس کو پہچان لیا پھر فرمایا ابو ہریرہ! میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! حاضر ہوں ارشاد فرمایئے۔ فرمایا میرے ساتھ چلے آؤ۔ پس میں آپؐ کے پیچھے چل پڑا آپؐ اپنے گھر میں داخل ہوئے اور میرے لئے اجازت مانگی پھر مجھ کو اندر آنے کی اجازت دی۔ پھر آپؐ اندر کمرہ میں تشریف لے گئے اور ایک دودھ کا پیالہ رکھا پایا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ دودھ کہاں سے آیا ہے؟ اندر سے جواب ملا فلاں مرد یا فلاں عورت (حضرت ابو ہریرہؓ کو یاد نہیں رہا کہ مرد کہا یا عورت) نے حضورؐ کے لئے ہدیہ بھیجا ہے۔ اس پر مجھے آواز دی۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! حاضر ہوں۔ فرمایا اہلِ صفّہ کے پاس جاؤ اور ان کو میرے پاس بلا لاؤ۔ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ صفّہ اسلام کے مہمان تھے

جن کے نہ تو کوئی رشتہ دار تھے جن کے پاس رہتے نہ ان کے پاس مال تھا کہ اس پر گزارہ کرتے اور نہ کسی شخص کے ذمہ ان کا خرچ تھا۔ جب نبی کریم ﷺ کے پاس صدقہ آتا تو آپؐ ان کی طرف بھیج دیتے اور اس میں سے خود کچھ نہ کھاتے اور جب آپؐ کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو آپؐ ان کو بلا بھیجتے اور ہدیہ سے خود بھی کھاتے اور ان کو بھی اپنے ساتھ شریک فرماتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ یہ بات مجھے اچھی نہ لگی اور مجھے خیال گزرا کہ یہ دودھ اصحاب الصُّفّہ میں کیوں کر تقسیم ہو گا۔ میں زیادہ مستحق تھا کہ اس دودھ کو پیتا اور قوت حاصل کرتا' جب وہ لوگ آجائیں گے تو آپؐ مجھے حکم فرمادیں گے اور مجھے اپنے ہاتھ سے ان کو تقسیم کرنا پڑے گا اور غالب گمان یہ ہے کہ میرے لئے اس میں سے کچھ نہ بچے گا لیکن خدا اور رسولؐ کی اطاعت سے کوئی چارہ نہ تھا پس میں ان لوگوں کے پاس آیا اور ان کو بلایا۔ وہ آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اجازت دی پس وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ابو ہریرہ! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! حاضر ہوں۔ فرمایا۔ یہ پیالہ لو اور ان کو پلاؤ۔ میں نے پیالہ لیا اور اس طرح تقسیم کرنا شروع کیا کہ پہلے ایک آدمی کو دیتا جب وہ پی لیتا اور سیر ہو جاتا تو مجھے پیالہ واپس کر دیتا پھر میں دوسرے کو دیتا جب وہ سیر ہو جاتا تو مجھے پیالہ واپس کر دیتا۔ اسی طرح باری باری سب کو پلانا شروع کیا یہاں تک کہ سب پی چکے اور سب سے آخر میں مَیں نے نبی کریم ﷺ کو پیالہ دیا آپؐ نے پیالہ لے لیا اور اپنے ہاتھ پر رکھا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا ابو ہریرہ عرض کیا یا رسول اللہ! حکم فرمایا اب تو تم اور میں رہ گئے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ درست ہے۔ فرمایا۔ اچھا تو بیٹھ جاؤ اور پیو پس میں بیٹھ گیا اور میں نے دودھ پیا جب پی چکا تو فرمایا کہ اور پیو۔ میں نے اور پیا۔ پھر فرمایا اور پیو۔ اور اسی طرح فرماتے رہے یہاں تک کہ آخر مجھے کہنا پڑا کہ خدا کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے اب تو اس دودھ کے لئے کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اس پر فرمایا۔ کہ اچھا تو مجھے دو۔ میں نے وہ پیالہ آپؐ کو پکڑا دیا۔ آپؐ نے خدا تعالیٰ کی تعریف اور بسم اللہ پڑھی۔ اور باقی بچا ہؤا دودھ پی لیا۔

اس حدیث سے رسول کریم ﷺ کی سیرت کے جن متفرق مضامین پر روشنی پڑتی ہے ان کے بیان کرنے کا تو یہ موقعہ نہیں مگر اس وقت میری غرض اس حدیث کے لانے سے یہ بیان کرنا ہے کہ رسول کریم ﷺ تکبر سے بالکل خالی تھے اور تکبر آپؐ کے قریب بھی نہ پھٹکتا تھا۔ رسول کریم ﷺ تو خیر بڑی شان کے آدمی تھے اور جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس وقت دنیاوی شان بھی

آپؐ کو بادشاہانہ حاصل تھی (کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ آپؐ کی وفات سے صرف تین سال پہلے مسلمان ہوئے تھے پس اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ مسلمان ہوتے ہی آپؓ کو یہ واقعہ پیش آیا تب بھی فتح خیبر کے بعد کا یہ واقعہ ہے جبکہ رسول کریمؐ کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور عرب کے کئی قبائل آپؐ کی اطاعت کا اقرار کر چکے تھے)۔ آپؐ سے دنیاوی حیثیت میں ادنیٰ لوگوں کو بلکہ معمولی معمولی اُمراء کو دیکھو کہ کیا تکبر اور عجب کے باعث وہ کسی شخص کا جُوٹھا پی سکتے ہیں؟ اس آزادی کے زمانہ میں بھی جبکہ تمام بنی نوع انسان کی برابری کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ اس شان کو بنانے کے لئے طب کی آڑ تلاش کی جاتی ہے کہ ایک دوسرے کا جوٹھا پینے سے ایک دوسرے کی بیماری کے لگ جانے کا خطرہ ہوتا ہے حالانکہ اگر کوئی ایسی بیماری معلوم ہو تو اور بات ہے ورنہ رسول کریم ﷺ تو فرماتے ہیں کہ سُؤْرُ الْمُؤْمِنِ شِفَاءٌ مؤمن کا جُوٹھا استعمال کرنے میں بیماری سے شفاء ہوتی ہے۔ پھر مسلمان کہلانے والوں کا کیا حق ہے کہ اس فتویٰ کے ہوتے ہوئے اپنے تکبر کو پورا کرنے کے لئے اس تارِ عنکبوت عذر کے پیچھے پناہ لیں۔ غرض اس آزادی کے زمانہ میں بھی بادشاہ تو الگ رہے عام لوگ بھی پسند نہیں کرتے کہ اپنے سے نیچے درجہ کے آدمی کا جُوٹھا کھانا یا پانی استعمال کریں اور خواہ دنیاوی حیثیت میں ان سے ادنیٰ درجہ کا آدمی کس قدر ہی صاف اور نظیف کیوں نہ ہو اور ہر قسم کی میلوں اور گندوں سے کتنا ہی پاک کیوں نہ ہو اس کے جُوٹھے کھانے یا پینے کو بھی استعمال نہیں کرتے اور اس کو برا مناتے ہیں اور اس کو اپنی ہتک خیال کرتے ہیں۔ اور پھر امارت ظاہری الگ رہی، قومیتوں کے لحاظ سے بھی ایسے درجہ مقرر کئے گئے ہیں کہ ایک ادنیٰ قوم کے شخص کا جُوٹھا کھانا یا پانی استعمال کرنا اعلیٰ قوم کے لوگ عار خیال کرتے ہیں خود ہمارے گھر میں ایک دفعہ یہ واقعہ ہؤا کہ ایک سیدانی بغرض سوال آئی۔ باتیں کرتے کرتے اس نے پانی مانگا۔ ایک عورت اس کو پانی دینے کے لئے اٹھی اور جو برتن گھڑوں کے پاس پانی پینے کے لئے رکھا تھا اس میں اس نے اسے پانی دیا۔ وہ سیدانی بھی سامنے بیٹھی تھی اس بات کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئی اور بولی کہ شرم نہیں آتی۔ میں سیدانی ہوں اور تو امتیوں کے جُوٹھے برتن میں پانی دیتی ہے۔ نئے برتن میں مجھے پانی پلانا چاہئے تھا۔ غرض صرف سادات میں سے ہونے کی وجہ سے باوجود اس کے کہ وہ ہمارے ہاں سوال کرنے آئی تھی اور محتاج تھی اس نے اس قدر تکبر کا اظہار کیا کہ دوسرے آدمی کا مستعمل برتن جو سید نہ ہو اس کے سامنے پیش کرنا گویا اس کی ہتک تھی۔ جب مستعمل لیکن صاف کردہ برتن سے اس قدر نفرت تھی تو جُوٹھا پانی تو پھر نہایت ناپاک شَے سمجھی جاتی ہو گی لیکن اس سیدوں کے باپ بلکہ

انبیاءؑ کے سید کو دیکھو کہ اصحاب الصُّفّہ جن کو نہ کھانے کو روٹی ' نہ پہننے کو کپڑا ' نہ رہنے کو مکان میسر تھا ان کو اپنے گھر پر بلاتا ہے اور ایک نہیں ' دو نہیں ' ایک جماعت کی جماعت کو دودھ کا پیالہ دیتا ہے اور سب کو باری باری پلا کر سب کا بچا ہؤا ' کم سے کم نصف درجن مونہوں سے گزرا ہؤا دودھ سب سے آخر میں الحمدللہ کہتا ہؤا بسم اللہ کہہ کر پی جاتا ہے اور اس کے چہرہ پر بجائے نفرت کے آثار ظاہر ہونے کے خوشی اور فرحت اور شکر و امتنان کی علامات ہویدا ہوتی ہیں۔

بے شک دنیا میں بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں لیکن اس شان و شوکت کا مالک ہو کر جو رسول کریم ﷺ کو حاصل تھی پھر اس قدر تکبر سے بُعد کی مثال کوئی پیش تو کرے۔ لیکن خوب یاد رکھو کہ ایسی مثال پیش کرنے پر کوئی شخص قادر نہیں ہو سکتا۔

انکسار

تکبر کے متعلق دو مثالیں بیان کرنے کے بعد میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ نہ صرف یہ کہ آپؐ کے اندر تکبر نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ آپؐ کی طبیعت میں حد درجہ کا انکسار☆ بھی تھا اور آپؐ ہمیشہ دوسرے کی تعظیم کرنے کے لئے تیار رہتے تھے اور اپنا رویہ ایسا رکھتے تھے جس سے دوسرے لوگوں کا ادب ظاہر ہو اور یہ وہ بات ہے کہ جس سے عام طور پر لوگ خالی ہوتے ہیں۔ خصوصاً امراء تو اس سے بالکل خالی ہی نظر آتے ہیں۔ ایسے تو شاید بہت سے امراء مل جائیں جو ایک حد تک تکبر سے بچے ہوئے ہوں لیکن ایسے امراء جو تکبر سے محفوظ ہونے کے علاوہ منکسر المزاج بھی ہوں ' شاذ و نادر ہی ملتے ہیں اور میرا یہ کہنا کہ شاذ و نادر منکسر المزاج امراء مل سکتے ہیں اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ایسے امراء بھی ہیں جو اپنے انکسار میں رسول اللہ ﷺ کا نمونہ ہیں۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ کا نمونہ تو انبیاءؑ میں بھی نہیں مل سکتا چہ جائیکہ عام امراء میں مل جائے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ آپ اپنی تمام عادات اور تمام حرکات میں بے نظیر تھے اور اخلاق کے تمام پہلوؤں میں کل انبیاءؑ اور صلحاء پر فضیلت رکھتے تھے۔ پس میں اگر کسی جگہ دوسرے امراء سے آپؐ کا مقابلہ کرتا ہوں تو صرف یہ دکھانے کے لئے کہ بادشاہوں اور امراء میں بھی نیک نمونے تو موجود ہیں لیکن جس طرح ہر رنگ اور ہر پہلو میں آپؐ کامل تھے اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی اور دوسرے یہ بتانے کے لئے کہ آپؐ کو صرف نیک بختوں میں اور صلحاء میں شامل کرنا درست نہیں ہو سکتا بلکہ کسی ایک خلق میں بھی بہتر سے بہتر نمونہ جو مل سکتا ہے اس سے بھی آپؐ کا نمونہ بڑھ کر تھا جو اس

☆ انکسار کا لفظ اردو محاورہ کی وجہ سے رکھا گیا ہے ورنہ عربی زبان میں انکسار ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کی بجائے تواضع کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

بات کا ثبوت ہے کہ آپ ؐ کوئی نیک بخت بادشاہ نہ تھے بلکہ نبی تھے اور نبیوں کے بھی سردار تھے اور میں ان لوگوں کی کوشش کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں جو آپ ؐ کی لائف میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ آپ ؐ کے افعال کو چند اور بادشاہوں سے مشابہ کر کے دکھاتے ہیں اور اس طرح گویا آپ ؐ پر سے وہ اعتراض مٹانا چاہتے ہیں جو آپ ؐ کے دشمنوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں اس کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک اچھے بادشاہ تھے۔ لیکن ہمارا تو یہ دعویٰ ہے کہ آپ ؐ ایک نبی تھے اور نبیوں کے سردار تھے۔ پس جب تک آپ ؐ کے اخلاق کو دوسرے انسانوں کے اخلاق سے بہتر اور اعلیٰ نہ ثابت کیا جائے ہمارا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے اور صرف بعض شریف بادشاہوں سے آپ ؐ کی مماثلت ثابت کر دینے سے وہ مطلب ہرگز پورا نہیں ہوتا جس کے پورا کرنے کے لئے ہم قلم اٹھاتے ہیں۔ پس میرا آپ ؐ کے مقابلہ میں دیگر امراء کی اَمثلہ پیش کرنا یا ان کی زندگی کی طرف متوجہ کرنا صرف اس غرض کے لئے ہوتا ہے کہ تا بتاؤں کہ اچھے سے اچھے نمونہ کو بھی آپ ؐ کے سامنے لاؤ تبھی وہ آپ ؐ کے آگے چمک نہیں سکتا بلکہ آپ ؐ کے سامنے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نصف النہار کے سورج کے مقابلہ میں شبِ چراغ۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں اس وقت یہ بیان کر رہا تھا کہ گو بعض امراء تکبر سے خالی تو مل سکتے ہیں لیکن منکسر المزاج امراء بہت ہی کم اور شاذ و نادر ہی ملیں تو ملیں لیکن رسول کریم ﷺ ایک بادشاہ ہو کر جس منکسر المزاجی سے رہتے تھے وہ انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ عرب کی سی قوم کا بادشاہ لاکھوں انسانوں کی جان کا مالک بڑوں اور چھوٹوں کے سامنے اس انکسار سے کام لیتا ہوا نظر آتا ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دنیا کے بادشاہوں اور امراء کی زندگی کو دیکھو اور ان کے حالات پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی اپنے سے ادنیٰ آدمی کو سلام کہنا تو درکنار، اس کے سلام کا جواب دینا بھی ان پر دوبھر ہوتا ہے۔ اول تو بہت سے ہوں گے جو معمولی آدمی کے سلام پر سر تک بھی نہ ہلائیں گے تو بعض ایسے ملیں گے جو صرف سر ہلا دینا کافی سمجھیں گے۔ ان سے بھی کم وہ ہوں گے جو سلام کا جواب دے دیں گے اور جو ابتداء میں سلام کریں وہ تو بہت ہی کم ملیں گے کیونکہ جن کی طبیعت میں تکبر نہ ہو وہ اس بات کو پسند نہ کریں گے کہ کوئی غریب آدمی ان کو سلام کہے تو وہ اس کے سلام کا جواب نہ دیں لیکن ابتداءً ایک غریب آدمی کو سلام کہنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھیں گے۔ لیکن رسول کریم ﷺ کی زندگی کے حالات پڑھ کر دیکھو کہ آپ ؐ ہمیشہ سلام کہنے میں سبقت کرتے تھے اور کبھی اس بات کے منتظر نہ رہتے تھے کہ کوئی غریب آدمی آپ کو خود

بڑھ کر سلام کرے بلکہ آپؐ کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ آپؐ ہی پہلے سلام کہیں۔ اس کے متعلق میں اس جگہ ایک ایسے شخص کی گواہی پیش کرتا ہوں جس کو آپؐ کی مدینہ کی زندگی میں برابر دس سال آپؐ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میری مراد حضرت انسؓ سے ہے جن کو رسول کریم ﷺ نے مدینہ تشریف لانے پر ملازم رکھا تھا اور جو آپؐ کی وفات تک برابر آپؐ کی خدمت میں رہے۔ ان کی نسبت امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں:

عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ: اَنَّهٗ مَرَّ عَلٰی صِبْیَانٍ فَسَلَّمَ عَلَیْهِمْ وَ قَالَ: كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ یَفْعَلُهٗ (بخاری کتاب الاستئذان باب التسلیم علی الصبیان)

یعنی حضرت انسؓ ایک دفعہ ایک ایسی جگہ سے گزرے جہاں لڑکے کھیل رہے تھے تو آپؐ نے ان کو سلام کہا اور پھر فرمایا کہ آنحضرت ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے یعنی آپؐ بھی جب لڑکوں کے پاس سے گزرتے تھے۔ تو ان کو سلام کہا کرتے تھے ان واقعات پر سرسری نظر ڈالنے والے انسان کی نظر میں شاید یہ ایک معمولی سی بات ہو لیکن جو شخص کہ ہر ایک بات پر غور کرنے کا عادی ہو وہ اس شہادت سے رسول کریم ﷺ کی منکسرانہ طبیعت کے کمال کو معلوم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ امراء کے لئے اپنے سے چھوٹے آدمی کو پہلے سلام کہنا ایک نہایت سخت مجاہدہ ہے اور ممکن ہے کہ کبھی کبھار کوئی امیر ایسا کر بھی دے لیکن ہمیشہ اس پر قائم رہنا ایک ایسی بات ہے جس کا ثبوت کسی دنیاوی بادشاہ کی زندگی سے نہیں مل سکتا۔ پھر بچوں کو سلام میں ابتداء کرنا تو ایک ایسی بات ہے جس کی بادشاہ تو الگ رہے امراء سے بھی امید کرنا بالکل محال ہے اور امراء کو بھی جانے دو۔ کتنے بالغ وجوان انسان ہیں جو باوجود دنیاوی لحاظ سے معمولی حیثیت رکھنے کے بچوں کو سلام میں ابتداء کرنے کے عادی ہیں اور جب گلیوں میں بچوں کو کھڑا پاتے ہیں تو آگے بڑھ کر ان کو سلام کرتے ہیں۔ شاید ایسا آدمی جو اس پر تعہد سے قائم ہو اور ہمیشہ اس پر عمل کرتا ہو ایک بھی نہ ملے گا لیکن رسول کریم ﷺ کی نسبت حضرت انسؓ جیسے واقف کار صحابی جو ہر وقت آپؐ کے ساتھ رہتے تھے فرماتے ہیں کہ آپؐ جب بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو ان کو سلام کہتے تھے۔ اس شہادت میں آپؐ نے کئی باتوں پر روشنی ڈالی ہے اول یہ کہ آنحضرت ﷺ انکسار کے اس اعلیٰ درجہ پر قدم زن تھے کہ بچوں کو سلام کہنے سے بھی آپؐ کو عار نہ تھا۔ دوم یہ کہ آپؐ ان کو سلام کہنے میں ابتداء کرتے تھے۔ سوم یہ کہ ایک یا دو دفعہ کی بات نہیں آپ ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اب اس شہادت سے ہر ایک شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص بچوں کے ساتھ

اس انکسار کے ساتھ پیش آتا تھا‘ وہ جوانوں کے ساتھ کس انکسار کے ساتھ معاملہ کرتا ہوگا اور اس کا نفس خودی اور تکبر سے کس حد تک پاک ہوگا۔

میں اس امر کی اور بہت سی مثالیں پیش کرتا لیکن چونکہ میں نے اس کتاب میں صرف ان مثالوں سے آپ کی سیرت پر روشنی ڈالنے کا ارادہ کیا ہے جو بخاری میں پائی جاتی ہیں اس لئے اس وقت اسی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

شروع سے ہی آپ کی طبیعت ایسی تھی۔ آپ کی منکسرانہ طبیعت کے متعلق جو مثال میں نے دی ہے شاید اس کے متعلق کوئی شخص کہے کہ گو امراء اس منکسرانہ طبیعت کے نہیں ہوتے لیکن چونکہ علاوہ بادشاہت کے آپ کو نبوت کا بھی دعویٰ تھا اور نبوت کے لئے ضروری ہے کہ انسان ہر قسم کے لوگوں سے تعلق رکھے اس لئے ممکن ہے کہ نعوذ باللہ آپ تکلف سے ایسا کرتے ہوں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک یہ اعتراض درست ہے لیکن رسول کریم ﷺ پر نہیں پڑ سکتا اور اس کی یہ وجہ ہے کہ تکلف کی بات ہمیشہ عارضی ہوتی ہے تکلف سے انسان جو کام کرتا ہے اس پر سے کسی نہ کسی وقت پردہ اٹھ جاتا ہے لیکن جیسا کہ پہلی مثال سے ثابت ہے۔ آنحضرت ﷺ ہمیشہ ایک ہی بات پر قائم رہے اور ایک شخص‘ جو دس سال رات دن برابر آپ کے ساتھ رہا‘ گواہی دیتا ہے کہ ہمیشہ منکسرانہ معاملہ کرتے تھے تو اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی لیکن اس مثال کے علاوہ ایک اور مثال بھی بخاری سے معلوم ہوتی ہے جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ کی منکسرانہ طبیعت ان اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا نتیجہ تھی جن پر آپ قائم تھے نہ کہ بناوٹ کا جیسا کہ آپ کے دشمن کہتے ہیں اور وہ ایک ایسے وقت کی بات ہے جبکہ آپ نے ابھی دعویٰ بھی نہ کیا تھا۔ پس اس وقت بھی آپ کا انتہاء درجہ کا منکسر المزاج ہونا ثابت کرتا ہے کہ آپ کے تمام کام اس دلی پاکیزگی کا نتیجہ تھے جس نے آپ کو کسی زمانہ میں بھی نہیں چھوڑا۔

عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنَّهَا قَالَتْ: اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ اَنْ يَنْزِعَ اِلٰى اَهْلِهٖ وَيَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى خَدِيْجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِيْ غَارِ حِرَاءٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ: اِقْرَأْ قَالَ: مَا اَنَا بِقَارِئٍ قَالَ: فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ:

اِقْرَأْ ' قُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ' فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِی الثَّانِیَۃَ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجَھْدَ' ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ' فَقَالَ: اِقْرَأْ ' فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ' فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِی الثَّالِثَۃَ' ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ' فَقَالَ: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ' خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ' اِقْرَأْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ' فَرَجَعَ بِھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَرْجُفُ فُؤَادُہٗ' فَدَخَلَ عَلٰی خَدِیْجَۃَ بِنْتِ خُوَیْلِدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا فَقَالَ: زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ فَزَمَّلُوْہُ حَتّٰی ذَھَبَ عَنْہُ الرَّوْعُ' فَقَالَ لِخَدِیْجَۃَ' وَاَخْبَرَھَا الْخَبَرَ : لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ فَقَالَتْ خَدِیْجَۃُ: کَلَّا وَاللّٰہِ مَا یُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا' اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ' وَتَحْمِلُ الْکَلَّ' وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ' وَتَقْرِی الضَّیْفَ' وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ'

فَانْطَلَقَتْ بِہٖ خَدِیْجَۃُ حَتّٰی اَتَتْ بِہٖ وَرَقَۃَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ اَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰی' اِبْنَ عَمِّ خَدِیْجَۃَ' وَکَانَ اِمْرَأً تَنَصَّرَ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ' وَکَانَ یَکْتُبُ الْکِتَابَ الْعِبْرَانِیَّ' فَیَکْتُبُ مِنَ الْاِنْجِیْلِ بِالْعِبْرَانِیَّۃِ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ یَّکْتُبَ' وَکَانَ شَیْخًا کَبِیْرًا قَدْ عَمِیَ' فَقَالَتْ لَہٗ خَدِیْجَۃُ: یَابْنَ عَمِّ' اِسْمَعْ مِنِ ابْنِ اَخِیْکَ ' فَقَالَ لَہٗ وَرَقَۃُ: یَابْنَ اَخِیْ مَاذَا تَرٰی؟ فَاَخْبَرَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَاٰی' فَقَالَ لَہٗ وَرَقَۃُ: ھٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِیْ نَزَّلَ اللّٰہُ عَلٰی مُوْسٰی' یَالَیْتَنِیْ فِیْھَا جَذَعًا' لَیْتَنِیْ اَکُوْنُ حَیًّا اِذْ یُخْرِجُکَ قَوْمُکَ ' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَوَ مُخْرِجِیَّ ھُمْ قَالَ: نَعَمْ' لَمْ یَاْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِہٖ اِلَّا عُوْدِیَ' وَاِنْ یُّدْرِکْنِیْ یَوْمُکَ اَنْصُرْکَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا' ثُمَّ لَمْ یَنْشَبْ وَرَقَۃُ اَنْ تُوُفِّیَ' وَفَتَرَ الْوَحْیُ (بخاری باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ شروع شروع میں رسول کریم ﷺ کو سچی خوابیں آنی شروع ہوئی تھیں۔ آپؐ جو خواب دیکھتے وہ اپنے وقت پر اس طرح ظاہر اپوری ہوتی جیسے پو پھوٹتی ہے۔ اس کے بعد آپ کے دل میں علیحدگی کی محبت ڈالی گئی پس آپؐ غار حراء میں جاکر علیحدہ بیٹھا کرتے تھے اور کچھ راتیں رہ کر وہاں عبادت کیا کرتے تھے (ایک خدا کی۔ کیونکہ نبوت سے پہلے بھی آپؐ نے کبھی شرک نہیں کیا) اور پھر گھر کی طرف واپس تشریف لاتے تھے اور پھر اس کام کے لئے کھانا وغیرہ لے جاتے یہاں تک کہ آپؐ کے پاس حق آگیا (یعنی وحی نازل ہوئی) اور آپؐ اس وقت غار حراء میں ہی تھے آپؐ کے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا کہ پڑھ! آپ نے جواباً فرمایا کہ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ آپ فرماتے تھے کہ اس پر فرشتہ نے مجھے پکڑ لیا اور اپنے ساتھ چمٹالیا اور اس قدر

بھینچا کہ طاقت برداشت نہ رہی پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھ! میں نے کہا کہ میں تو پڑھنا نہیں جانتا اس پر اس نے پھر مجھے پکڑا اور اپنے ساتھ چمٹا کر زور سے بھینچا حتّٰی کہ طاقت برداشت نہ رہی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھ!

یہ آیات لے کر (یعنی یاد کرکے) رسول کریم ﷺ واپس تشریف لے آئے اور آپؐ کا دل دھڑک رہا تھا- وہاں سے آکر آپؐ سیدھے حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے کپڑا اوڑھاؤ! اس پر آپؐ کے اوپر کپڑا ڈال دیا گیا اور آپؐ لیٹے رہے یہاں تک کہ خوف جاتا رہا- پھر حضرت خدیجہؓ کو تمام قصہ سنایا اور فرمایا کہ میں تو اپنی جان پر ڈرتا ہوں (یعنی مجھے خوف ہے کہ مجھ سے کیا معاملہ ہونے لگا ہے) اس پر حضرت خدیجہؓ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں- خدا تجھے کبھی ذلیل نہیں کرے گا کیونکہ تو رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرتا اور کمزوروں کا بوجھ اٹھاتا ہے اور تمام وہ نیک اخلاق جو دنیا سے معدوم ہو چکے ہیں ان پر عامل ہے اور مہمان کی اچھی طرح سے خاطر کرتا ہے اور سچی مصیبتوں میں لوگوں کی مدد کرتا ہے یہ کہہ کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کو ساتھ لیا اور ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ جو حضرت خدیجہؓ کے چچا کے بیٹے یعنی چچا زاد بھائی تھے 'ان کے پاس پہنچیں جو جاہلیت کے زمانہ میں مسیحی مذہب اختیار کر چکے تھے اور عبرانی میں انجیل کے بعض حصص 'جن کی اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دیتا' لکھا کرتے تھے (یعنی اپنی جوانی میں) اور اس وقت وہ بوجہ بڑھاپے کے اندھے ہو چکے تھے- حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے! اپنے بھائی کے بیٹے کی بات سن- ورقہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اے میرے بھائی کے بیٹے! کیا بات ہے- آپؐ نے جو کچھ گزرا تھا آپ کے سامنے دہرایا- اس پر ورقہ نے کہا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر نازل فرمایا تھا- اے کاش- میں اس وقت جوان ہوتا- اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب تیری قوم تجھے نکال دے گی اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! کوئی شخص اس تعلیم کے ساتھ نہیں آیا جس کے ساتھ تُو آیا ہے مگر لوگوں نے اس سے دشمنی کی ہے اور اگر مجھے تیرا زمانہ ملا (یعنی جس وقت تیری تعلیم کا اعلان ہوگا اور لوگ مخالفت کریں گے ورنہ نبی تو آپؐ اسی دن سے ہو گئے تھے اور وحی قرآن نازل ہونی شروع ہو گئی تھی) تو میں تیری بڑی مدد کروں گا- پھر کچھ ہی دنوں کے بعد ورقہ فوت ہو گئے اور وحی ایک عرصہ کے لئے بند ہو گئی-

ممکن ہے اس حدیث کے یہاں نقل کرنے پر بعض لوگوں کو تعجب ہؤا ہو کہ اس حدیث کے

اس جگہ نقل کرنے سے کیا مطلب ہے اور اس سے آنحضرت ﷺ کے انکسار کا کیا پتہ چلتا ہے لیکن جیسا کہ 'میں انشاء اللہ' ابھی بتاؤں گا- یہ حدیث آپ کی منکسرانہ طبیعت پر تیز روشنی ڈالتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکسار سے آپؐ کا دل معمور تھا اور کسی زمانہ میں بھی آپؐ سے یہ خلق نیک جدا نہیں ہؤا- انکسار کے ساتھ کام کرنا دلالت کرتا ہے کہ یہ صفت کس شان کے ساتھ آپؐ کے اندر تھی ورنہ بعض لوگ صرف سستی کی وجہ سے انکسار کرتے ہیں-

اس حدیث سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے سامنے جو فرشتہ آیا اس نے آپؐ سے کہا کہ پڑھ اور آپؐ نے اس کے جواب میں کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا- اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ کا اس انکار سے کیا مطلب تھا آیا یہ کہ آپؐ تحریر پڑھنا نہیں جانتے یا یہ کہ عربی زبان کا دہرانا بھی نہیں جانتے- کیونکہ قراءت کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے- ایک معنے اس کے کسی تحریر کو پڑھنے کے ہیں اور دوسرے معنی کسی مقررہ عبارت کو اپنی زبان سے دہرانے کے ہیں چنانچہ جب کوئی شخص کسی کتاب کو پڑھے تو اس کی نسبت بھی کہیں گے کہ یَقْرَأُ الْکِتَابَ اور جب وہ کسی عبارت کو دہرائے گا تو اسے بھی کہیں گے کہ یَقْرَأُ وہ پڑھتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کو حفظ پڑھنا بھی قراءت کہلاتا ہے- پس اب سوال یہ ہے کہ آیا رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا تو اس سے کیا مراد ہے- آیا یہ کہ آپؐ تحریر نہیں پڑھ سکتے یا یہ کہ آپؐ کسی عبارت کو جو عربی زبان میں ہو دہرا بھی نہیں سکتے- اگر یہ ثابت ہو کہ آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ تحریر نہیں پڑھ سکتے تب تو بات صاف ہے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ آپؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن یہ مطلب رسول کریم ﷺ کا نہیں ہو سکتا کیونکہ صحیح احادیث سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ کے سامنے اس فرشتہ نے کوئی تحریر رکھی تھی اور کہا تھا کہ اسے پڑھو تا آپؐ جواب دیتے کہ میں پڑھنا نہیں جانتا بلکہ جو کچھ صحیح اور مرفوع احادیث سے ثابت ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ایک فرشتہ آپؐ کے سامنے آیا اور اس نے آکر آپؐ سے کہا کہ آپؐ پڑھیں اور کوئی تحریر آپؐ کے سامنے پیش نہیں کی- چنانچہ بخاری کی جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے اس سے بھی یہی ثابت ہے کہ اس فرشتہ نے آپؐ کے سامنے کوئی تحریر نہیں رکھی بلکہ صرف ہوشیار کرنے کے لئے کہا ہے کہ پڑھ! جیسا کہ جب کسی شخص سے کوئی الفاظ کہلوانے ہوں تو کہلوانے والا عام طور پر کہہ دیا کرتا ہے کہ کہو- پس اس فرشتہ نے بھی یہی آپؐ سے کہا تھا کہ دہراؤ یعنی جو لفظ میں کہتا ہوں ان کو دہراتے جاؤ- چنانچہ تیسری دفعہ فرشتہ نے منہ سے ہی الفاظ کہے نہ کہ کوئی تحریر رکھی- اگر پڑھوانا

مد نظر ہوتا اور اس فرشتہ کا آپؐ کو گھونٹنا اس لئے ہوتا کہ آپ کو تحریر پڑھنا آجائے تو ایسا ہونا چاہیئے تھا کہ وہ آخری دفعہ آپؐ کے سامنے تحریر رکھ دیتا اور آپؐ گو پہلے پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن معجزانہ طور پر پڑھنے لگ جاتے لیکن آخری دفعہ فرشتہ کا منہ سے الفاظ کہہ کر آپؐ کو دہرانے کے لئے کہنا صاف ثابت کرتا ہے کہ اس وقت آپؐ کے سامنے کوئی تحریر نہ رکھی گئی تھی بلکہ صرف زبانی آپؐ سے ایک عبارت دہرانے کو کہا گیا تھا اور یہ استدلال جو ہم نے کیا ہے اس کے خلاف عبید بن عمیر کی روایت نہیں پیش کی جا سکتی جس میں لکھا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے جبریلؑ نے ایک تحریر رکھی تھی جو دیباج پر لکھی ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک تو یہ حدیث اس پائے کی نہیں جس پائے کی حدیث بخاری کی ہے پھر یہ مرسل حدیث ہے اس لئے اس روایت کے مقابلہ میں، جو اوپر نقل کی گئی ہے، نہیں رکھی جا سکتی۔ سوم۔ خود عبید بن عمیر کی اپنی روایت میں اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ بیان کرتے ہیں کہ جب جبریلؑ نے آپؐ سے کہا کہ پڑھیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ میں کیا پڑھوں؟ اور یہ فقرہ کہ میں کیا پڑھوں صاف ثابت کرتا ہے کہ آپؐ کے سامنے کوئی تحریر نہ تھی اگر تحریر ہوتی تو آپؐ 'کیا پڑھوں' کا جملہ کیونکر استعمال فرما سکتے تھے۔ غرض حق یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے اس فرشتہ نے کوئی تحریر پڑھنے کو نہیں کہا بلکہ یہی کہا کہ آپؐ کہیں (یعنی جو کچھ میں کہوں) اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ میں تو قراءت نہیں جانتا لیکن اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جبکہ آپؐ سے صرف عربی کے بعض فقرات دہرانے کو کہا گیا تھا تو آپؐ نے کیوں فرمایا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا حالانکہ یہ کام آپؐ آسانی سے کر سکتے تھے آپؐ کی مادری زبان عربی تھی اور آپؐ اس زبان میں کلام کیا کرتے تھے۔ پھر آپؐ نے یہ کیوں فرمایا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا اور نہ آپؐ عربی کے کلمات کے دہرانے سے عاجز تھے کہ کہا جائے کہ آپؐ نے اس بات سے بھی انکار کیا بلکہ اصل بات یہی ہے کہ آپؐ نے فرشتہ کو دیکھتے ہی خوب سمجھ لیا تھا کہ یہ کس غرض کے لئے آیا ہے کیونکہ قبل از وقت آپؐ کو رویائے صالحہ کے ذریعہ اس کام کے لئے تیار کر دیا گیا تھا۔ اور پھر ایک علیحدہ جگہ میں یک لخت ایک شخص کا نمودار ہونا صاف ظاہر کرتا تھا کہ یہ کوئی انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے پس آپؐ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے اور مجھے کوئی کام سپرد کرنے آیا ہے اور آپؐ نے خدا تعالیٰ کی عظمت کی طرف نگاہ کر کے اپنی جبین نیاز خدا تعالیٰ کے آگے جھکا دی اور عرض کیا کہ جو کچھ مجھے پڑھایا جانے لگا ہے میں تو اس لائق نہیں اور یہ جو کچھ آپؐ نے فرمایا بالکل درست اور بجا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہی کلمہ کہنا بجا تھا اور آپؐ

نے اس کے فرشتہ کو یہی جواب دیا کہ اس بادشاہ کی خدمت کے میں کہاں لائق تھا۔ شاید کوئی شخص کہے کہ یہ تو جھوٹ تھا آپؐ تو لائق تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض نادانی کے باعث ہے جو لوگ جس قدر خدا تعالیٰ کے قریب ہوتے ہیں اسی قدر اس سے خائف ہوتے ہیں اور اس کے جلال سے ڈرتے ہیں۔

بے شک رسول کریم ﷺ سب سے زیادہ اس کام کے لائق تھے۔ لیکن ان کا دل سب انسانوں سے زیادہ خدا تعالیٰ کے خوف سے پُر تھا پس انہوں نے خدا تعالیٰ کے جلال کو دیکھتے ہوئے عذر کیا کہ میں تو اس کام کے لائق نہیں۔ اگر آپؐ اپنے آپؐ کو سب سے لائق سمجھتے ہوئے ایسا کہتے تب بے شک آپ پر الزام آسکتا تھا بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے جبروت اور جلال پر نظر کرتے ہوئے واقعہ میں اپنے آپؐ کو اس کی امانت کے اٹھانے کے قابل خیال نہ کرتے تھے اور یہ بات آپؐ کے درجہ کی بلندی پر دلالت کرتی ہے کہ آپؐ باوجود عظیم الشان طاقتوں کے مالک ہونے کے خدا تعالیٰ کے جلال پر ایسے فدا تھے کہ آپؐ نے اپنے نفس کی خوبیوں کو کبھی دیکھا ہی نہیں اور اسی کے جلال کے مطالعہ میں لگے رہے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی انکسار کی کوئی اور مثال دنیا میں موجود ہے؟ موسیٰؑ کی ایک مثال قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہے لیکن آپؐ کے مقابلہ میں وہ بھی کچھ نہیں کیونکہ گو حضرت موسیٰؑ نے اپنے آپ کو اس قابل نہ سمجھا اور نبوت کے بوجھ اٹھانے سے انکار کیا لیکن اپنے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔ پس انہوں نے اپنی دانست میں ایک آدمی کو اس قابل خیال کیا کہ وہ اس بوجھ کو اٹھالے گا لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنی نسبت عجیب پیرایہ میں عذر کیا اور کسی کو پیش نہیں کیا جو آپؐ کے عظیم قرب پر دلالت کرتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ آپ حضرت موسیٰؑ سے شان میں افضل تھے کہ آپؐ نے اس امانت کے اٹھانے کے لئے کسی انسان پر نظر نہیں کی بلکہ صرف اپنی کمزوری کا اقرار کر کے خدا تعالیٰ کے انتخاب پر صاد کیا۔ غرض آپؐ کا نبوت کے ملنے سے بھی پہلے یہ انکسار کا نمونہ دکھانا ثابت کرتا ہے کہ آپؐ کی طبیعت میں ہی انکسار داخل تھا۔ اور نادان ہے وہ جو خیال کرے کہ آپؐ نے نبوّت کے ساتھ اس رنگ کو اختیار کیا۔ اس جگہ ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ انکسار جیسا کہ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے اس کا نام نہیں کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو لائق سمجھتے ہوئے کہے کہ میں تو یہ کام نہیں کر سکتا۔ یہ تو جھوٹ ہے اور جھوٹ کبھی اچھی صفت نہیں ہو سکتی۔ انکسار درحقیقت ایثار کی ایک قسم ہے جو ایک تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ انکسار نام پاتی ہے اور منکسر المزاج نہ اس شخص کو کہیں گے جو نالائق

ہو کر اپنی نالائقی کا اقرار کرے اور نہ اسے کہیں گے جو اپنے آپ کو لائق سمجھ کر اپنے نالائق ہونے کا اعلان کرے بلکہ منکسر المزاج وہ شخص ہے جو لائق اور صاحب فضیلت ہو کر دوسروں کی خوبیوں پر لیاقت اور فضیلت کے مطالعہ میں ایسا مشغول ہو کہ اپنی لیاقت اور فضیلت اس کی نظروں سے پوشیدہ ہو جائے اور ہر موقعہ پر دوسروں کی لیاقت اور فضیلت اس کے سامنے آجائے اور یہ صفت اس لئے اچھی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے حضور میں تو یہ ادب کا صحیح طریق ہے اور بندوں میں اس کے ذریعہ سے فساد مٹ جاتے ہیں کیونکہ تمام فساد تکبر یا عدم انکسار سے پیدا ہوتے ہیں۔ تکبر جب لوگوں میں پھیل جائے تب تو بہت ہی فساد ہو گا کیونکہ ہر ایک شخص کہے گا میں دوسروں سے بڑا ہو جاؤں لیکن اگر تکبر نہ ہو اور انکسار بھی نہ ہو تب بھی فساد ہو جائے گا کیونکہ اکثر جھگڑے اسی وقت ہوتے ہیں جبکہ طرفین میں ہر ایک شخص اپنے حق پر اڑا رہے اگر ایک ان میں سے اپنے حق کو ترک کر دے تو پھر سب جھگڑے بند ہو جائیں۔ پس انکسار دنیا کے امن و امان کے بڑھانے میں ایک زبردست آلہ ہے اور ایثار کے ساتھ مل کر فساد کو بیخ و بُن سے اکھیڑ دیتا ہے ورنہ جھوٹ بولنا انکسار نہیں کہلاتا جیسا کہ ان دنوں عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور نہ انکسار اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص سستی اور غفلت کی وجہ سے کام سے جی چرائے۔ بعض لوگ جنہیں کام کی عادت نہیں ہوتی سستی سے ان کا پالا پڑا ہوا ہوتا ہے وہ انکسار کے پردہ میں اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں لیکن اس کا نام انکسار نہیں وہ غفلت اور سستی ہے منکسر المزاج وہی شخص ہے کہ وہ کام کی اہلیت رکھتے ہوئے پھر خدا تعالیٰ کے جلال پر نظر کرتے ہوئے اپنی کمزوری کا مقر ہو لیکن جب اس کے کام سپرد ہو تو پوری ہمت سے اس کام کو کرے جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے کیا کہ باوجود اس انکسار کے جب آپؐ کے سپرد اصلاح عالم کا کام کر دیا گیا تو وہی شخص جو "میں پڑھنا نہیں جانتا" کہہ کر اپنی کمزوری کا اقرار کر رہا تھا۔ رات اور دن اس تندہی سے اس کام کے بجالانے میں لگ گیا کہ دنیا دنگ ہو گئی اور کوئی انسان اس قدر کام کرنے والا نظر نہیں آتا جس قدر کہ آنحضرت ﷺ نے کیا۔ پس آپؐ کا انکسار سچا انکسار تھا۔ کیونکہ باوجود لیاقت رکھنے کے آپؐ نے خدا کے جلال کا ایسا مطالعہ کیا کہ اپنی لیاقت کو بھلا دیا اور اللہ تعالیٰ کے نور کو اس طرح دیکھا کہ معلوم کر لیا کہ میری روشنی درحقیقت اس نور کا سایہ ہے۔

غرض آپؐ کے اس جواب سے کہ "میں پڑھنا نہیں جانتا" صاف ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ ہمیشہ سے انکسار میں کمال رکھتے تھے اور گو فرشتہ کا آپؐ کو بار بار چمٹا لینا ایک یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ اس

ذریعہ سے آپؐ کو اپنے کمالات پر واقف کیا جاتا تھا لیکن میرے نزدیک تو اس کا ایک یہ بھی مطلب تھا کہ جب فرشتہ نے آپ کو اس بات کی خبر دی کہ دنیا کو خدا کا کلام سنانے پر آپؐ مامور کئے گئے ہیں تو اس نے دیکھا کہ بجائے اس کے کہ یہ شخص خوشی سے اچھل پڑے اور خود اس پیغام کو لے کر چل پڑے اور لوگوں کو فخریہ سنائے کہ خدا تعالیٰ نے یہ کام میرے سپرد کیا ہے۔ اس نے تو وہ رنگ انکسار اختیار کیا ہے جو کسی انسان نے اس سے پہلے اختیار نہ کیا تھا تو اس کا دل محبت کے جوش سے بھر گیا اور بے اختیار ہو کر اس نے آپؐ کو اپنے ساتھ چمٹا لیا جو اور محبت کی لہر کا ایک ظہور تھا جو اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی اور جب آپؐ کو گلے لگا کر اس نے چھوڑا اور پھر وہی پیغام دیا اور پھر وہی جواب سنا تو محبت کی آگ نے ایک اور شعلہ مارا اور پھر اس نے آپؐ کو گلے لگا لیا اور اسی طرح تیسری دفعہ کیا اور تیسری دفعہ کے بعد آپؐ کے سامنے وحی الٰہی کے الفاظ پڑھے کہ اب تو آپؐ جو کچھ بھی کہیں یہ خدا کی امانت آپ کے سپرد ہو گئی ہے اور آپؐ نے بلا چوں و چرا اسے قبول کیا۔ لیکن آپؐ کے انکسار کو دیکھو کہ اب بھی تسلّی نہیں ہوئی اس قدر اصرار سے حکم ملتا ہے لیکن بھاگے بھاگے حضرت خدیجہؓ کے پاس جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی جان پر ڈر آتا ہے۔ اے نبیوں کے سردار! اے انسانی کمالات کے جامع! اے بنی نوع انسان کے لئے ایک ہی رہنما! تجھ پر میری جان قربان ہو۔ تو اب بھی اپنے کمالات سے آنکھیں بند کرتا ہے اور یہی خیال کرتا ہے کہ میں اس قابل کہاں جو اس وَحْدَہٗ لَا شَرِیْک کے پیغام کا اٹھانے والا بنوں۔ فرشتہ تاکید پر تاکید کرتا ہے اور پیغام الٰہی آپؐ تک پہنچاتا ہے لیکن باوجود اس کے آپؐ ابھی تک اپنے حُسن سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں اور بار بار یہی فرماتے ہیں کہ میں اس قابل کہاں حتّٰی کہ گھر آکر اپنی غمگسار حضرت خدیجہؓ سے فرماتے ہیں کہ میں اپنی جان پر خائف ہوں۔

چونکہ یہ فقرہ بھی اپنے اندر ایک حکمت رکھتا ہے اس لئے اس کے سمجھانے کے لئے بھی تشریح کی ضرورت ہے۔ الہام انسان کو دو طرح ہوتے ہیں۔ کبھی ترقی کے لئے کبھی حجت کے لئے۔ یعنی کبھی تو خدا تعالیٰ انسان کو اس کے درجہ کے بلند کرنے کے لئے مخاطب فرماتا ہے اور کبھی اس پر حجت قائم کرنے کے لئے چنانچہ بہت سے لوگ جو خدا تعالیٰ کے حضور میں خاص قرب نہیں رکھتے ان کو بھی الہام ہو جاتے ہیں اور وہ نادانی سے اس پر اِترا جاتے ہیں حالانکہ وہ ان کے لئے آزمائش اور ان پر حجت ہوتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے ان الہامات سے فائدہ اٹھانے کے وہ فخر و تکبر میں پڑ جاتے ہیں اور آخر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ بھی چونکہ تواضع

کے عالی مقام پر پہنچے تھے۔ جب آپؐ کو الہام ہؤا تو آپؐ گھبرائے کہ ایسا نہ ہو کہ یہ کلام مجھ پر بطور آزمائش اور حجت نازل ہؤا ہو اور یہ اپنا خوف حضرت خدیجہؓ کے آگے بیان فرمایا جس پر انہوں نے آپؐ کو تسلی دلائی اور بتایا کہ جو اخلاق آپؐ کے ہیں اور جس مقام پر آپؐ ہیں کیا ایسے لوگوں کو بھی خدا تعالیٰ ضائع کرتا ہے اور اپنا یقین ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے قسم کھائی کہ تیرے جیسے کاموں والا انسان کبھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ حجت اور آزمائش کے لئے تو ان کے الہام ہو سکتے ہیں جن کے اعمال میں کمزوری ہو یا متکبر ہوں۔ جو شخص آپ جیسا غریبوں کا خبر گیر اور اخلاق حسنہ کا ظاہر کرنے والا ہے کیا ان کو اللہ تعالیٰ تباہ کر سکتا ہے۔ غرض حضرت خدیجہؓ کا جواب ظاہر کر رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ میں اپنی جان پر ڈرتا ہوں۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ مجھے خوف ہے کہ میری آزمائش نہ ہو جس پر انہوں نے تسلی دی کہ آپؐ آزمائش کے مقام سے بالا ہیں۔ آپؐ پر یہ الہامات خدا تعالیٰ کے انعامات کے طور پر نازل ہوئے ہیں چنانچہ آئندہ کی وحی نے آپؐ پر روز روشن کی طرح کھول دیا کہ آپؐ خدا تعالیٰ کے مقبول تھے اور آپ نے اپنے طریق عمل سے بتا دیا کہ آپؐ کا کہنا کہ "میں کہاں اس الہام کا سنانے والا ہو سکتا ہوں صرف تواضع کے طور پر تھا نہ کہ بوجہ سستی اور ڈر کے کیونکہ جس جرأت اور زور سے آپؐ نے کام کیا اس کی نظیر کسی نبی میں بھی نہیں تھی۔

طہارۃ النفّس۔ سخت کلامی سے پرہیز

کسی کو گالی دینے یا برا کہنے سے اس انسان کا تو کچھ نہیں بگڑتا لیکن پھر بھی انسان بالطبع اپنے دشمن کے خلاف سخت الفاظ استعمال کرتا ہے اور ابتدائے عالم سے یہ مرض بنی نوع انسان میں چلی آئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گالی دینا ایک لغو کام ہے۔ سخت کلامی کرنا ایک فضول حرکت ہے مگر اس کے لغو اور فضول ہونے کے باوجود گالی دینے والے گالیاں دیتے ہیں اور سخت کلامی کرنے والے سخت کلامی کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کو جب غصہ یا جوش آئے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا اظہار کرے اور بہت دفعہ جب اس کے غصہ کی کوئی انتہاء نہیں رہتی اور جوش سے اس کی عقل ماری جاتی ہے تو وہ عام الفاظ میں اپنے غصہ کا اظہار نہیں کر سکتا اور جب دیکھتا ہے کہ الفاظ میں میرے غصہ کا اظہار نہیں ہو سکتا تو پھر ایسے الفاظ بولتا ہے کہ جو گو اس غصہ کے اظہار کرنے والے نہ ہوں لیکن ان سے یہ ثابت ہو کہ اس شخص کو سخت طیش ہے چنانچہ اس لئے سخت طیش میں تمام برائیوں کو انسان اپنے دشمن یا دکھ دینے والے کی طرف منسوب کرتا ہے حالانکہ وہ سب برائیاں

اس کی طرف منسوب نہیں ہو سکتیں لیکن اصل منشا گالی سے کمال طیش کا اظہار ہوتا ہے گویا گالی دینا بھی ایک قسم کا مجاز ہوتا ہے جس کے ذریعہ انتہاء غضب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جو لوگ نہایت غصیلے ہوتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر ان کا نفس جوش میں آجاتا ہے وہ گالیاں بھی زیادہ دیتے ہیں اور جو لوگ جس قدر اپنے نفس پر قابو رکھتے ہیں اسی قدر گالیوں سے بچتے ہیں کیونکہ ان کو اس قدر غصہ نہیں آتا کہ جس کو وہ عام الفاظ میں ادا نہ کر سکیں اور اگر آئے بھی تب بھی وہ اپنے نفس کو جھوٹ سے محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ گالیاں در حقیقت ایک کمزوری ہے اور سخت طیش کے وقت انسان سے اس کا ظہور ہوتا ہے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ صرف گالی دینے والے کے لئے ان خیالات کا اس سے پتہ چلتا ہے جو وہ اس کے متعلق رکھتا ہے جسے گالی دیتا ہے۔ غرض گالی دینے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہاں ایک پر غضب طبیعت کے جوش کا اظہار اس سے ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اکثر لوگ غضب میں گالیاں دیتے ہیں چنانچہ بعض لوگ جو عام طور پر نرم طبیعت رکھتے ہیں جب ان کو بھی غصہ آجائے تو اپنے مخالف کے حق میں گالی دے دیتے ہیں اور جب کسی شخص سے سخت تکلیف پہنچے تب تو بڑے بڑے صابروں کے منہ سے بھی گالی نکل جاتی ہے چنانچہ مسیح ناصریؑ جیسا صابر انسان جس کی زندگی اس کے صبر اور اس کی استقامت پر دلالت کرتی ہے اور جس نے اپنے دشمنوں سے بڑی بڑی سخت مصیبتیں برداشت کر کے بھی ان کے حق میں کوئی سخت کلمہ نہیں کہا۔ اسے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک موقعہ پر جب اس کے دشمنوں کی شرارت حد کو پہنچ گئی اور حملہ پر حملہ انہوں نے اس پر کیا تو آخر تنگ آکر ایک دن اسے بھی اپنے دشمنوں کے حق میں کہنا پڑا کہ سانپوں کے بچے مجھ سے معجزہ طلب کرتے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ وہ لوگ جو حضرت مسیحؑ کے مخالف تھے وہ انسانوں کے بچے تھے لیکن ان کی شرارتوں نے حضرت مسیحؑ کو اس قدر دق کیا کہ آخر تنگ آکر ان الفاظ میں انہیں اپنے غصہ کا اظہار کرنا پڑا۔ اسی طرح ایک دفعہ اپنے حواریوں سے جو ایک دفعہ ان کو سخت تکلیف پہنچی تو اپنے ایک حواری کو انہوں نے شیطان کے لفظ سے یاد کیا حالانکہ وہ وہی حواری تھا جسے انہوں نے خود اپنے بعد خلیفہ مقرر کیا تھا۔ غرض حضرت مسیحؑ کی مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کبھی بڑے سے بڑا صابر انسان بھی دشمن کی شرارت سے تنگ آکر ایسی گالی دے بیٹھتا ہے۔ لیکن ہمارے آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وہ شان عطا فرمائی تھی کہ آپؐ کی زبان پر کبھی گالی نہیں آئی حالانکہ جو مخالفت آپؐ کی ہوئی اور جو تکلیف آپؐ کے دشمنوں نے آپؐ کو دی وہ اس حد کی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کسی انسان کی تکلیف نہیں پیش کی جا سکتی

لیکن باوجود اس کے کہ آپؐ کے مخالفوں نے ہر طرح سے آپؐ کو دق کیا اور تئیس سال متواتر بلا وجہ آپؐ کو دکھ دیتے رہے اور ان کے ہاتھ روکنے والا بھی کوئی نہ تھا اور حضرت مسیحؑ کے زمانہ کی طرح کوئی حکومت نہ تھی جس کے قانون سے ڈر کر اہل مکہ رسول کریم ﷺ کو ستانے میں کوئی کمی کرتے اور وہ قوم بھی حضرت مسیحؑ کی قوم سے زیادہ سخت تھی لیکن باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے منہ پر کبھی گالی نہیں آئی۔

ایک دو دن کی تکلیف ہو تو تب بھی کوئی بات تھی۔ سب کہہ سکتے تھے کہ آپؐ نے جبر کر کے اپنے آپؐ کو روکے رکھا۔ ایک دو ماہ کی بات ہوتی تب بھی کہہ سکتے تھے کہ تکلیف اٹھا کر خاموش رہے ایک دو سال کا معاملہ ہو تب بھی خیال ہو سکتا تھا کہ اپنے نفس کو مار کر اپنی زبان کو بند رکھا لیکن تئیس سال کا لمبا عرصہ جو تکالیف و مصائب سے پر تھا ایک ایسا عرصہ ہے کہ اس عرصہ میں کسی انسان کا ان تکالیف کو برداشت کرتے ہوئے اور ان عداوتوں کو دیکھتے ہوئے جو آنحضرت ﷺ کو دیکھنی اور برداشت کرنی پڑیں ہر قسم کی سخت کلامی سے پرہیز کرنا اور کبھی فحش گوئی کی طرف مائل نہ ہونا دلالت کرتا ہے کہ وہ انسان کوئی عجیب انسان تھا اور نہ صرف عام انسانوں سے برتر تھا بلکہ دوسرے نبیوں پر بھی فضیلت رکھتا تھا۔ کیونکہ جہاں اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا وہاں دوسرے نبی بھی نہ رکھ سکے۔ مجھے اپنے اس بیان کے لئے کسی ایک واقعہ سے استدلال کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس معاملہ میں ایک ایسے شخص کی شہادت موجود ہے جو دس سال متواتر آپؐ کے ساتھ رہا اور یہ حضرت انسؓ ہیں وہ فرماتے ہیں کہ لَمْ یَکُنْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاحِشًا وَ لَا لَعَّانًا وَ لَا سَبَّابًا کَانَ یَقُوْلُ عِنْدَ الْمَعْتَبَۃِ: مَالَہٗ تَرِبَ جَبِیْنُہٗ (بخاری کتاب الادب باب ما ینھی من السباب و اللعن) یعنی رسول کریم ﷺ نہ تو گالی دینے کے عادی تھے، نہ فحش کلام کے عادی تھے، نہ لعنت کیا کرتے تھے، جب آپؐ کو ہم میں سے کسی پر غصہ آتا تو آپؐ صرف اس قدر فرما دیا کرتے تھے کہ اسے کیا ہؤا ہے اس کے ماتھے پر مٹی لگے۔ یہ گواہی ایک ایسے شخص کی گواہی ہے جو کہ آپؐ کے ساتھ آپؐ کی عمر کے آخری حصہ میں جس میں سے پہلا حصہ آپؐ کی تکلیف کے زمانہ میں سے سب سے سخت زمانہ تھا رہا ہے اور پھر آپؐ کی عمر کا وہ حصہ ہے جبکہ ایام جوانی گزر کر بڑھاپا آگیا تھا اور بڑھاپے میں عام طور پر انسان کی طبیعت چڑچڑی ہو جاتی ہے لیکن باوجود اس کے وہ گواہی دیتا ہے کہ اس دس سال کے تجربہ سے اسے معلوم ہؤا ہے کہ آپؐ نہ تو کبھی کسی کو گالی دیتے نہ کبھی آپؐ کے منہ سے کوئی فحش کلمہ نکلتا اور نہ کبھی کسی شخص پر لعنت کرتے ہاں حد سے حد غصہ

میں اس قدر کہہ دیتے کہ تیرے ماتھے کو مٹی لگے اور یہ فقرہ گالی کا فقرہ نہیں بلکہ یہ الفاظ عرب لوگ پیار سے بھی کہا کرتے ہیں اور گو عام طور پر ان کا استعمال مہمل جملوں کے طور پر ہوتا ہے لیکن کبھی یہ الفاظ محبت کے اظہار کے لئے بھی استعمال کئے جاتے اور ان سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس کی یہ شوخی دور ہو کیونکہ ماتھا تکبر کی علامت ہے اور اس کو مٹی لگنے سے یہ مراد ہے کہ اس کا یہ تکبر دور ہو۔

نوٹ : اخبار الفضل میں یہ سلسلہ مضامین یہاں تک ہی شائع ہوا تھا لیکن سیرت کے مضمون پر حضور کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ (مرتب)

[1] بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ اُحد میں ''لنا عزّی '' کی بجائے ''لنا العزّی ''اور ''لنا مولیٰ '' کی بجائے ''اَللّٰہُ مولانا'' کے الفاظ ہیں۔